بلوچستان

ماضی۔ حال۔ مستقبل

بریگیڈیر محمد عثمان حسن
ستارۂ جراءت

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS

بلوچستان
ماضی۔ حال اور مستقبل
(ایک تجزیہ)

بلوچستان

ماضی — حال — مستقبل

ایک تجزیہ

بریگیڈیئر محمد عثمان حسن
ستارہ جرأت

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

ناشر
انڈس پبلیکیشنز
فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ
کراچی۔ پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

پہلا ایڈیشن ——— جنوری ۱۹۷۶ء
تعداد ——— دو ہزار
مطبع ——— پرنٹنگ محل کراچی
قیمت ——— ۳۶ روپے

ꝏ

فہرست

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

*

دیباچہ

۲۶ ر فروری ۱۹۷۴ء کو میں سبی کو ہٹر سے کوہلو پہنچا اور مری علاقے میں سول حکام کی مدد کے لئے اپنی ذمہ داری سنبھالی، تقریباً ایک برس کے بعد فروری ۱۹۷۵ء میں اس علاقے سے واپسی ہوئی۔ ایک برس کا یہ عرصہ تیزی سے گزرا مگر اس دوران محبت اور رومانس کے جو رشتے مری بھائیوں سے قائم ہوئے ان کو بھلانا کم سے کم میرے لئے ناممکن ہے۔

کوہلو میں قیام کے دوران یہ احساس ہوا کہ ہم لوگ اپنے ملک کے کئی علاقوں اور وہاں رہنے والے بھائیوں کے بارے میں لاعلمی کا شکار ہیں۔ کراچی، لاہور یا پشاور والوں کا تو ذکر ہی کیا کوئٹہ میں رہ کر محسوس کیا کہ قریب رہنے والوں کو بھی صحیح حالات کا علم نہیں۔ علم ہوتا بھی تو کیسے! جب لکھنے والے ہی اصل حقائق سے ناآشنا ہوں تو سچی بات کیسے سامنے آسکتی ہے، ایک خبر درست ہو سکتی ہے مگر صحیح تجزیہ پس منظر کی روشنی میں ہی کیا جاسکتا ہے۔ تجزیہ کا بے لاگ ہونا ضروری ہے، جب لکھنے والا اور پڑھنے والا دونوں ہی پس منظر سے ناآشنا ہوں تو کسی فرد واحد یا ادارے کو حالات کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں، اپنی ڈیوٹی کے دوران ملکی اور غیر ملکی اخباروں کا مطالعہ بھی جاری رہا، بڑھ کر تکلیف ہوتی کہ اکثر مضامین ایسے ہوتے کہ جن کا حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، اکثر لکھنے والے یہاں کی تاریخ اور جغرافیہ سے ناواقف یا پھر ایک آدھ چکر جہاز یا جیپ پر بیٹھ کر لگا جاتے اور اپنے آپ کو مری علاقے کے حالات کا ماہر تصور کرتے۔ ارادہ کیا کہ جب بھی موقع ملا تو جو کچھ بھی آنکھ سے دیکھا یا پڑھا اور کانوں سے سنا ہے ضرور تحریر کروں گا۔ اس کتاب میں میں نے اپنی ذاتی رائے محدود ہی رکھی ہے مگر جہاں ایسا کیا گیا ہے اس کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔

میری واپسی سے تقریباً چار ماہ قبل چند عزیز مری دوست ملنے آئے اور کہا کہ "اگر یہاں ایک فلاحی ادارہ قائم ہو جائے تو ہمارے علاقے کی ایک بڑی کمی پوری ہو سکے گی۔ اس کام کے لئے ہم لوگ مفت زمین فراہم کرنے کے لئے تیار ہیں"۔ ایسے نیک کام میں شرکت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے رائے لی وہ بھی اس کے حق میں تھے۔ صرف فلاحی ادارے والی بات دل کو نہیں لگی اس کے ساتھ اگر ایک کتب خانہ بھی ہو جائے جہاں پر بنیادی طور پر وہ کتابیں مہیا کی جا سکتی ہیں جن کا تعلق اس علاقے سے ہے تو اور بھی اچھا ہوگا۔ اس کے علاوہ آپس میں اخوت، محبت اور ربط کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے اگر پاکستان کے دیگر علاقوں کے لوگ خاص طور سے کالج اور یونیورسٹی کے پروفیسر اور طالب علم چھٹیوں میں یا اپنے فاضل وقت میں اپنے بھائیوں کی مدد کرنے کے لئے یہاں آنا چاہیں تو ان کے ٹھہرنے کی جگہ ہو۔ جذبہ تو ہر ایک جوان آدمی میں ہوتا ہے مگر ضرورت سہولت اور رہنمائی کی ہوتی ہے اب دوسرے طبقے کے لوگوں کو لے لیجئے۔ کوئی ڈاکٹر ہے یا زراعت کا ماہر اور کچھ نہیں تو ایسے علاقے میں ریسرچ کرنا چاہتا ہے۔ کچھ تو آسانی اور رہنمائی ہو سکے۔ بات تو ٹھیک ہے مگر پھر وہی سوال یعنی "پیسہ" کہاں سے آئے۔ میرا عقیدہ ہے کہ نیک کام میں کبھی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی بشرطیکہ نیت صاف ہو۔ کچھ کم ہمتی تکمیل میں حائل ہوتی ہے کہ تکلیف کون اٹھائے اور ہاتھ پیر کون ہلائے۔ یہ تکالیف تو ذاتی مفاد کے لئے وقف ہوتی ہیں، اکثر کوہلو میں صاحب حیثیت لوگ تشریف لاتے یا ایسے اشخاص جو اس کام میں مدد کر سکتے تھے۔ وعدے بھی کئے مگر وعدے کی حد تک ہم نے ذاتی کوشش بھی کی اور ہاتھ پیر ہلائے۔ جب کبھی بھی کوئٹہ آنا ہوتا کوشش جاری رہتی۔ بیگم ہم سے تنگ آ گئیں ایک روز کہنے لگیں کہ بس اب یہ کسر رہ گئی ہے کہ وردی اتارو گلے میں جھولی ڈالو اور چندہ اکٹھا کرنا شروع کر دو" ہمیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے مگر وقت کہاں سے نکالیں۔

جب کوہلو سے واپسی ہوئی تو ایک خلش سی دل میں رہی اس خلش کو اور بھی ہمارے دوستوں کے الوداعی جملوں نے تازہ کر دیا کہ "آپ تو کہتے تھے کہ جناب نیک کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ آپ تو اب جا رہے ہیں"۔

ہمارا اب بھی اس پر یقین ہے اور بہت برقرار۔ وعدہ، وعدہ ہوتا ہے۔ دوستوں کو جواب دیا کہ "جناب ہمارا ارادہ پہلے ہی کتاب لکھنے کا تھا اب ذرا جلدی کریں گے، اس کی ساری آمدنی اس نیک ارادے کی نذر ہوگی"۔

"چاہے آپ کی کتاب کتنی اچھی ہو اتنی رقم حاصل کرنا کہ یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچے ناممکن ہے"۔

"اللہ کے نیک بندوں کی اس ملک میں کچھ کمی نہیں شاید کچھ اور لوگ ساتھ شامل ہو جائیں"۔

جان بوجھ کر اس کتاب میں، میں نے لفظ "میں" سے اجتناب کیا ہے اور لفظ "ہم" استعمال کیا ہے ان کاموں میں میں ہی اکیلا نہ تھا۔ بلکہ میرے اور ساتھی بھی برابر کے شریک تھے۔

کوئٹہ

۲ر اپریل ۷۵ء

بریگیڈیر محمّد عثمان حسن
(ستارہ جرأت)

JALALI BOOKS

اپریل سنہ ۱۹۷۴ء

مری علاقے کا ایک منظر
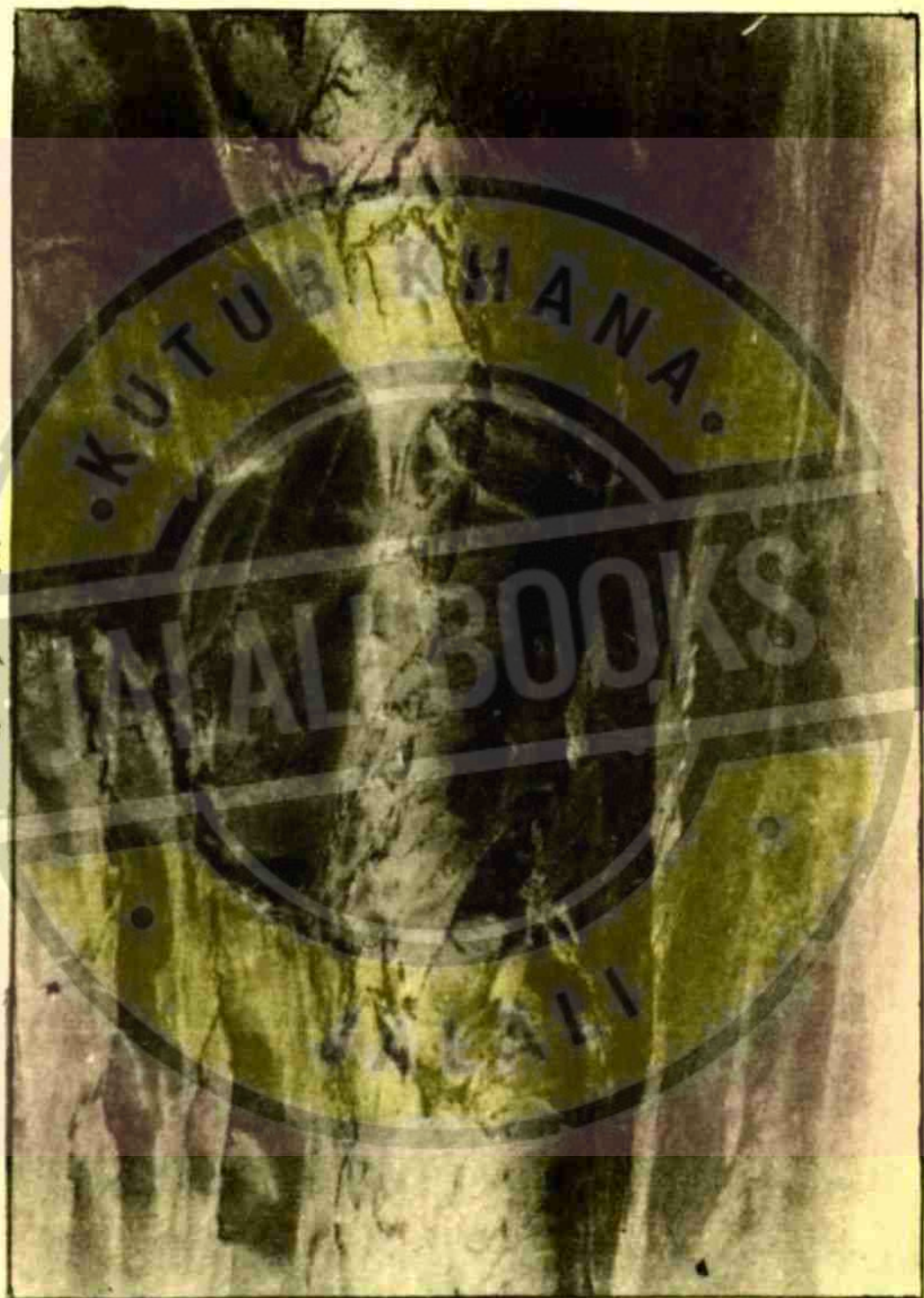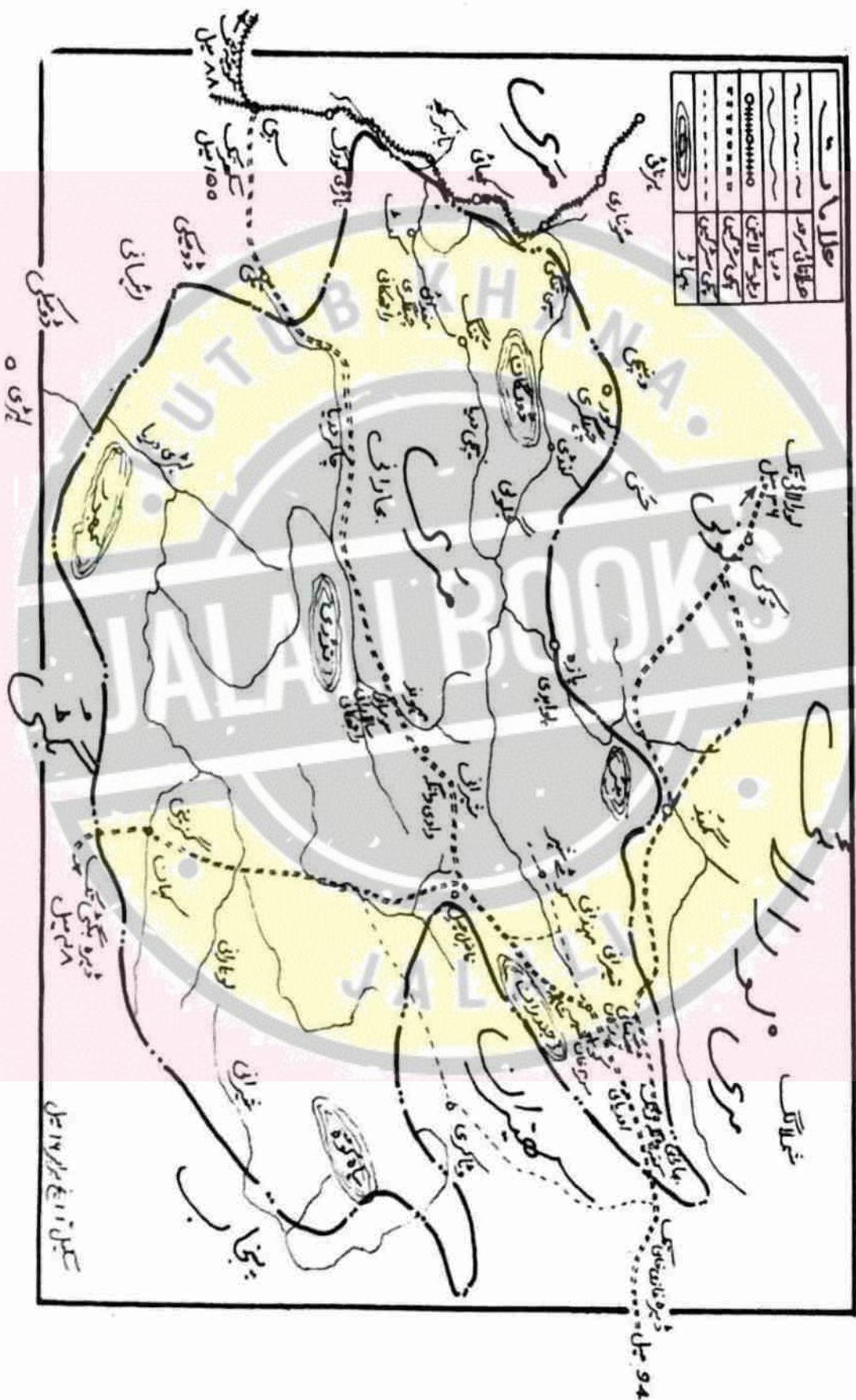
اپریل ۱۹۷۴ء

اپریل ۷۴،۱۹ء کی بات ہے' مری علاقے میں آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ یہاں کی تاریخ، جغرافیہ اور حالات سے کوئی زیادہ واقفیت نہ تھی اور ان غیر یقینی حالات میں ایسی معلومات کا جاننا ضروری تھا۔ اپنی طرف سے کوشش جاری تھی۔

کتابیں اور دیگر مضامین کافی پڑھ ڈالے تھے میں اپنے ذہن میں مری علاقے کا ایک دھندلا سا خاکہ بنانے کوہلو پہنچا۔ اپریل کا مہینہ یہاں خاصہ خوشگوار رہتا ہے۔ نہ زیادہ گرمی اور نہ زیادہ سردی مگر پھر بھی یہ بے رونقی اور اداسی کیسی؟ سڑکوں کے قریب علاقے غیر آباد۔ آبادی کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ کوہلو کا بازار افسردہ اور بجھا سا۔ ان دنوں اکثر جہاز پر علاقہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پہاڑوں پر جہاں سڑکیں نہیں تھیں آبادی نظر آتی تھی۔ بھیڑ بکریاں بھی چرتی دکھائی دیتی تھیں' مگر فضا میں ہر وقت وہی عجیب سی بے رونقی۔

اکثر یہ خبریں ملتیں کہ آج فلاں جگہ فائر ہوا ہے یا اس علاقے میں کوئی واردات رونما ہوئی ہے کسی جگہ پر پتھر رکھ کر رکاوٹ کھڑی کر دی گئی ہے یا کسی بستی سے "فراری[1]" بھیڑیں لے گئے ہیں یا پھر رات کو کہیں لوٹ مار

---

[1] فراری سے مراد وہ مفرور ہیں جو تخریبی کارروائیوں کے لئے پہاڑوں پر چلے گئے تھے۔

کی گئی ہے۔ جناب! نظم و نسق قائم کرنا تو پولیس اور سول انتظامیہ کا کام ہے، آپ کا اِن باتوں سے کیا تعلق؟ پولیس اگر ہو تب۔ رہی سول انتظامیہ، تو وہ ایک تحصیلدار پر مشتمل تھی اور کچھ ہی عرصے پہلے ایک پولیٹیکل ایجنٹ صاحب بھی بہ نفسِ نفیس پہنچ گئے تھے، مگر عملہ ندارد۔

دراصل یہ علاقہ نظم و نسق کے لئے سبّی ڈسٹرکٹ کے تحت تھا اور ویسے بھی یہاں قبائلی نظام رائج تھا جس کا ذکر وضاحت سے آگے کیا گیا ہے۔ یہاں ایک نئی ایجنسی "مری بگٹی ایجنسی" کے نام سے قائم کی گئی تھی۔ اہلکاروں کی تقرریاں ہو رہی تھیں۔ ابھی تک ریکارڈ سبّی میں پڑا تھا نظم و نسق سنبھالتے سنبھالتے بھی تو دیر لگتی ہے۔ قبائلی علاقے کی نوعیت اس طرح سمجھ لیں کہ پاکستان کے اندر ایک اور سلطنت اور اس میں حکومت سرداروں اور وڈیروں کی۔ انگریزوں کے زمانے ہی سے یہ دستور چلا آ رہا تھا۔ حال ہی میں نظام بدلنے کی کوشش کی گئی تو دشواریاں درپیش آئیں۔

ایک روز سڑک کھلنے کا دن تھا، اردو لکھنا ہے تو ٹھیک سے لکھیے۔ "سڑک کھولنا" ایک نئی سی بات لگتی ہے۔ سڑک نہ ہوئی بقول شخصے بوتل ہے کہ کارک کھولنے کی نوبت آ گئی سڑک تو ہر وقت کی آمد و رفت کے لئے بنائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ سڑک واقعی کھولی جاتی تھی۔ ہر وقت آمد و رفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سڑکیں کراچی، کوئٹہ یا پشاور کی مال روڈ تو نہ تھیں کہ جب مرضی آئے موقع محل دیکھے بغیر سیر و تفریح یا کام سے نکل کھڑے ہوئے اچھا پاکستان ہے کہ سڑک بھی کھولی جاتی ہے جناب! اس علاقے کو ماضی میں پاکستان کس نے سمجھا ورنہ یہ نوبت کیوں آتی۔ سڑک کھولنے کی اصطلاح تخریبی کارروائیوں کے آغاز سے رائج ہوئی اور اس سے مراد تھی کہ جب بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہو تو سڑک پر حفاظتی دستے مختلف مقامات پر تعینات کیے جائیں اور کوچ کرنے والوں کے ساتھ ایک حفاظتی دستہ بھی لازمی تھا تاکہ تخریبی کارروائیوں سے نقصان نہ ہونے پائے۔ جب سڑکوں کی لمبائی سینکڑوں میل سے بھی زیادہ ہو تو دستے کہاں کہاں لگائے جائیں اور کیسے بچاؤ کیا جائے؟ میدانی علاقہ ہو تو اور بات ہے پہاڑوں میں ہر جگہ اور ہر موڑ خطرناک ہوتا ہے۔ جہاں مرضی آئے بیٹھ کر فائر کریں اور پھر غائب۔ پیچھا کرنے والے کو تو وقت لگتا ہے۔ بالفرض اگر کوئی پیچھا کرے بھی تو غار ہیں گہرے نالے ہیں، جھاڑیاں ہیں، چھپ جایئے۔ خدا کی ساری زمین خالی پڑی ہے۔ ذکر ہو رہا تھا سڑک کھلنے کا تو

جناب کوہلو، لورالائی کی سڑک کھولی گئی۔ یہ فاصلہ سو میل سے زیادہ کا ہے۔ گاڑیاں صبح ہی جا چکی تھیں سوچا کہ موقع اچھا ہے لگے ہاتھوں جیپ پر بیٹھ کر خود بھی علاقہ دیکھ لیا جائے۔ جب تک گھوم پھر کے علاقہ دیکھ نہ لیا جائے تو بات نہیں بنتی۔ محض نقشے سے علاقے کی نوعیت کا اندازہ لگانا مشکل کام ہے۔ ہمیشہ زمین اور حالات کا صحیح اندازہ علاقہ دیکھ کر ہی ہوتا ہے۔ ویسے اللہ کے فضل سے نقشے بھی بہت پرانے انگریز کے زمانے کے ہیں۔

ابھی کوہلو سے نکل کر کچھ میل طے کیے ہوں گے کہ یکایک فائر کی آواز سنائی دی۔ گاڑیوں کو روکا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ واقعی فائر کی آواز ہے یا کان دھوکا دے رہے ہیں۔ اگر آواز ہے تو کس سمت سے آ رہی ہے اور کتنے فاصلے پر ہے۔ سامنے چند میل پر کبا وانگا کا پہاڑ ہے۔ یہاں پر سڑک بل کھاتی ہوئی پانچ میل اندازاً دو ہزار فٹ بلند ہو جاتی ہے۔ اس پہاڑ کی چڑھائی شروع ہونے سے پہلے چھوٹی پہاڑیاں آتی ہیں جو کافی خطرناک ہیں۔ آگے والے کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ اور وہ پیچھے والے کو علم کہ آگے کیا بیت رہی ہے۔ اونچائی پہ اگر آدمی رائفل لئے بیٹھے ہوں تو بڑی آسانی سے نیچے والوں کو چن چن کر ختم کر سکتے ہیں۔ آپ نیچے سے بچاؤ کرنے کے لئے اوپر چڑھیں تو ہدف (ٹارگٹ) اور بھی عمدہ بنتا ہے۔ دوربین لگائی تھی کہ فائر کی آواز مزید تیز ہو گئی۔ گولیوں کی آواز پہاڑی علاقے میں کافی گونجتی ہے اور آواز کا صحیح رخ کا پتہ چلانا مشکل ہو گیا۔ اس پہاڑی علاقے میں گولیوں کی گونج سے یوں لگتا تھا کہ ہر طرف سے فائر ہو رہا ہے۔

دوربین سے بل کھاتے ہوئے راستے کو دیکھنا شروع کیا تو اپنی گاڑیاں رکی ہوئی پائیں۔ کچھ آڑ لے کر چھپ چکی تھیں۔ کچھ ابھی اوپر پہنچی تھیں باقی اسی طرح چڑھائی پر نیچے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ فائر کی آواز کچھ دیر کے لئے مدھم ہوتی تو پھر ایسا معلوم ہوتا کہ بے شمار لوگ ایک دوسرے پر گولیوں کی بارش کر رہے ہیں پہلے تو صرف رائفل کے فائر کی آواز سنائی دے رہی تھی اب معلوم ہوا ہے کہ مشین گن سے بھی فائر ہو رہا ہے۔ تخریب کاروں کے فائر کی آواز بالکل مختلف ہوتی ہے لیکن اگر سب ساتھ مل کر فائر کریں، تو اس آواز اور مشین گن کے فائر میں تفریق کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں دھواں اٹھتا ہوا نظر آیا اور آن کی آن میں کالے کالے بادل آسمان کی طرف اٹھنے شروع ہو گئے۔

JALALI BOOKS

ہماری جیپ کے پیچھے وائرلیس کی گاڑی اور پھر تیسری گاڑی میں دس آدمیوں کا حفاظتی دستہ تھا۔ ڈرائیور نے آہستہ سے کہا "شاید اپنی کسی گاڑی کو آگ لگ گئی ہے" فائر کی آواز بڑھتی جا رہی تھی۔ خیال آیا کہ موقع پر جلد از جلد پہنچ کر حالات کا جائزہ لیا جائے۔ حادثے کو اپنی نظر سے دیکھنے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ آپ ہزار رپورٹیں پڑھتے رہیں کہ تخریب کار کس طرح کارروائی کرتے ہیں۔ مگر رپورٹوں سے اندازہ نہیں ہوتا۔ ایک پرانے امریکن جنرل کا قول یاد آیا۔ "ایک نظر سے خود دیکھنا ہزار رپورٹوں سے بہتر ہے"۔

جیپ کو اسٹارٹ کیا اور کباوانگا کی راہ لی اور ہم گرد کا بادل اڑاتے، ہچکولے کھاتے آگے کی طرف رَوانہ ہو گئے۔

سب کی نگاہیں پہاڑ کی جانب تھیں اور کان فائر کی طرف۔ گاڑیاں تیزی سے بڑھ رہی تھیں ڈرائیور اندھے موڑ پر بریک لگاتے تو پہیئے گھسٹتے۔ گرد اڑتی اور پھر ایکسیلیٹر دبا کر رفتار ویسے ہی برقرار رہتی۔ جائے واردات نگاہوں کے سامنے آتی اور پھر اوجھل ہو جاتی۔

اب سامنے سڑک کا سیدھا ٹکڑا تھا۔ یہ صرف دو فرلانگ کا ہوگا اور پھر سڑک چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گزرتی ہوئی بائیں کو مڑتی تھی۔ ان پہاڑوں کے دامن میں ایک گاؤں آباد ہے اور اس کے بالکل پیچھے اونچے پہاڑ۔ گاؤں کو "دبک" کہتے ہیں تھوڑے دن ہوئے اس گاؤں کی مسجد میں لورالائی سے آتے ہوئے جمعہ کی نماز پڑھی تھی۔ ان گاؤں والوں سے اکثر آتے جاتے ملاقات بھی ہوتی ہے۔ سڑک کے کنارے ایک کنواں ہے جس کا پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ جب کبھی سفر میں دیر ہو جاتی یہیں رک کر تھوڑی دیر سستا لیا جاتا۔ اس گاؤں سے جائے واردات کچھ ہی آگے ہوگی۔ چڑھائی تو دراصل یہیں سے شروع ہو جاتی ہے اور جیسے جیسے آگے جائیں، پہاڑ اونچے اور چڑھائی مشکل تر۔

ایسے حالات میں طرح طرح کے خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔ پتہ نہیں اپنا کیا نقصان ہوا ہوگا۔ وہاں پہنچ کر کیا کرنا چاہیئے؟ ایسی کارروائی کی جائے کہ تخریب کار بچ کر نہ جائیں۔ موقع پر پہنچ کر دائیں سے گھیرا ڈالا جائے۔ کوھلو بھی اطلاع دی جائے کہ جو بھی دستے موجود ہیں وہ فوراً یہاں آ جائیں۔ کباوانگا کے پہاڑ کی دوسری جانب "لوھار کی ٹک" کا فوجی کیمپ ہے۔ انہیں بھی ہدایت کی جائے کہ گھیرے کو تنگ کریں۔ یہی

خیالات دماغ میں آرہے تھے کہ ایکا ایکی سامنے سے دو گولیوں کا فائر سنائی دیا۔ تخریب کاروں کا یہ اشارہ تھا کہ اب سب مل کر فائر کریں۔ گھات میں بیٹھ کر اس طرح پہلے صرف دو گولیاں چلانے کا تعلق انسانی نفسیات سے ہے۔ وہ یہ کہ جب گاڑیاں آگے بڑھ رہی ہوں تو اکا دکا فائر کی آواز سنکر ڈرائیور گھبراہٹ میں گاڑیوں کی رفتار تیز کر دیتے ہیں اور پھر ایکدم سے ایک اندھے موڑ کے پاس جا کر پھنستے ہیں جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا اور پھر فائر چاروں طرف سے تند اور تیز۔

گولیوں کی آواز سنتے ہی جیپ کو بائیں موڑا اور وہ چھوٹے سے نالے کے کنارے جا کر رک گئی ہم لوگ چھلانگ لگا کر نالے کے کنارے ہو گئے۔ پہلی گولیوں کی بوچھاڑ اس جگہ آئی جدھر سے جیپ مڑی تھی اور پھر جیپ کے اوپر اترتے اترتے بھی کچھ گولیاں پار ہو چکی تھیں۔ اب تو عالم یہ تھا جیسے ٹین کی چھت پر اولے گر رہے ہوں۔ جیپ چونکہ تیز تھی اس لئے باقی گاڑیاں کافی پیچھے رہ گئیں جب انہیں یہ عالم نظر آیا تو وائرلیس کی گاڑی پیچھے رک گئی مگر حفاظتی دستے کب پیچھے ہٹنے والے تھے۔ عقلمندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ گاڑی کو فوراً چھوڑ کر کارروائی پیدل کی جاتی۔ مگر جوش میں ہوش کم ہی رہتا ہے۔ گاڑی کو دبایا اور گولیوں کی بوچھاڑ میں عین جیپ کے پاس لا کھڑا کیا۔ تیزی سے کود کر سب باہر آگئے۔ آڑ لے کر فائر کا جواب دینا شروع کر دیا۔ اس اثنا میں ایک جوان کے پاؤں میں گولی لگی۔ لیکن وہ زخمی حالت میں بھی آڑ میں پہنچ چکا تھا۔

فائر دونوں جانب سے شروع تھا آگے والی گاڑیوں پر اب فائر ختم ہو چکا تھا اور تختہ مشق ہم لوگ تھے۔ آڑ میں ہو کر دوربین لگائی بہت کوشش کی کہ دیکھیں آخر فائر کرنے والے کدھر ہیں اور کہاں سے گولیاں آرہی ہیں۔ مگر کچھ معلوم نہیں ہوا۔ ہاں اتنا ضرور اخذ کر سکے کہ فائر گاؤں کے پیچھے پہاڑیوں کی جانب سے ہو رہا تھا۔ فائر کرنے والوں کی تعداد چالیس پچاس کے لگ بھگ ہو گی۔

حفاظتی دستے کا کمانڈر ایک حوالدار تھا۔ مگر کیا کہنے اس کی ہوشمندی کے مشین گن کو ہدایت کی کہ وہ وہیں سے فائر جاری رکھے اور خود باقی آدمیوں کو ساتھ لے کر دائیں سے گھیرا ڈالنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس حرکت کو دیکھ کر شاید فراری کچھ گھبرا گئے [illegible] ہونا شروع ہو گیا۔ ہم وائرلیس کی گاڑی کی طرف

لیے تاکہ باقی لوگوں کو بھی ہدایات دی جائیں۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے "بھی یار لوگوں" نے نشانہ بازی کی مشق جاری رکھی مگر نشانہ کوئی خاص نہیں تھا، جیسے اب تک سننے میں آیا تھا۔

کوھلو خبر پہنچ چکی تھی۔ جو بھی بچے کھچے دستے تھے گاڑیوں میں آگے آرہے تھے۔ دستے کے جوان لمبا چکر کاٹ کر پہاڑ کے دامن میں جیسے ہی پہنچے ان پر پھر فائر ہوا! یہ ظاہر تھا کہ تخریب کار نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پہاڑیوں کا سلسلہ اتنا گنجان ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ایک پہاڑی عبور کی تو دوسری آگئی۔ دوسری کو پار کیا تو تیسری آگئی اور پھر اونچائی ایک سے ایک بلند۔ اونچائی پر بیٹھا ہوا آدمی نیچے سے آنے والے پر ہر وقت نگاہ رکھ سکتا ہے اور جدھر سے بھی وہ چڑھنے کی کوشش کرے ادھر بھاگ کر دوبارہ راستے میں حائل۔ حفاظتی دستے پر جہاں فائر آتا وہ اور دائیں جاکر اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے اور پھر وہی عالم۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد کوھلو سے تیس جوان اور پہنچ گئے تھے۔ سب کو ہدایت یہ ہی تھی پیچھا نہ چھوڑا جائے۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے بھی پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ آگے گاڑیوں پر فائر ختم ہو چکا تھا ظاہر تھا کہ تخریب کار نکل چکے تھے۔ ہم لوگ آگے چلے اور جائے واردات پر پہنچے۔ ایک جوان شہید ہو چکا تھا اور دو زخمی تھے۔ انہیں اسپتال کی گاڑی پر کوھلو روانہ کیا۔ ایک گاڑی جل چکی تھی اور باقی دو گاڑیوں کو نقصان پہنچا تھا۔ ان گاڑیوں کے ساتھ جو حفاظتی دستہ تھا وہ بھی تخریب کاروں کا پیچھا کرتے ہوئے کافی آگے نکل چکا تھا "لوہار کی ٹک" کیمپ میں جو کچھ نوجوان سڑک کی حفاظت سے بچے تھے انہیں بھی پیچھا کرنے کی ہدایت کی گئی۔

یہ کارروائی کرتے کرتے سہ پہر ہو چکی تھی۔ وائرلیس پر خبر ملی کہ ایک ایسا ہی حادثہ "منڈے ٹک" پر ہوا ہے۔ یہ جگہ دکی سے سات میل شمال میں واقع ہے۔ وہاں پر اپنے سات جوان شہید اور تین زخمی ہوئے ہیں شام کو دستے واپس آئے تو ان کے ہمراہ تقریباً چالیس نہتے آدمی تھے۔ یہ سارے گھیرے میں پھنسے تھے ہتھیار چھپانے میں یہاں ہر ایک ماہر ہوتا ہے تھوڑا بھی وقت ملے تو اسلحہ کا پتہ چلانا ناممکن ہوتا ہے۔ ہر ایک قسمیں کھا رہا تھا کہ وہ بے گناہ ہے شک والی بات ضرور تھی۔ ایسے میں "جوش کی بجائے" ہوش" کا قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ان حالات میں نادانستہ بھی اگر بے گناہ کو تنگ کیا جائے تو اس کی ہمدردی بھی دیگر

جانب ہو جاتی ہے اور اگر گناہگار بچ جائے تو اس کا حوصلہ اور بلند ہو جاتا ہے۔ سوچا کہ شک کا فائدہ بے گناہ ہی کو ملنا چاہیے۔ یہی عقلمندی ہے اور سب سے بڑی بات ایسی ذات کو جواب دینا ہے جس کے اختیار میں سب کچھ ہے۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ بجا۔ عقل اور ہوش اسی وقت تک ساتھ دیتے ہیں اگر جذبات پر قابو برقرار رہے جذبات کو حدود میں رکھنا آسان کام نہیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو دنیا میں اَمن ہی اَمن ہوتا۔

"جوش" اور "ہوش" کی بات اپنی جگہ درست مگر آنکھوں اور کانوں کا کیا کیجئے! حادثہ تو آپ کے سامنے ہے۔ انسان اپنے جذبات کو کب تک قابو میں رکھ سکتا ہے۔ بات دراصل "ایمان" پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ جذبات بھی قابو میں آجاتے ہیں اگر "راہِ عمل" پر یقین ہو یعنی کہ بے گناہ کو نہ ستایا جائے آخر یہ بھی پاکستانی ہیں۔

آخر انسان ہی تو ہے خیال آتا ہے کہ یہ بغاوت نہیں تو اور کیا ہے۔ اس طرح گولیاں برسانے کا مطلب؟ بغاوت تو کچلی جاتی ہے سمجھانے بجھانے سے کیا حاصل۔ بغاوت کرنے کا بھی کوئی مقصد ہوتا ہے ایسے ہی کوئی رائفل لئے سینہ تان کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی اپنا بھائی اس طرح کھڑا ہو بھی گیا تو کیا اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا چاہیئے جو کہ باہر والے حملہ آور کے ساتھ کرتے ہیں فرق تو دونوں میں ہے۔ ایک پاکستانی اور دوسرے سے آپ کا کوئی رشتہ نہیں۔ باہر والا اگر ایسی حرکت کرے تو وہ آپ کی آزادی پر ہاتھ ڈال رہا ہے مگر اپنے لوگ تو ایسا نہیں کر سکتے۔ کوئی تو وجہ ہو گی۔ مان لیا باہر والوں کا ہاتھ ان کو اکسانے میں ہو گا۔ مگر کچھ کوتاہیاں بھی ضرور شامل حال ہوں گی۔

اِن معاملات میں سب سے اہم یہ تھا کہ حالات کا بے لاگ جائزہ لیا جائے، آخر یہ نوبت کیوں پہنچی حالات کو کسی ایک زاویئے سے دیکھنا غلط ہو گا۔ اس کا تجزیہ تو کلی طور پر ہی کیا جا سکتا ہے یہاں کے جغرافیہ اور تاریخ کو پڑھیئے۔ معاشی حالات اور سماجی حالات کو سمجھیے۔ انتظامیہ کو جدید تقاضوں کی نظر سے جانچیئے۔ تعلیمی معیار اور نفسیات کو بھی نظر انداز نہ کیجئے۔ ان سب عناصر کا جائزہ لیتے ہوئے حالات کا حل تلاش کیجئے اور نظر ہمیشہ دور مستقبل پر ہو۔ جہاں اتنے عناصر کا خیال رکھنا ضروری ہو تو حالات ایکدم

اور لکیر تو بدل نہیں سکتے۔ بدلتا دور اپنا وقت لے گا۔ اس میں رکاوٹیں بھی ہوں گی اور مشکلات بھی۔ حالات جب سازگار نہ ہوں تو باہر والے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ہمارے ہی ساتھ نہیں بلکہ جہاں بھی ایسے حالات ہوں یہی ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دنیا بھی تو بہت چھوٹی ہو گئی ہے۔

طاقت کا استعمال کسی حد تک ان حالات میں جائز بھی ہوتا ہے۔ امن داماں برقرار رکھنے کے لئے۔ تاکہ ان عوامل پر کاربند ہوا جائے جن کی فوری ضرورت ہے اور ان وجوہات کا تدارک کیا جا سکے جن کی بنا پر حالات اس نوبت کو پہنچے۔ مگر طاقت کے استعمال کی جب بات آئے تو پھر صرف یہ خیال ہو کہ یہ علاقہ بھی پاکستان کا حصہ ہے اور یہاں بھی اپنے بھائی بستے ہیں۔ برداشت اور تحمل کو کبھی نظرانداز نہ کیا جائے۔
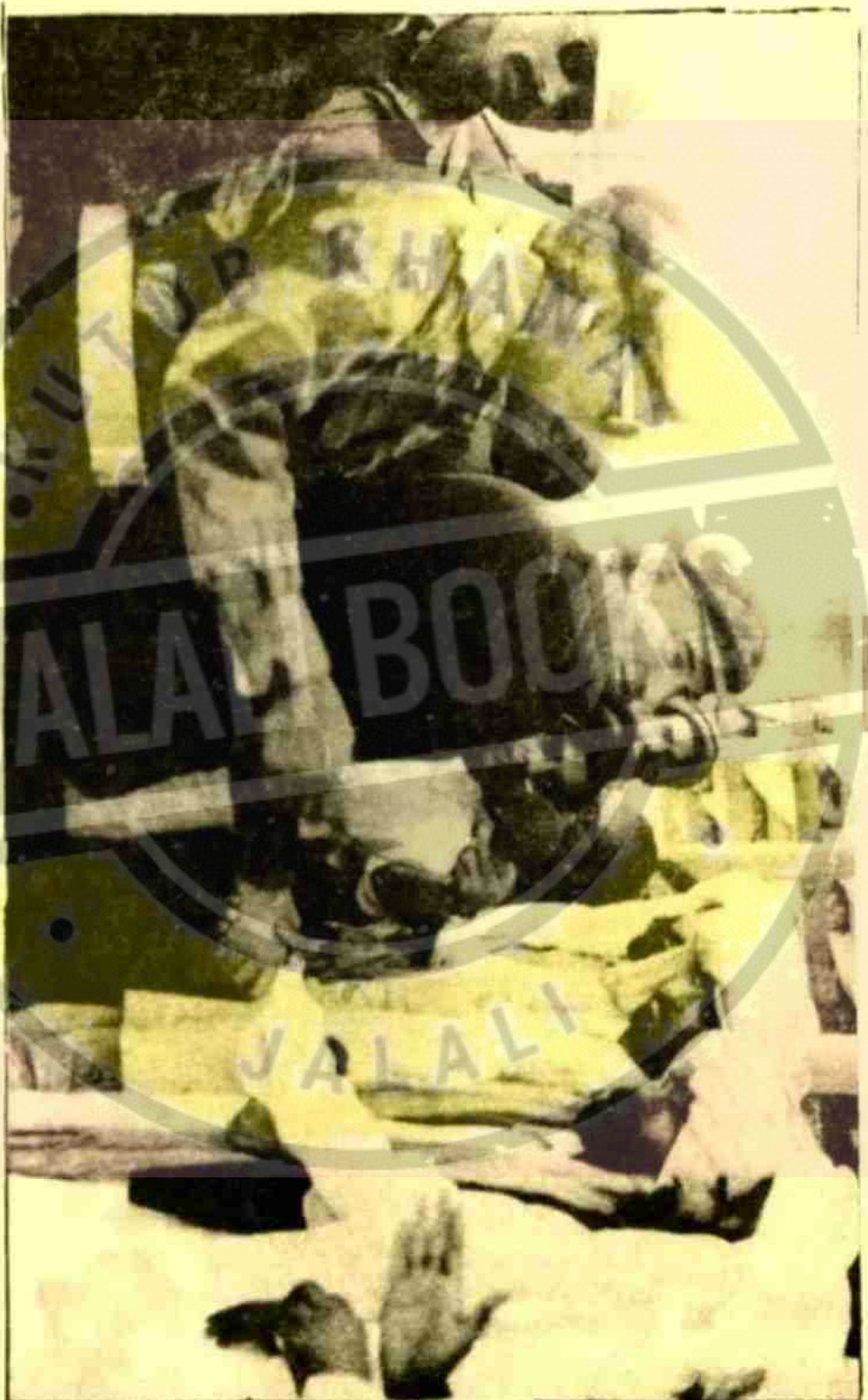
جغرافیائی حالات

کوھلو میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی آمد۔ قبائلیوں سے تعارف کرایا جا رہا ہے

KUTUB KHANA. JALALI BOOKS

جغرافیائی حالات

مری علاقہ کی پرانی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک گزیٹیر نظر سے گزرا۔ اس میں مری اور بگٹی علاقہ کا حدود اربعہ کچھ اس طرح بیان کیا گیا تھا۔ مری بگٹی ۲۶ ۔ ۲۸° تا ۴۰ ۔ ۳۰° شمال اور ۵۵ ۔ ۶۷° تا ۴۸ ۔ ۶۹° مشرق میں واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۷،۱۲۹ مربع میل ہے اس کا شمالی حصہ جو ۳۲۶۸ میل بنتا ہے، مریوں کے قبضے میں ہے باقی ماندہ ۳۸۶۱ مربع میل پر بگٹی آباد ہیں۔ یہ تمام علاقہ ابھی تک سبی ضلع میں شامل تھا مگر دیکھتے دیکھتے علیحدہ مری بگٹی ایجنسی قائم ہو گئی ہے۔ جس کا صدر مقام کوہلو ہے۔ یہ مری علاقے میں واقع ہے۔

مری علاقے کے شمال مشرق میں دکی اور بارکھان کی تحصیلیں آتی ہیں جو کہ لورالائی کا حصہ ہیں۔ جنوب میں نصیر آباد کی تحصیل ہے۔ مشرق میں اس کی حد ڈیرہ غازی خان سے جا ملتی ہے اور مغرب میں کچھی اور سبی کے اضلاع ہیں۔ سرکاری بیان کے مطابق تو یہ اندراج صحیح ہے مگر یہ کہنا کہ "مری" صرف انہی علاقوں میں آباد ہیں۔ درست نہیں ہمارے مشاہدے کے مطابق تقریباً ۲۰،۰۰۰ مری اس علاقے سے باہر بھی رہتے ہیں ان کی زیادہ تر آبادی دکی، سنجاوی، بارکھان اور سبی تحصیلوں میں بھی آباد ہے۔ مری علاقوں میں کچھ زرتون

پٹھان بھی ہیں لیکن یہ زیادہ تر کوہلو کے گردونواح میں ہیں۔ دراصل وادی کوہلو پہلے زرقون کی ملکیت تھی۔ مگر ۱۸۷۷ء میں بگٹیوں نے مریوں کی اجازت سے اس علاقے پر حملہ کیا۔ زرقون اپنی زمینیں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ مگر ۱۸۷۸ء میں مریوں نے زرقونوں سے صلح اس شرط پر کی کہ وادی کا تین چوتھائی حصہ انہیں دے دیا جائے اور اس کے بدلے میں وہ انہیں بگٹیوں سے محفوظ رکھیں گے۔

بلوچستان میں علاقے کی بانٹ قبیلوں سے بھی ہوتی ہے یعنی کس علاقے میں کون سا قبیلہ آباد ہے اب مری علاقے کے چاروں اطراف کا جائزہ لیتے ہیں۔ شمال میں دکی کی تحصیل آتی ہے اس تحصیل میں ترین، لونی، ناصر اور زرقون آباد ہیں۔ ہر ایک کی اپنی اپنی حدود ہیں۔ مگر ان حدود کے اندر بھی کافی علاقے میں مریوں کا قبضہ ہے۔ پھر شمال میں بارکھان تحصیل ہے، یہاں پر کیتھران آباد ہیں۔ کیتھران ایسے لوگ ہیں جن کی اپنی علیحدہ زبان ہے جو سندھی اور جاتکی سے کافی ملتی جلتی ہے۔ مگر بلوچی، پشتو اور پنجابی بھی فر فر بولتے ہیں۔ جنوب میں بگٹی ہیں جن سے ان کی دوستی ذرا کم ہی ہے۔ مغرب میں سبی کا ضلع ہے۔ یہاں پر بلوچوں کے کچھ قبائل جیسے ڈومکی، رئیسانی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ پٹھان بھی آباد ہیں لیکن ایک بات جو بڑی واضح ہے وہ یہ کہ مری قبائل کا پلہ سب پر حاوی ہے۔ ماسوائے دنیچیوں کے، جو ہمیشہ سے ان کے ساتھ برابر کی ٹکر لیتے رہے ہیں۔ پڑوسیوں کے ساتھ مری قبائل کے تعلقات اکثر کشیدہ ہی رہتے ہیں۔ مریوں کو بہر حال اپنے جانوروں کے لئے چراگاہیں چاہئیں۔ یہ ان کا سب سے بڑا کام ہے۔ یہ کام ایک جگہ بیٹھ کر تو نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کاروبار تو گھوم پھر کر ہی ہوتا ہے۔

ذکر تو ہو رہا تھا حدود اربعہ کا۔ پہلے انسان پر ہی نظر ڈالتے ہیں اب اس علاقے کو جغرافیائی نظر سے دیکھتے ہیں ویسے تاریخ اور جغرافیہ تو ہمیشہ سے اپنی کمزوری رہی ہے مگر کوشش کئے لیتے ہیں۔ یہ علاقہ سلیمان رینج کا انتہائی جنوبی حصہ ہے یہاں پر اس سلسلے کی پہاڑیاں ایک دوسرے کے قریب قریب متوازی پھیلی ہوئی ہیں۔ ان متوازی پہاڑیوں کا سلسلہ سلیمان پلیٹو سے شروع ہوتا ہے اور ان کی اونچائی جنوب میں آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہے اور پھر یہ میدانی علاقے میں شامل ہو جاتی ہے۔ مری علاقے میں میدانی علاقہ بہت کم ہے۔ یہاں پر کہاوت مشہور ہے" سارے پہاڑ مریوں کے میدان دوسروں

کا"۔ یہ کہاوت پوری طرح تو درست نہیں مگر کچھ تو اس میں سچائی ضرور ہے پہاڑیوں کے درمیان اَن گنت چھوٹی چھوٹی وادیاں اور گہرے برساتی نالے ہیں۔ مغرب میں سبی کے میدان سے تھوڑی ہی دور مری علاقے کی پہاڑیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ ان کی اونچائی ۲۰۷۱ فٹ سے ۴۴۴۲ فٹ ہے۔ شمال مشرق میں ان کی اونچائی بڑھتی جاتی ہے۔ ڈنگن کی اونچائی ۵۲۷۰ فٹ ہے اور سب سے اونچا پہاڑ سہالو ہے جس کی بلندی ۸۱۱۳ فٹ ہے۔

اس علاقے کا ڈھلوان زیادہ تر مشرق سے مغرب کی طرف ہے۔ سب سے بڑا برساتی نالہ جسے یہاں دریا کہا جاتا ہے ناڑی ہے۔ اس میں گرمیوں میں بھی پانی بہتا ہے بس یہ سمجھئے کہ پانی کی ایک دھار ہے جو کہیں بہتے بہتے گم ہوجاتی ہے لیکن تھوڑے فاصلے کے بعد نمایاں ہوتی ہے اور پھر گم۔ مگر سبی کے نزدیک دریا میں متواتر پانی بہتا رہتا ہے اس سے آبپاشی کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ برسات میں تو خیر یہ پورا دریا ہوجاتا ہے۔ مری علاقے میں اسے "بیجی" کہتے ہیں۔ یہاں پر اس میں دو اور نالے شامل ہوجاتے ہیں جنہیں "کریک" اور "دارا" کہتے ہیں۔ دوسرا نالہ یا دریا "تلی" ہے۔ یہ بھی مری علاقے سے نکلتا ہے اور سبی کے میدان میں پہنچ جاتا ہے اس میں اور نالے بھی شامل ہوجاتے ہیں جیسے "چاکر" اور "شلوار" وغیرہ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ میوند اور سبی کو ملانے والی سڑک "چاکر" کے ساتھ بنائی جارہی ہے۔

مری علاقے کی آب و ہوا گرم اور خشک ہے۔ ویسے گرمی اور سردی میں بہت ہی فرق ہوتا ہے۔ سردیوں میں اکثر تمام علاقے میں درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے کم ہوجاتا ہے اور گرمیوں میں سبی اور اس کے ارد گرد کا علاقہ جہنم زار بن جاتا ہے۔ یعنی صرف ۱۲۵ ڈگری درجۂ حرارت۔ اونچی پہاڑیوں کی بات جدا ہے۔ سالانہ بارش کا اوسط کہا جاتا ہے۔ پانچ انچ ہے۔ بادل برسات اور سردیوں دونوں ہی میں آتے ہیں مگر اس اوسط میں بعض برسوں میں کافی فرق پڑجاتا ہے۔ یعنی کسی سال بارش دس پندرہ انچ ہوجاتی ہے۔ بعض دفعہ خشک سالی بھی۔ گرمیوں میں تیز بارش اچانک ہوتی ہے اور ندی نالے دیکھتے دیکھتے تیس سے چالیس فٹ بلند ہوجاتے ہیں اور پھر اسی رفتار سے پانی اتر بھی جاتا ہے۔ اگست اور ستمبر میں آندھیاں چلتی ہیں اور مئی جون میں گرد و غبار کی شدت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ سو گز بھی دیکھنا مشکل۔

ان حالات میں نباتات یہاں تھوڑی بہت نظر آتی ہے۔ ماسوائے اس جگہ کے جہاں پانی ہو، جیسے کچھ وادیاں، تمام علاقہ جھلسا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نالوں کے ساتھ ساتھ۔ وادیوں میں یا کچھ پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر چھوٹی چھوٹی کانٹے دار جھاڑیاں ہوتی ہیں جنہیں اگر کاٹا نہ جائے تو درخت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ کچھ انہی جھاڑیوں یا درختوں کے جنگل بھی ہیں۔ یہ اس وجہ سے بچ گئے کہ وڈیروں کی نجی ملکیت تھے۔ سردیوں کے آخر اور گرمیوں کے وسط تک اگر بارش ہو گئی تو سبزہ جاگ اٹھتا ہے ہری ہری گھاس اور مختلف قسم کے لہلہاتے پھول وادیوں میں اور پہاڑوں پر کھل اٹھتے ہیں۔ ان میں چرتی ہوئی سفید بھیڑیں ایک عجیب منظر پیش کرتی ہیں۔

بقول اقبال ؎ پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

جب جغرافیہ، نباتات، بارش اور جانوروں کا ذکر ہو ہی رہا ہے تو لگے ہاتھوں اس کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ بارش کا تعلق ہمیشہ نباتات سے ہوتا ہے۔ جتنے درخت ہوں گے اتنی ہی زیادہ بارش اس علاقے میں ہوگی۔ اگر درخت کاٹ دیے جائیں تو بارش کم ہو جائے گی۔ یہاں پر صدیوں سے لوگوں کا ہمیشہ جانور پالنا رہا ہے۔ چرائی ہوتے ہوتے نباتات کم ہوتی جا رہی ہے۔ پرانی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں پر کافی گھنے جنگل ہوتے تھے مگر اب یہ ختم ہو چکے ہیں اور بارش بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وسطی افریقہ میں ریگستانی صحرا بڑھتا ہی جا رہا ہے اور پچھلے سال تو ایسی قحط سالی ہوئی کہ خدا بچائے۔ اس کی وجہ بھی ماہرین نے یہ بیان کی کہ وہاں پر بھی چراگاہیں ہیں اور وہاں کے قبائل نے اتنی زیادہ مال کی چرائی کی کہ ریگستان چند برسوں میں بڑھ کر ان علاقوں میں پہنچ گیا۔ دس سال قبل وہاں پر جانور رکھنے کے سلسلے میں قبائل پر پابندی تھی یعنی کہ ہر قبیلہ ایک خاص تعداد سے زیادہ جانور نہیں رکھ سکتا تھا مگر پچھلے دس برسوں میں یہ پابندی ختم کر دی گئی۔ سو اس کا نتیجہ جو ظاہر ہونا تھا وہ ہوا بہر حال جانور بھی رکھنا ضروری ہیں مگر حد کے اندر۔

یہاں بارش کم ہونے کی وجہ سے پانی کی بڑی قلت ہے۔ میلوں چلے جائیے پانی ناپید۔ اگر بارش زیادہ نہ ہو تو جو پانی ملتا ہے وہ بھی نمکین۔ کہیں کہیں چشمے ہیں۔ آبادی کا سارا دار و مدار پانی

اور بارش پر ہے۔ اگر بارش اچھی ہوگئی تو چراگاہیں آباد۔ ورنہ لوگوں نے بوریا بستر اٹھایا اور گھاس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ مگر اب حالات کچھ مختلف ہوتے جارہے۔ زیرِ زمین پانی کا سروے مکمل ہوگیا ہے اور ٹیوب ویل بھی لگ رہے ہیں۔ پانی کے تلاش کے کام کی اگر یہی رفتار رہی تو انشاءاللہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہاں کے حالات بدل جائیں گے مگر زیرِ زمین پانی کو نکالنے کے لئے بھی تو بارش کی ضرورت ہے لہٰذا نباتات کی حفاظت پر ابھی سے غور اور عمل ضروری ہے۔
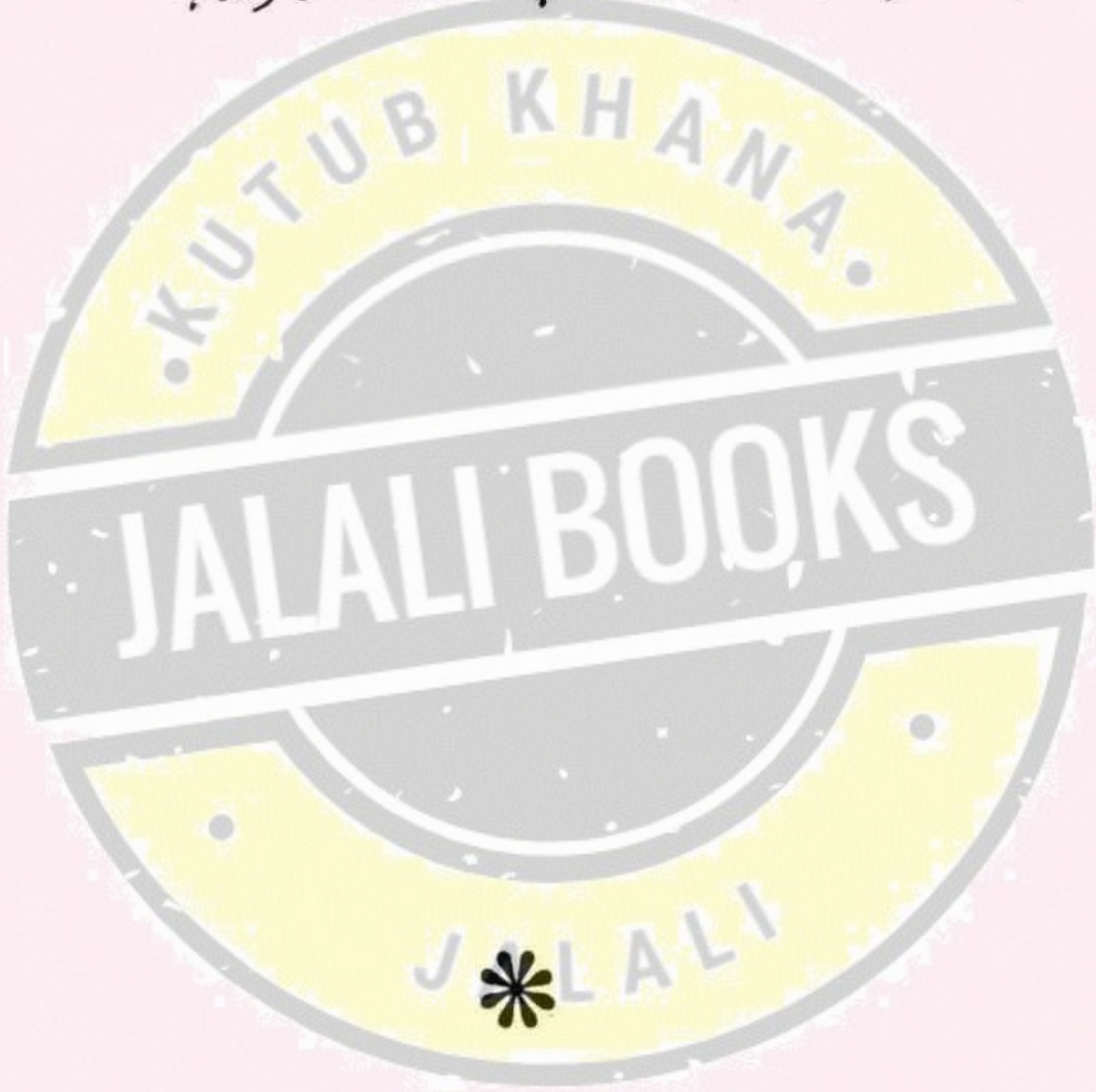
KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

علی گل کٹھینگیانی ۔ مصنّف کے ساتھ

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

تاریخی پس منظر
KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI
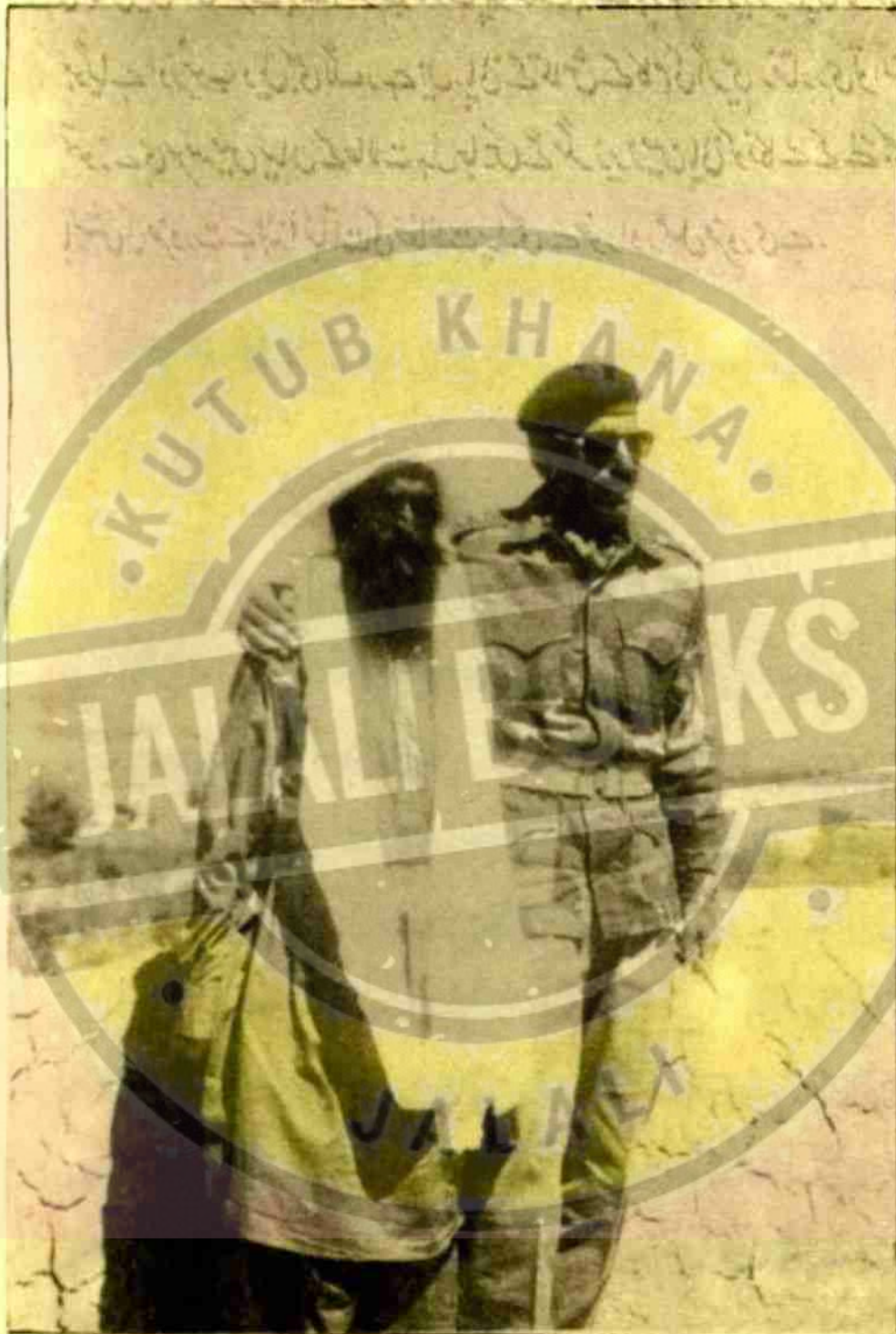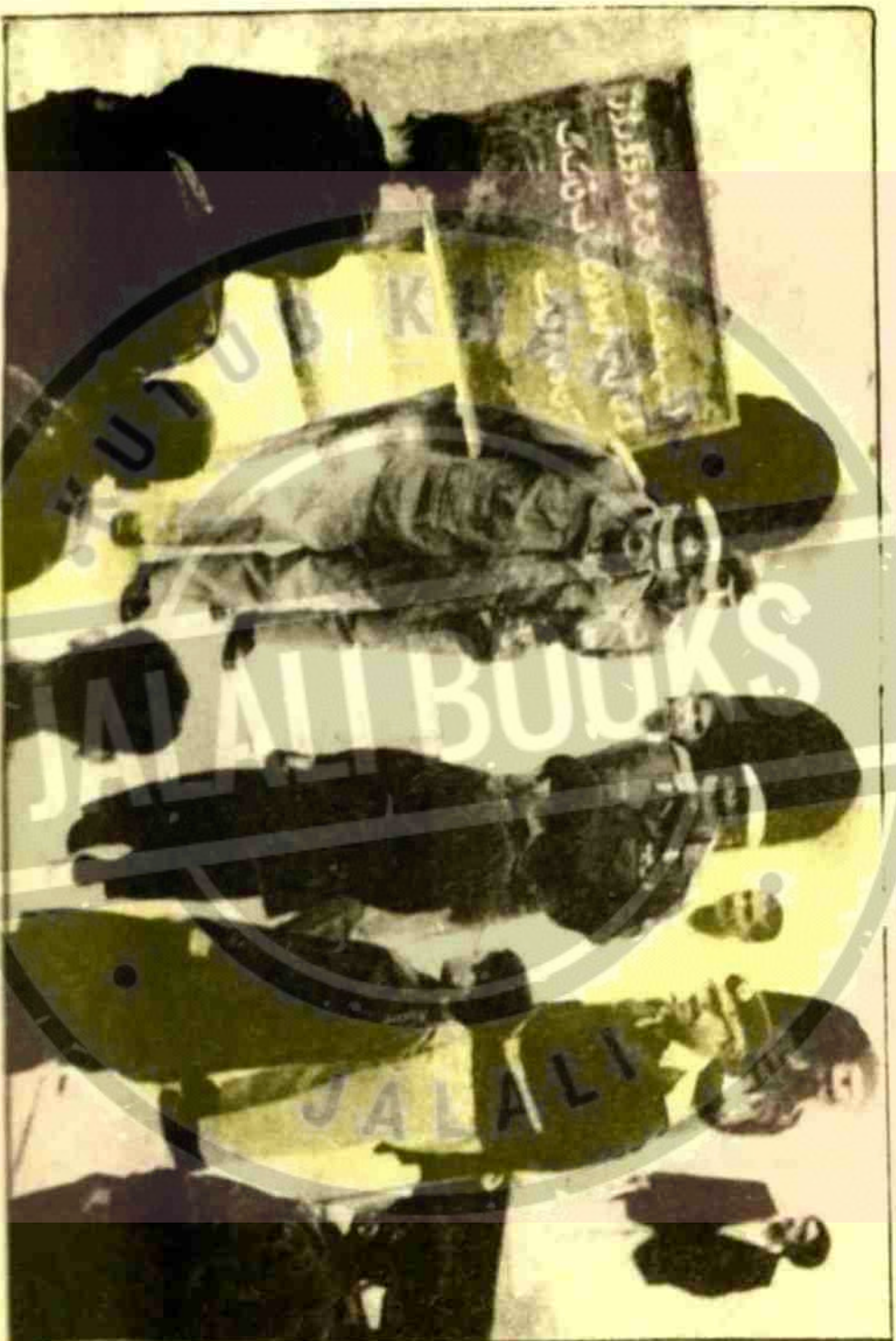
جنرل ٹکا خاں کمیونٹی سینٹر کے ایک اسکول میں

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS

تاریخی پس منظر

جغرافیہ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد یہاں کی تاریخ کا ذکر بھی ضروری ہے۔ مری علاقے کی تاریخ ابھی تک پردۂ خفا میں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درۂ بولان قریب ہونے کی وجہ سے مختلف قومیں اس علاقے میں آتی جاتی رہیں، ان میں سے بعض قومیں ایسی تھیں جو یہیں کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہاں کی تاریخ پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ زمانے کو قرار کہاں۔ افسوس ہے کہ اس علاقے کی کوئی معتبر تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوئی، بہر حال ہمیں جو یہاں کی تاریخوں میں ملتا ہے، ہم اُسے اور یہاں کے لوگوں نے جو کچھ بیان کیا ہے، ہم ان تمام تاریخی حالات کو یکجا کر کے بیان کرتے ہیں۔ یہاں کی تاریخ کی تحقیق کے سلسلے میں ہم نے بڑی بادیہ پیمائی کی ہے۔ مری علاقے کا تفصیلی دورہ کیا اور آس پاس کے لوگوں سے بھی استفسار کیا۔ بہت سے معززین کے پاس قلمی نسخے بھی دیکھے۔ انہوں نے پہلے تو دکھانے میں تامل کیا اور کہا " اگر آپ پڑھنا ہی چاہتے ہیں تو یہیں بیٹھ کر پڑھیں " اُن کی یہ بات بھی درست تھی۔ یہ نادر کتابیں کہاں مل سکتی ہیں۔ اکثر صاحبان نے ٹال مٹول سے کام لیا، جب میں نے بہت اصرار کیا اور کہا جناب، علم کے معاملے میں بخل کسی طرح مناسب نہیں، مگر ہر ایک کا اپنا اپنا نظریہ ہے، دراصل یہاں

لوگ اپنی خاندانی تاریخ اور ورثے کے بارے میں بہت ہی حساس واقع ہوئے ہیں اور خدا جانے اسے کیوں پردۂ خفا میں رکھنا چاہتے ہیں مگر علم کے معاملے میں ان کی کنجوسی تو کسی طرح مناسب نہیں۔ ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر ان نادر کتابوں کو کسی طرح اکٹھا کر کے قومی لائبریری یا میوزیم میں محفوظ کر دیا جائے تو یہ ادب اور تاریخ کی بڑی خدمت ہو سکتی ہے۔

درۂ بولان

چونکہ درۂ بولان سے یہ تذکرہ شروع ہوا ہے تو پہلے ہم اس تاریخی پس منظر کو وہیں سے شروع کرتے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے اِس علاقے میں جو ہمیشہ سے مشہور شہر رہا ہے سبی ہے۔ اس کی اہمیت آج بھی قائم ہے، یہ پہلے حکومتوں کا دارالخلافہ ہوتا تھا مگر آج کل ایک ضلعی ہیڈ کوارٹر ہے۔ بقول شخصے یہ شہر درۂ بولان کے منہ پر واقع ہے، اگر آپ ہوائی جہاز سے یہاں پرواز کر رہے ہوں تو یہ منہ کا محاورہ اور بھی جچتا ہے۔ شمال میں تمام پہاڑ کول پورے گرد و نواح میں بہت اونچے اور یہ پہاڑوں کا سلسلہ متوازی جنوب کی طرف پھیلتا چلا جاتا ہے اور ان کی اونچائی بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ جہاں یہ پہاڑ ختم ہو کر میدان شروع ہوتا ہے، وہیں پر سبی کا ہوائی اڈہ ہے۔ پھر اس کے بعد قلعہ۔ اب قلعہ کیا رہ گیا ہے کھنڈرات ہیں کسی زمانے میں یہ قلعہ اپنی مثال آپ تھا۔ اور تھوڑا آگے سبی کا شہر ہے۔

سیوستان

پرانے زمانے میں درۂ بولان اور ڈیرہ جات کے بیچ کے علاقے کو سیوستان سے منسوب کیا جاتا رہا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیوستان کا صرف نام ہی باقی رہ گیا ہے یہاں تک کہ اب یہ اندازہ لگانا بھی مشکل ہے کہ کون سے علاقے سیوستان میں شامل تھے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دریائے سندھ اپنا راستہ بدلتا رہا ہے اور جو پہلے حدود رہی ہوں گی وہ اب بدل چکی ہیں اور پھر ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ جگہوں کے نام تیزی سے بدلتے رہے اور نئی نئی حکومتیں اور نئی نئی حدود قائم ہوتی رہیں۔

سیوی کی وجہ تسمیہ

اس علاقے کی مشہور اور سماعی روایات کے تحت یہاں کے قدیم باشندے ہندو تھے۔ جنہیں "سیوا" کہاجاتا تھا اور انہیں کی یہاں حکومت تھی یہ ۷۰۰ء سے پہلے کی بات ہے۔ انہیں حکمرانوں میں سے ایک ہندو رانی گزری ہے۔ جس کا نام سیوی تھا۔ اسی کے نام پر "سیوی" شہر آباد ہوا اور کثرتِ استعمال سے سبّی کہلانے لگا۔ اب بھی یہاں عورتوں کے ناموں میں "سیوی" بہت مقبول ہے۔

ہندوستان میں سکندر اعظم کی جنگوں کا جب ذکر آتا ہے جہاں اور قبیلوں کا بیان ہے وہاں "بی" یا "سبیا" کا نام بھی لیا جاتا ہے، مگر اس ضمن میں نام کی ہی یگانگت پائی جاتی ہے۔ اور اس کا شہر سبّی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ بات نہایت ہی غلط طور پر مشہور ہوگئی ہے کہ یہاں سکندر اعظم کو منہ کی کھانی پڑی تھی۔

مسلمانوں کی اس علاقے میں آمد

تقریباً چھ سو صدی عیسوی میں پہلی دفعہ مسلمانوں کا بلوچستان اور سندھ سے تعلق ہوا بلاذری جو مشہور عرب تاریخ دان ہیں ان کے بیان کے مطابق حضرت عثمانؓ نے عراق کے گورنر عبداللہ بن عامر کو ہدایت کی کہ بلوچستان اور سندھ کی طرف ایک تجربہ کار مشن روانہ کیا جائے تاکہ وہاں کے حالات سے واقفیت ہوسکے، چنانچہ حکیم بن جبلہ العبدی کو اس کام پر متعین کیا گیا۔ ان کی رپورٹ کے مطابق کہ اس علاقے میں پانی بالکل ناپید ہے پھل ہیں مگر کھانے کے قابل نہیں۔ چور اور ڈاکو بلا روک ٹوک ظلم ڈھاتے ہیں۔ جیسے ظالم لوگ ہیں ایسا ہی ظالم علاقہ۔ تھوڑی فوج کے لئے کامیابی ناممکن ہے، بڑا لشکر بغیر رسد نہیں ٹھہر سکتا۔ حضرت عثمانؓ کو تعجب ہوا کہ یہ حقیقت ہے یا شاعری۔ جس پر حکیم بن جبلہ العبدی نے جواب دیا "حقیقت ہے" کہا جاتا ہے کہ خلیفہ سوم نے اس علاقے پر حملے کا ارادہ ترک کردیا۔

حضرت علیؓ کے خلافت کے دور میں حارث بن مُرّہ العبدی نے بلوچستان کی سرحد پر چڑھائی کی۔ بیش بہا مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ پھر دورِ معاویہؓ میں بھی باقاعدہ اس علاقے پر لشکر کشی ہوئی یہ بات محمد بن قاسم سے پہلے کی ہے۔

JALALI BOOKS

ایک روایت کے مطابق اِس وقت راجہ سہراراۓ اس علاقے کا حکمراں تھا اس کا دارالخلافہ "الور" تھا۔ سنا ہے کہ اس ہندو راجہ کی حکومت دور دراز کے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ عربوں کے ہاتھوں اس راجہ نے مکلان میں شکست کھائی اور مارا گیا۔ لیکن میر معصوم' جو سندھ کے مشہور تاریخ داں مانے جاتے ہیں' ان کے مطابق یہ عرب نہیں بلکہ ایرانی ۔ یعنی "بادشاہ نیمروز کی جو فوج فارس سے چلی اور براہ کرمان ہوتی ہوئی کیچ اور مکران پر حملہ آور ہوئی"۔ اگر میر معصوم صاحب کی یہ بات درست مان لی جائے تو یہ واقعہ چھ سو صدی عیسوی سے پہلے کا ہوگا۔

ایرانی یا عرب حملہ آوروں کے بعد سہراراۓ کے بیٹے "سہاسی" نے حکومت سنبھال لی جیسا کہ ہوا کرتا ہے۔ سہاسی کے برہمن وزیر "راۓ چچ" نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اور اس نے چالیس سال تک سندھ اور اس علاقے پر حکومت کی۔

راجا داہر

راۓ چچ کا بیٹا جسے آج کل رسواۓ زمانہ کہا جا سکتا ہے مشہور راجا داہر تھا' اسے ۷۱۱ء میں جواں سال جنرل محمد بن قاسمؒ نے شکست دے کر برصغیر میں اسلامی حکومت کو مستحکم کیا اور وہ مکران اور سندھ کو فتح کرتا ہوا ملتان تک جا پہنچا۔

جب ہم اس علاقے یعنی سبی اور اس کے گرد و نواح کا تاریخی تجزیہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مری بگٹی کا علاقہ بھی کسی حد تک اس میں شامل ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہ علاقہ خاص طور پر بقیہ بلوچستان سے کچھ الگ تھلگ سا ہے' اس کی وجہ پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی اس کا تعلق بہ نسبت خراسان کے ملتان اور کچھی سے زیادہ رہا ہے۔

محمد بن قاسم کی فتح کے بعد تقریباً ۱۰۰۰ء تک اس علاقے کی تاریخ کا کوئی خاص پتا نہیں چلتا۔ بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ ہم نے اس دور کی تاریخ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی یا یوں کہیئے کہ ہم نے معلوم کرنے کی کوشش تو کی لیکن اپنی مجبوریوں کی وجہ سے یہ کہہ کر اپنے آپ کو یہ سمجھا لیا کہ ایک سپاہی کے لئے اتنا ہی جاننا بہت کافی ہے۔ ۱۰۰۰ء کے شروع میں سبّی کا علاقہ محمود غزنوی کی حکومت میں شامل تھا۔ جنہوں نے

۴۰۰۱ء میں ملتان کو فتح کر کے اس علاقے کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

اس کے بعد سے اس علاقے کا عجب عالم رہا کبھی بغاوت ہوتی اور لوگ اپنی ریاست قائم کر لیتے، کبھی یہ حصہ قندھار کا حصہ بنتا تو کبھی ملتان کا۔ جہاں کے بادشاہ طاقتور ہوتے اس پر قابض ہو جاتے۔ جب امیر تیمور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر واپس گیا ہے تو سُنا ہے کہ صوبہ ملتان پر لنگھاون نے قبضہ جما لیا اور سبی ان کی چھوٹی سی ریاست بن گیا۔

ارغونوں کا قبضہ!

بعد میں مسلمانوں کا زور ہوا اور علاقہ ان کے زیر اثر رہا۔ پھر ۱۴۷۰ء میں امیر شجاع الدین ذوالنون جو کہ ارغون تھے یعنی ترک کو شال (کوئٹہ) پشونگ (پشین) اور سبی۔ سلطان حسین مرزا نے حوالے کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عطیہ تھا جو اُن کو فوجی خدمات کے صلے میں دیا گیا تھا۔

ایک اور روایت ہے کہ امیر ذوالنون کے بیٹے شاہ بیگ نے زبردستی ۱۵۱۱ء میں سبی کے علاقے پر قبضہ کیا اور یہاں کے قلعے کو از سرِ نو تعمیر کرایا اور پھر واپس قندھار کا رخ کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بلوچوں کی آپس کی لڑائی جسے ۳۰ سالہ رند لاشاری جنگ کہا جاتا ہے شروع ہوئی۔ بلوچی ادب اور شاعری سے پتہ چلتا ہے شاہ بیگ کے حملے سے پہلے سبی پر رندوں کا قبضہ تھا اور میر چاکر اُن کے سردار تھے۔ لاشاریوں کے سردار میر گوہرام نے لنگھاون سے ملاپ کیا اور سبی پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں میر چاکر نے شاہ بیگ کے ساتھ مل کر دوبارہ سبی پر قبضہ کر لیا۔ ارغونوں نے وعدہ کیا کہ سبی رندوں کو واپس کر دیا جائے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ اور میر چاکر کو بلوچستان چھوڑنا پڑا۔ یہاں پر اتنا ہی ذکر کافی ہے۔

شاہ بیگ ارغون:

۳۰ سالہ رند لاشاری جنگ کا حال آگے بیان کیا جائے گا۔ مختصر یہ کہ بابر کے ڈر سے شاہ بیگ کو قندھار چھوڑنا پڑا اور اس نے سبی کوئٹہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ شاید اس زمانے میں بھی سردی اور گرمی کا خیال رکھا جاتا ہوگا۔ گرمیوں میں سبی میں ٹھہرنا مشکل ہی ہوتا ہے۔ قندھار جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں کون مائی کا لال بابر سے ٹکر لے سکتا تھا۔ لہٰذا ۱۵۱۵ء میں شاہ بیگ

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

نے سندھ کا رُخ کیا اور بتدریج ۱۵۲۰ء میں اس نے ٹھٹھہ فتح کر لیا۔ پھر وہ اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لئے گجرات کی مہم پر روانہ ہوا۔ اسی مہم میں جب وہ موضع اگھم پہنچا تو درد سینہ میں مبتلا ہو کر ۲۲ شعبان ۹۲۸ھ کو اس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

شاہ حسن ارغون:

شاہ بیگ کے بعد اس کے بیٹے شاہ حسن نے حکومت سنبھالی۔ چونکہ اب سلطنت وسیع ہو چکی تھی اس نے اس علاقے کو سلطان محمود کے سپرد کیا۔ سلطان محمود بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ ۱۵۴۲ء میں جو علاقہ آج کل مری بگٹی ایجنسی کہا جاتا ہے اُس نے اس کی طرف خاص توجہ دی۔ میر معصوم صاحب کے مطابق سلطان محمود نے کئی بلوچی قلعوں کو فتح کیا اس نے اس علاقے کے جنگجو لوگوں کی اچھی خاصی خبر لی اور انہیں امن قائم رکھنے پر مجبور کیا۔ سلطان محمود نے اس علاقے میں نئے قلعے بھی تعمیر کرائے ہم نے ایسے قلعوں کے کھنڈرات کئی جگہ خود بھی دیکھے ہیں اب تو صرف فصیلوں کے نشان باقی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فوجی نقطہ نگاہ سے جن جگہوں کا تعین کیا گیا تھا۔ آج بھی اہم ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا یعنی ۱۵۴۳ء کا جب ہمایوں ہندوستان چھوڑ کر سبّی سے ہوتا ہوا گزرا تھا شاہ حسن کی وفات کے بعد ہندوستان کے شہنشاہ اکبر کی حکومت زوروں پر تھی۔ سلطان محمود نے اپنے صوبے کو شہنشاہ کی حکومت میں شامل کرنے کی درخواست کی یہ قبول ہوئی یہ ادر پیر کے روز ۱۲ جمادی الاول ۱۵۷۴ء/۹۸۲ھ کو گیدل خان نے بھکر آکر بادشاہ کی طرف سے اس کے صوبے کو اپنے قبضے میں لے لیا سلطان محمود نے ۱۵۷۴ء/۹۸۲ھ میں وفات پائی۔

پنیریوں کی حکومت:

یہاں پر تو یہی عالم رہا ہے کہ جب بھی حکومت کمزور ہوئی امن و امان قائم رکھنا مشکل ہوا سلطان محمود کی وفات کے فوراً بعد سبّی اور اس کے گرد و نواح پر "پنیریوں" نے قبضہ جما لیا۔ "پنیری غذغشت" کے پٹھان یا افغان ہیں۔ جیسے جیسے ارغونوں یعنی ترکوں کا زور کم ہوتا گیا۔ پنیریوں کی طاقت بڑھتی گئی اب چونکہ ارغون کمزور ہو چکے تھے جھگڑا مغلوں اور پنیریوں کا تھا۔ ۱۵۷۶ء سے ۱۵۹۵ء تک کبھی مغل سبّی کے علاقے پر قابض ہوئے تو کبھی پنیری۔ بالآخر فتح مغلوں کی ہوئی۔ ۱۵۹۵ء میں میر معصوم جو مشہور تاریخ دان

تھے یہاں کے گورنر مقرر ہوئے انہوں نے اس علاقے کا نقشہ یوں بیان کیا ہے۔ علاقہ سبی اور گنداوا کے حدود اربعہ کچھ اس طرح سے ہیں۔ ست پور کا پہاڑی سلسلہ جو دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ "بیکن" کے گاؤں اور زمینوں سے ہوتا ہوا سیوی اور باتا تک پہنچ جاتا ہے جو کہ قندھار کے زیر اثر ہے۔ سیوی کا علاقہ ایک آدھے چکر کی شکل بناتا ہے اور پھر دریائے سندھ سے جا ملتا ہے۔ یہ درمیانی علاقہ دشت ہے اور قندھار جانے کے لئے اس دشت کے بیچ میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس علاقے کی لمبائی سیوی سے دریا کے کنارے تک سو کوس کا فاصلہ ہے اور چوڑائی ساٹھ کوس۔ اس علاقے میں سال کے چار مہینے میں سموم "گرم ہوا" چلتی ہے۔ یہ یہاں گرمی کا موسم ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں دشت کے بیچ میں گاؤں اور قلعے ہوا کرتے تھے جو اب ختم ہو چکے ہیں۔"

اس دشت کو تھوڑا بہت ہم نے بھی گھوم پھر کر دیکھا ہے۔ چٹیل میدان، میلوں تک پانی کا نام و نشان تک نہیں پہاڑوں کے کنارے پر کچھ چشمے نظر آتے ہیں جو کہ گرمیوں میں خشک ہو جاتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی کنوئیں میں پانی موجود ہے، آبادی پائی جاتی ہے۔ میٹھا پانی تو برائے نام ہے البتہ تقریباً سارا ہی پانی کھارا ہے۔ بس کہیں زیادہ اور کہیں کم۔ ایک بات ضرور ہے کہ سارے میدانی علاقے میں جا بجا کھیتوں کی منڈیریں بنی ہوئی ہیں۔ حالانکہ وہاں کوئی کھیت موجود نہیں ہے۔ اس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ علاقہ ماضی میں زیر کاشت ضرور رہا ہوگا۔ کہیں کہیں جھاڑیوں کے جنگل بھی ہیں۔ سردیوں میں آس پاس سے یعنی مری بگٹی علاقے کے لوگ یہاں مویشی چرانے کے لئے آجاتے ہیں۔ ایک آدھ جگہ کہیں پرانے قلعوں کے نشان اب بھی مل جاتے ہیں۔ میر معصوم صاحب نے تو صرف گرم ہوا کا ذکر کیا ہے یہاں ہم لوگوں پر جو بیتی ہے ہمیں ہی معلوم ہے۔ گرمیوں میں صبح نو بجے ہی سے درجہ حرارت ۱۲۴ ڈگری فارن ہائٹ ہو جاتا ہے۔ لیکن واہ رے ہمارے فوجی انجینئر۔ اس گرمی میں بھی سڑک بناتے رہے۔ یہ سڑک سبی سے ماوند تک مکمل ہو چکی ہے۔

شہنشاہ اکبر کے زمانے میں سیوستان سے ۱٬۳۸۱۹۳۰ درہم وصول ہوتے تھے اس کے علاوہ ضرورت پڑنے پر ۵۰۰ گھڑ سوار اور ۱۵۰۰ پیدل فوج بھی مہیا کرنی پڑتی تھی۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے دور حکومت تک اس علاقے میں مغلوں کا کافی زور رہا اور اس علاقے میں امن بھی برقرار رکھا گیا۔

اس دور کے بعد حالات کچھ زیادہ ہی ابتر ہونے شروع ہو گئے۔ ایک تو یہ علاقہ صوبہ ملتان کے تحت تھا اور پھر بالکل سلطنت کی سرحد پر ہونے کی وجہ سے راستے بھی محدود، ملک میں بھی خلفشار ایسے میں یہاں کے قبائلیوں کو موقع ملا تو پھر لوٹ مار شروع ہو گئی اور آپس کے جھگڑے خوب رنگ لائے۔ اب تک یہاں پر بہت سی قومیں آباد ہو چکی تھیں۔ اس علاقے پر تسلط اب بھی ہنیریوں کا تھا یعنی مرزا خان باروزئی یہاں کے بندوبست کے مالک، مگر ملتان صوبے کے تحت۔ جب اورنگزیب عالمگیر کا زمانہ آیا تو انہوں نے اپنے پوتے شہزادہ محمد معین الدین کو ملتان صوبے کا ناظم بنایا۔ سلطنت کو کمزور جانتے ہوئے ۱۷۰۰ء میں ہنیریوں نے بغاوت کا عَلَم بلند کیا۔ اس بغاوت میں آگے آگے مرزا خان باروزئی کے صاحبزادے بختیار خان تھے۔ شہزادہ معین الدین نے بغاوت کچلی اور بختیار خان مارے گئے۔ ۱۷۱۲ء میں شہزادہ معین الدین دہلی کے تخت پر بیٹھا اور جہاں دار شاہ لقب اختیار کیا۔ اپنی حیلہ یار محمد کلہوڑا کو ناظم مقرر کیا اور نواب کے لقب سے نوازا۔ بعد میں یار محمد کلہوڑا خدا یار خان عباسی کہلائے۔ اس زمانے میں قلات پر براہوں کا قبضہ تھا اور میر عبداللہ خان قلات کے خان تھے۔ ۱۷۳۱ء میں ناظم سے کچھ اَن بن ہوئی۔ ان کے صاحبزادے نور محمد نے قلات پر چڑھائی کی ٹھانی اور عبدالستار خان اس معرکے میں کام آئے۔

نادر شاہ کا قبضہ:

جب ملک میں خلفشار ہو تو باہر والے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ حملہ آور ہوا۔ اُدھر اس علاقے میں افراتفری تھی، نادر شاہ نے دریائے سندھ سے مغرب کا حصہ اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ شہزادہ نور محمد کو گرفتار کر کے عبداللہ خان براہوی کے صاحبزادے محبت خان کے، جو اس وقت قلات کے خان تھے، حوالے کر دیا "تاکہ وہ اسے مار کر اپنے باپ کا بدلہ لے"۔ محبت خان صحیح معنی میں بہادر تھے، کیوں کہ شیر خود شکار کرتا ہے۔ دوسرے کے مارے ہوئے کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ لہٰذا انہوں نے انکار کر دیا۔ اب معاملہ کیسے طے ہو۔ آخر طے پایا کہ خون بہا لیا جائے، لہٰذا کچھی کا علاقہ جس میں سبی بھی شامل تھا خون بہا کے طور پر قلات کے ساتھ ملا دیا گیا۔

پنیریوں کا دوبارہ قبضہ :

جب تک نادر شاہ حیات رہا معاملہ چلتا رہا۔ اس کے مرنے کے بعد پھر خلا پیدا ہوا۔ کوئی ایسا نہ تھا کہ علاقے کو قابو میں رکھتا۔ رکھتا بھی کیسے، علاقہ دشوار گزار اور لوگ بھی بغاوت پر آمادہ کہا جاتا ہے کہ نادر شاہ کی موت کے بعد پنیریوں نے اپنا علاقہ پھر سنبھال لیا۔ یعنی سبی اور آس پاس کے علاقے پر حکومت جمالی۔ درانیوں کا زور چونکہ کم ہو چکا تھا، لہٰذا انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ بارو زئی سرداروں کو اپنے اپنے علاقے کا حاکم یعنی گورنر رہنے دیا جائے تاکہ اثر بھی رہے۔ لیکن یہ حاکم بیچارے ہرنائی اور آج کل جو مری بگٹی کا علاقہ ہے، وہاں اپنا اثر رکھنے میں قاصر رہے۔ کیونکہ یہ قبیلے کب حاکموں کے قابو میں آنے والے تھے۔

فرنگیوں کا عہد :

۱۸۳۹ء میں فرنگی زور کافی بڑھ چکا تھا اور انھوں نے افغانستان پر چڑھائی بھی شروع کر دی تھی۔ انگریزوں کی تاریخ کو اگر غور سے دیکھا جائے تو انہوں نے لڑائیوں سے کم اور سازشوں اور جوڑ توڑ سے زیادہ ممالک کو حاصل کیا ہے۔ یہاں بھی انہوں نے روباہ بازیوں سے کام لیا۔ ۱۸۳۹ء میں افغانستان پر فرنگیوں نے چڑھائی کی۔ اب درۂ بولان کو فرنگی اپنے قابو میں رکھنا چاہتا تھا۔ . . . اس کے سامنے دو راہیں تھیں، یا تو اس پر لڑ کر قبضہ کیا جائے یا جوڑ توڑ سے، اس نے آخر الذکر طریقے کو ترجیح دی۔ مصری خان اس وقت پنیریوں کا سردار تھا۔ شاہ شجاع سے کہا کہ اسے اپنے ساتھ ملاؤ اور انگریزی دربار میں پیش کرو۔ مصری خان کو کافی روپے پیسے سے نوازا گیا اور پھر اس کے ساتھیوں سمیت ایک ملیشیا بنا کر کھڑی کر دی۔ یعنی کالوں کو کالوں سے لڑوایا جائے، ہاں تھوڑی بہت مدد کی جائے گی۔ جب آپس میں لڑ کر کمزور ہو جاؤ گے تو قبضہ بھی جمالیں گے۔ شاہ شجاع اس علاقے کا مالک تو ضرور تھا۔ مگر اس کی مانتا کون تھا۔ کوئی بھی مال گزاری دینے کو تیار نہ تھا۔ اس نے فرنگیوں سے مدد طلب کی۔ شروع میں تھوڑی تکلیف ہوئی مگر بعد میں سبی پر قبضہ کیا۔ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ گھر گرا دیئے گئے۔ آس پاس کے علاقے کو آگ لگا دی گئی۔ سال بھر اس جگہ کو قبضے

میں رکھا۔ آخر طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ پھر از راہِ ہمدردی لوگوں کو اجازت دی کہ واپس آجاؤ اور گھر بنالو۔ مگر اس شرط پر کہ آئندہ گڑبڑ نہ ہو اور سرکار برطانیہ کا نمائندہ یعنی پولیٹیکل ایجنٹ اس جگہ پر رہے گا۔ جب تک کہ سرکاری فوج افغانستان سے واپس نہیں آجاتی۔ افغانستان سے فوج کی واپسی پر علاقے کو خان آف قلات کے سپرد کیا گیا اور اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کو واپس بلا لیا گیا۔ ان تمام چالبازیوں سے انگریز کا مقصد یہ تھا کہ اپنا آمری اقتدار مضبوط کریں اور ضرورت پڑنے پر کابل سے واپسی میں تکلیف نہ ہو۔

سبی کی تاریخ کا سرسری جائزہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ دراصل سبی کا علاقہ مری قبائل کے بالکل متصل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ کبھی یہ اس سلطنت کے ماتحت ہوتے تو کبھی آزاد۔ زیادہ تر آزاد ہی رہتے کیونکہ اس علاقے پر قبضہ رکھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پہاڑ ہیں، پانی کی کمیابی، آنے جانے کے راستے محدود اور پھر لوگ آبائی جنگجو۔ یہ وجوہ تھیں کہ چند روز سے زائد اس علاقے پر کوئی قبضہ نہ رکھ سکتا تھا۔

آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ صدیوں سے یہاں قومیں آتی جاتی رہی ہیں۔ کچھ یہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ پہلے ہندو یہاں تھے، پھر عرب آئے۔ مغل ارغون یعنی ترک۔ پنیری۔ درانی اور پھر انگریز۔

اس پس منظر کے بعد اب ہم بلوچ قبائل کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

بلوچ قبائل
KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

ڈیفنس سیکرٹری میجر جنرل (ریٹائرڈ) فضل مقیم خاں وادیٔ گریزنی میں ایک زیر تعمیر کنواں دیکھ رہے ہیں

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
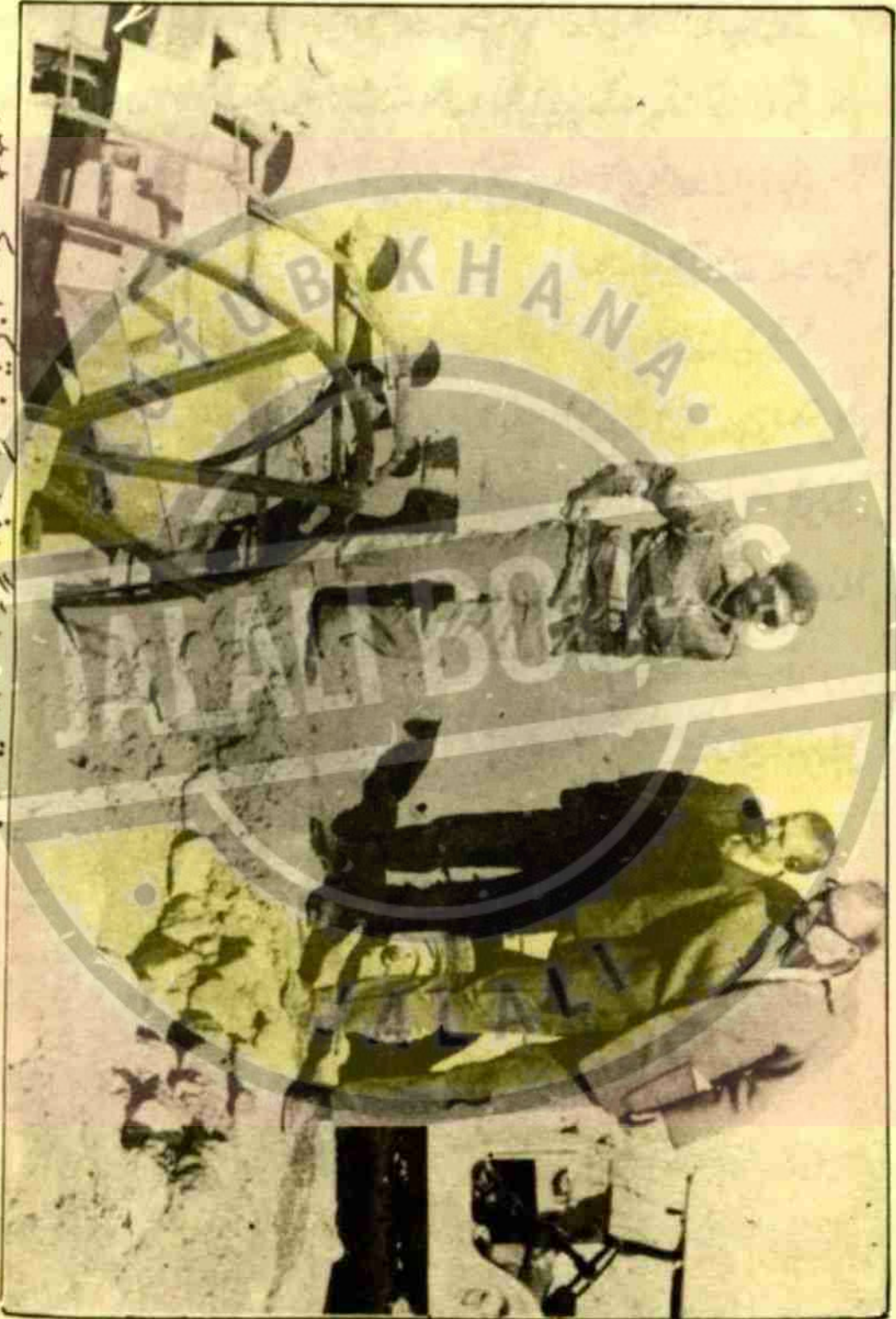
بلوچ قبائل

بلوچوں کا نسب:

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر آج کل کے بلوچ قبائل آئے کہاں سے اور کب اس علاقے میں آباد ہوئے۔ اس پر کافی تحقیق ہو چکی ہے۔ ریسرچ پر ریسرچ کرنا مشکل کام ہے اور میرے لئے تو ناممکن۔ مگر چلیئے کوشش کئے لیتا ہوں۔

پرانی بلوچی روایات اور ادب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ بلوچ حضرت امیر حمزہؓ کی اولاد ہیں۔ اب اس میں بھی کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کوئی اس کو کہانی سے تعبیر کرتا ہے تو کوئی کہتا ہے کہ اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس میں کتنی کہانی ہے اور کتنی حقیقت، یہ فیصلہ میں قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

ایک اور ادبی روایت کے مطابق حضرت امیر حمزہؓ شکار پر گئے تھے کہ راستے میں ایک پری سے ملاقات ہوئی اور اس سے عقد ہو گیا۔ پری کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عبدالرحمٰن رکھا گیا۔ ان سے آبان پیدا ہوئے۔ پھر اولاد کا سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ محمد بن ہارون پیدا ہوئے جو

محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ کی مہم پر تشریف لائے اور انہوں نے سات شادیاں کیں جن سے ماشاءاللہ پچاس اولادیں پیدا ہوئیں اور وہ یہیں کے ہو رہے۔

پرانی ادبی شاعری کی حد تک تو یہ کہانی، کہانی ہی ہے۔ کیونکہ بعد میں لوگوں نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ حضرت امیر حمزہؓ کے تمام صاحبزادے عین عالم شباب میں فی سبیل اللہ لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے اس لئے اولاد نرینہ کا سوال مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس روایت کی حمایت میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ایک روایت جو پشت ہا پشت سے چلی آ رہی ہے ایسی آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ آج کل کے زمانے میں پریوں کے وجود کو تسلیم کرانا مشکل ہے۔ لیکن یہ بعید از قیاس نہیں کہ حضرت امیر حمزہؓ عراق اور شام کے سفر پر گئے ہوں اور وہاں انہوں نے شادی کی ہو۔ اس بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن اگر ہم یہ مان لیں کہ وہ وہاں گئے ہیں، اور انہوں نے وہاں شادی کی ہے تو وہاں کی عورتیں مثالی خوبصورتی کے باعث پری کہلاتی تھیں۔ انہی کی اولاد سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔

لفظ بلوچ کی تحقیق:

اب ایک نظریہ جو عام ہے وہ یہ ہے کہ لفظ "بلوچ" دراصل پرانا لفظ نہیں ہے۔ اس میں تلفظ کی تبدیلیاں ہوتی رہیں اور موجودہ لفظ حال کی اختراع ہے۔ قدیم کوش رسم الخط "بعلوث" یا "بیلوث" تھا۔ اسیریا، بابل اور کلدانی مؤرخین نے اپنی تحریروں میں "بیلوس" یا "بعلوس" لکھا ہے۔ قرون وسطیٰ کے عربوں نے "بلوص" "بلوچ" اور اہل فارس نے اسے "بلوچ" سے موسوم کیا ہے۔

بلوچ کوش خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا مورث اعلیٰ بلوس تھا جسے نمرود بھی کہتے ہیں۔ (ملاحظہ کیجئے میر سردار خان گشکوری "HISTORY OF BALUCH RACE" ہسٹری آف بلوچ ریس)۔

ایک صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بلوچ قوم بلوص بن الکادس شاہ بابل کی اولاد ہیں۔ اور بلوچ ۸۵ھ قبل مسیح میں موجود تھے۔ اس کا پتا لگانے کے لئے انہیں سالہا سال کاوش کرنی پڑی۔ میر گل خان نصیر جنہیں بلوچی تاریخ پر کافی عبور ہے اپنی کتاب "تاریخ بلوچستان" میں لکھتے

ہیں"۔ یہ بلوچ قوم زمانۂ قدیم میں عربستان میں دجلہ اور فرات کی گودیوں اور حلب کے مرغزاروں میں ایرانی سرحد کے ساتھ ساتھ آباد تھی اور ایران میں تبریز سے کوہ البرز کے دامن میں مشہد تک پھیلی ہوئی تھی"۔

ابوالقاسم فردوسی نے بھی اپنی مشہور تصنیف "شاہنامہ" میں بلوچوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ داستان کم و بیش ۴۸۷۴ سال پرانی ہلے پرانی تاریخ پر مشتمل ہے۔ یہ ذکر کیکاؤس کی فوج کے بارے میں ہے چند مؤرخین نے اس کو کیخسرو لکھا ہے۔ اس کا دورِ حکومت ۵۳۵ سے ۵۸۰ قبل مسیح بتایا جاتا ہے فردوسی ان کی بہادری کے بارے میں لکھتا ہے۔

سپاہی زگردانِ کوچ و بلوچ	سگالندۂ جنگ مانند قوچ
کہ کس در جہاں پشت ایشاں ندید	برہنہ یک انگشت ایشاں ندید
سپہ دار شاں اشکش تیز ہش	کہ یادئے دل بود بانفر خوش
درفشے برآوردہ پیکر پلنگ	ہمے از درفشش بباز ید جنگ

یعنی یہ لوگ اتنے بہادر تھے کہ دنیا میں اپنی مثال نہ رکھتے، جنگ سے منہ نہ موڑتے اور جنگ میں کوئی ان کی پیٹھ نہ دیکھتا۔ انہوں نے جوشن۔ زرہ اور خود سے اپنے آپ کو اس طرح مزین کر رکھا تھا کہ ان کی انگلی بھی دکھائی نہیں دیتی تھی، ان کا اپنا جھنڈا تھا جس پر چیتا بنا ہوا تھا۔

ہسٹری آف دی ورلڈ (HISTORY OF THE WORLD) جسے ہنری اسمتھ ولیم (HENRY SMITH WILLIAM) نے مرتب کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ شاہِ ایران زرکس، جو کہ ۴۶۵ سے ۴۸۵ قبل مسیح میں فرمانروا تھا، اس نے جب یورپ پر حملے کی ٹھانی تو اپنی فوج کا جائزہ لیا۔ یہ فوج ۵۶ قوموں پر مشتمل تھی جن میں بلوچ بھی شامل تھے۔ یہ حوالہ ہنری اسمتھ نے مشہور یونانی مؤرخ ھیرو ڈوٹس کی تاریخ سے دیا ہے اب جب حسب و نسب کی بات چل نکلی ہے تو رائے بہادر لالہ ھتو رام صاحب سی۔ آئی۔ ای کی کتاب "تاریخ بلوچستان" پر نظر ڈالتے ہیں۔ رائے صاحب کی یہ کتاب ۱۹۰۷ء میں چھپی تھی اور بلوچ تاریخ پر کافی مستند مانی جاتی ہے۔ بقول لالہ صاحب کے انہوں نے ساری

عمر بادہ پیمائی کی اور نوکری کے دوران بلوچستان کا کوئی بھی کونہ نہیں چھوڑا اور لوگوں سے مل مل کر اور کتابیں پڑھ پڑھ کر روایات اکٹھا کرتے رہے، اس دقت و کاوش سے انہوں نے کتاب مرتب کی۔
لالہ صاحب بلوچ کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ حلبی زبان میں بلوچ بادیہ نشین کو کہتے ہیں جو لوگ ہمیشہ صحرا اور دامن کوہستان میں خانہ بدوش رہنے والے ہوں ان کو بلوچ کہا جاتا ہے (جیسے پوندہ افغانی زبان میں مردم بادیہ نشین کو کہتے ہیں) یہ لفظ کسی قوم سے متعلق نہ تھا بہت مختلف قوموں پر یہ لفظ مستعمل ہوتا رہا۔ اب بھی چند قومیں اس بلوچستان میں ایسی رہتی ہیں جن کا نسب نامہ ایک دوسرے سے مختلف ہے لیکن تمام قوم بلوچ کہلاتے ہیں۔ ماسوائے رند اور لاشاری کے براہوی۔ وودائی۔ نوشیروانی۔ گچکی یہ بھی بلوچ کہلاتے ہیں حالانکہ ان کا نسب نامہ رند اور لاشاری سے بالکل جدا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم پیشہ و ہم وطن ہونے کے باعث ان کو بلوچ نام دیا گیا ورنہ وہ بالکل خاندان بلوچ سے الگ ہیں۔ اسی طرح گیلانی و ایلانی و کردھی بلوچ کہلاتے ہیں اور فردوسی نے اپنی تصنیف شاہنامہ میں اس قسم کی جملہ اقوام کو بلوچی نام دیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بلوچ لوگ امامین کے مرید تھے اور جب فیمابین، امامین اور یزید میں لڑائی ہوئی جس میں امامین شہید ہوئے تو بلوچ لوگ امامین کے طرف دار تھے اور یزید کے خوف سے حلب سے کوچ کر کے اس طرف آئے۔"

لالہ صاحب نے اپنی اس تحقیق کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایک پرانی بلوچی نظم درج کی ہے بقول ان کے یہ سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے لیکن اب تو سینہ بہ سینہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ لالہ صاحب نے تو یہ نظم چھپوادی۔ ویسے شاید لالہ صاحب کو یاد نہیں رہا کہ ان کے ایک انگریز اعلیٰ افسر جن کے ساتھ وہ کام کرتے رہے تھے یعنی مسٹر ایم۔ ایل ڈیمس (Mr. M. L. DAMES) نے اس نظم کے ساتھ ۱۹۰۷ء ہی میں ایک بلوچی نظموں کا مجموعہ پاپولر پوئٹری آف دی بلوچستان (POPULAR POETRY OF THE BALUCHISTAN) کے نام سے انگلستان میں چھپوا دیا تھا اس کی کاپی ابھی تک برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔ چلئے ہم بھی اس نظم کو بجنسہ ترجمے کے ساتھ

ذیل میں درج کرتے ہیں۔

شکر الحمد ءُ گزاران بادشاہ ملک ءُ اوث ایں

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ وہ جو ملک کا بادشاہ ہے۔

یہ وَث ءُ کھوشتی س ملک ءُ کل جہاں خاک و گِلا ایں

ایک ہی ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا آخر تمام جہان خاک اور گِل ہوگا۔

ما مریداوں علیؓ ءِ دین و ایمان ثیبت ایں

ہم لوگ (بلوچ) حضرت علیؓ کے مرید ہیں دین ایمان ہمارا ثابت ہے۔

حمزہؓ ءُ اولاد بلوچ ایں سوب درگاہ ءُ گوراِیں

بلوچ امیر حمزہؓ کی اولاد ہیں اور درگاہِ الٰہی سے اُن کو فتح نصیب ہے۔

از حلب ءُ پھاذ کھایوں گو یزید ءُ جھیڑو ایں

ہم حلب سے اُٹھے (جبکہ) یزید سے ہماری جنگ ہے۔

کلبلا بھمپور نیام ءُ شہر سیستان منزل ایں

ہم نے کربلا اور بمپور کے درمیانی علاقہ سیستان میں قیام کیا۔

منزں میرں جلالاں چل و چیاریں لوگ ایں

جب حلب سے روانہ ہوئے بڑا سردار بلوچوں کا میر جلالاں تھا اور چوالیس فرقے بلوچی کے تھے۔

کھا حشون ہارین بند ءُ کیچ ءُ راستیں پلو ایں

وہاں سے ہارین بند میں جو جانب راست ملک کیچ کے ہے۔

سیم وجوآں بہر کھنا ءُ کل ءُ سردار شیہک ایں

ملک اور جوہائے آب بلوچوں کے ہاتھ میں آئے آپس میں تقسیم کرتے آئے اس وقت سردار کل قوم کا میر شہلک تھا۔

مکران ءُ ہوت سندی کھوسغ من کیچ ءُ رِدہ ایں

ملک مکران میں ہوتِ بلوچ اور کھوسہ علاقہ کیچ میں

ڈیہہ حب چانڈیہ تیغ ایں کلمتی لوغ پہ گوراِیں

جب میں چانڈیہ اور کلمتی اس کے آس پاس

من نل ءُ نوح سندی جتکانی پہ گوراِیں

اور نل میں نوحانی بلوچ اور جتکانی اس کے قریب تھے

JALALI BOOKS

مستریں لوغ ڈومبکی گاج سیاہ آف سراں

ڈومبکی کا بڑا گھرانا گاج اور سیاہ آف کے اوپر تیر عالی جنوبی تمام علاقہ ڈھاڈر میں۔

گولو دگوپانگ و دشتی رندء تھالی ءِ دراں

گولہ و گوپانگ دشتی رند کے برادری سے باہر ہیں

تھی بلوچ بازو بشاراں درست رندء تہہ ایں

اور بھی بلوچ بہت ہیں جو تماماً رند کے ساتھ شامل ہیں۔

نوح و دودائی ادارے اے گوں لاشاریہ براں

نوحانی دودائی لاشاری کے ساتھ شامل ہوئے ہیں

رند و لاشاری مں ملکءَ بھ وث ءِ سیماندراں

رند اور لاشاری کا ملک ایک دوسرے سے متصل ہے

رند من سوران ءِ نندی لاشار من گنداوغ ایں

رند شوران میں بیٹھا اور لاشاری گنداوہ میں

پیلیں سی سال جنگ ایں اے بلوچی شدت ایں

پورے تیس سال آپس میں جنگ کی یہ بلوچوں کی ضد ہے

شیہک و شہداد رند ءِ لس ءِ سردار چاکر ایں

شہک اور شہداد کے بعد تمام قوم کا سردار میر چاکر تھا۔

چل ہزار رکھے میر ءِ گو آنکھ ءِ تھیغا ڈاڈے پونروایں

چہل ہزار لشکر میر چاکر کے بلانے پر تمام ایک خاندان سے حاضر ہوتے تھے۔

ہول پوش دوز کلاہ دوزکوان وجابہ ایں

بعضے خود پوش اور بعضے ہاتھ میں دستانے پہنے ہوئے بعض کمان اور زرکش کمان خوب سجی ہوئی۔

بٹ و پیچے گوں کواہاں پھاذ لالیں موشغ ایں

بعض کمان و ترکش سے لیس۔ ابریشمی قبائیں اور پاؤں میں سرخ موزے پہنے ہوئے۔

کُہراں جاڑہ و جور جوابیں ہدہ ءِ برادر ایں

جاڑو از قوم پر مشہور بہادر تھا۔ ہدہ اس کا دینی بھائی تھا۔

بیروز شہہ، بجاز ریحان رند میراں زہم جن ایں

پیروز شاہ، بجاز، ریحان، میران از قوم رند مشہور شمشیر زن تھے۔

ہیبتاں بیورغ مں رنداں میر حسن و براہم ایں

ہیبتان بیورغ میر حسن براہم بھی رند تھے۔

سوبھ و عالی و میہال جام سہاک و علنڑ ایں

صوبہ عالی میہان جام سحاق علن بھی تھے۔

JALALI BOOKS

شاعر کہ شیئران ءَ جوڑان میر جلالاں منصفاں   شاعر لوگ جو شعر کہتے ہیں گویا کہ جہان کے گلشن میں نہال لگاتے ہیں۔

اے منی ہیرا اور رنداں اے بلوچی ویتراں   یہ بلوچوں کا نسب نامہ اور تواریخ ہے۔

ذکر چونکہ تاریخ کا ہو رہا ہے۔ ہم نے اجمالاً یہاں تاریخی جائزہ پیش کیا ہے۔ ہمارے لئے تو یہ امر بہت مشکل ہے کہ ہم یہ فیصلہ دیں کہ ان میں کون سی بات سچ ہے اور کون سی غلط' ہم اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ دراصل ہمارا مقصد یہ ہے کہ جس علاقے میں بھی آپ جائیں اور خاص طور سے فوجی آدمی کے لئے اس علاقے کی تاریخ سے تھوڑا بہت واقف ہونا ضروری ہے۔ اس طرح عملی کارروائی میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہ تو اپنا ملک ہے۔ ہم اپنے بارے میں نہیں جانیں گے تو اور کون جانے گا۔ تحقیق و تلاش اور جستجو کا یہ شوق بیرونی ممالک کے ریسرچ اسکالروں کو بہت زیادہ ہے' چنانچہ ماہ مارچ ۱۹۵۵ء میں ایک امریکی مسٹر این فرسن (Mr. N. PHERSON) معہ اپنی بیگم کے مری علاقے میں تشریف لائے۔ یہ اینتھروپولیجسٹ (ANTHRO POLIGIST) تھے۔ یعنی" عالمِ انسانیت"میرے خیال میں اس "عالمِ انسانیت" کی تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے۔" عالمِ انسانیت" سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک علاقے کے رہنے والوں کا فعلیاتی اور نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں۔ ویسے یہ مضمون ہماری یونیورسٹیوں میں بھی پڑھایا جاتا ہے۔ وہ ہمارے بھائیوں کے ساتھ رہے ان کی زبان سیکھی اور بھران کا یہیں ۸ ستمبر ۱۹۵۵ء میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کے ایک ساتھی فریڈرک بارتھ (FREDIRIK BARTH) صاحب پہنچے۔ اور انہوں نے مرحوم کی بیگم صاحبہ کے ساتھ مل کر کام مکمل کر کے ایک کتاب مرتب کی جس کا نام "دی سوشل آرگنائزیشن آف دی ماڑی بلوچ (THE SOCIAL ORGANISATION OF MARI BALUCH) ہے یہ کتاب کافی مستند مانی جاتی ہے۔ ہمارے اسکالر جا بجا اس کتاب کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان کی اس تحقیقی کتاب کو دیکھ کر ان کی ہمت اور اولوالعزمی کی داد دینی پڑتی ہے اس کے علاوہ مصنف مذکور اس سے قبل" لیپ لینڈ"(LAP LAND) میں بھی اس قسم کا کام کر چکے تھے۔

JALALI BOOKS

تاریخ سے واقفیت کا اصل مقصد:

"تاریخ سے واقفیت کا اصل مقصد یہ ہے کہ آج کل کے حالات کا تعلق ماضی سے بھی ہوتا ہے، کوئی بھی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک اُس کے سارے حصے یا یوں پھر کہہ لیجئے کہ "صوبے" میں نہ ہوں۔ جہاں پاکستان کے ترقی یافتہ علاقے "حال" میں ہیں تو یہاں ابھی تک ماضی موجود ہے۔ اب باقی دنیا کے حالات سے حساب لگایئے تو یہ پتہ چلے گا کہ ترقی یافتہ قومیں اگر "حال" میں ہیں تو ہم ابھی "ماضی" میں ہیں حال اور ماضی کے خلا کو پہلے ملکی سطح پر دور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ خلا دور کر کے ہم پھر یہ جدوجہد کر سکتے ہیں کہ اپنے ملکی اور ترقی یافتہ قوموں کے خلاء کو دور کر کے "حال" میں داخل ہو جائیں ملکی سطح پر اگر یہ خلاء دور نہ ہوا تو جناب بات نہیں بنتی۔ ملک کا کچھ حصہ ترقی یافتہ اور باقی سترھویں صدی میں تو سترھویں صدی والا تو آپ کو پیچھے گھسیٹے گا۔ وہ تو اس ذہنیت میں سوچے گا جس دور میں وہ ہو۔ آج کل دنیا بہت چھوٹی ہے۔ دشمن تاک میں ہمیشہ سے ہے اور رہے گا۔ سترھویں صدی والے کو اکسایا اور آپ کی ترقی کو تنزل کی طرف مائل کر دیا۔ یہ تو ہوتا آیا ہے۔ آپ نے خود دیکھ لیا۔

فلسفہ کو چھوڑیئے بات تاریخ کی تھی اور وہ بھی لالہ ہتھو رام کی کتاب "تاریخ بلوچستان" کے متعلق۔ اب تک ہم نے آپ کو مختلف کتابوں کے حوالے دے کر یہ کوشش کی کہ ایک قسم کا تاریخی پس منظر علاقے کے بارے میں قائم ہو جائے۔ لیکن لالہ صاحب نے دریا کو کوزے میں سمونے کی کوشش کی ہے تو آپ بھی سن لیں۔

جو لوگ علم تاریخ سے واقف ہیں وہ انکار نہیں کریں گے کہ زمانہ قدیم میں یہ ملک بلوچستان بلکہ افغانستان بھی ہندو راجاؤں کے قبضے میں تھا۔ چنانچہ "مہا بھارت" میں جو ایک قدیم تواریخ ہندوؤں کی ہے صاف طور پر لکھا ہے کہ راجہ سیسپال پچھم دیس کا یعنی مغربی حصہ ہندوستان کا چند بار کرشن مہاراج سے آ کر لڑائی کرتا رہا اور جب فیمابین پانڈو۔ کرو جس کو پانچ ہزار برس سے بھی اوپر عرصہ گزر چکا ہے بڑی سخت جنگ ہوئی تھی۔ اس وقت شکنی نام راجا قندھار کا جو راجا تھر اشٹر کیرو کا خسر ہوتا

تھا۔ کیرو لوگوں کی طرف تھا بلکہ اس کی دختر کا نام جو راجہ تھراشٹر سے بیاہی ہوئی تھی دیو گندھاری تھا قندھار کا نام ہندو کتابوں میں گندھار لکھا ہوا ہے جس کے معنی خوشبودار کے ہیں ایرانی لوگ بھی اب تک قندھار کو گندھار استعمال کرتے ہیں۔ سیوا نامی ایک مشہور راجا اس ملک کا ہوا ہے۔ شہر سیوی بھی اسی نے آباد کیا تھا۔ اس لئے اس کا نام سیوی مشہور ہوا۔ اب تک وہی پرانا نام چلا آتا ہے جب بلوچ لوگ آ کر اس ملک میں آباد ہوئے۔ اس سے پہلے پرانی کتابوں میں سیوستان مشہور تھا۔ قلات میں اب تک ایک فرقہ موجود ہے جو سیوازئی کہلاتا ہے۔ یہ اسی سیوا کے خاندان سے ہے۔ یہ لوگ ہندو تھے مگر اب مسلمان ہیں اور ان کی تین زیارتیں عرصہ قدیم سے اس ملک میں چلی آ رہی ہیں۔ مثلاً قلات میں کالی دیوی، مستونگ میں مہادیو اور شال میں سمادھ جوگی بابی ناتھ اور ان کی تینوں زیارتوں کے متعلق ہندی میں ایک شعر بھی ہے ؎

کالی وسے قلات میں مہادیو مستونگ بڈھڑا جوگی شال میں بابی ناتھ بلونت

معلوم ہوتا ہے کہ پہلے قلات کو سیوازئی ہندو لوگوں کے ہاتھ سے اقوام مغل نے لے لیا۔

کتب قدیم سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پہلے مغلوں کا بڑا زور تھا۔ نادر شاہی تک مغل طاقت میں تھے۔ بعد اس کے ان کا زور ٹوٹا اور افغان نے زور پکڑا۔ افغانوں کے بعد اقتدار بروہیوں کے ہاتھ آیا اور بلوچوں نے زور دکھایا۔ اس کے بعد انگریز مسلط رہے۔ یہ بھی وضاحت ضروری ہے کہ گزشتہ اوراق میں جو بلوچی نظم دی گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ بلوچ کرمان سے کوچ کر کے کیچ اور مکران میں آئے۔ اس وقت سارے بلوچوں کا سردار میر جلالال یعنی جلال خان تھا اس وقت ان کے چوالیس فرقے شمار کئے جاتے تھے۔ فرقہ عجیب چیز ہے سردار بدلتے جاتے ہیں ان کی اولاد کے نام سے نئے نئے فرقے بنتے جاتے ہیں۔ انگریز کے گزیٹیر (GAZETTEER) میں مرلیوں کے فرقے دیئے گئے ہیں۔ یہ فرقے اس سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ وڈیرہ بھی اپنی اولاد کے نام سے فرقہ شروع کر دیتا ہے۔ پہلے ہم جلال خان کے متعلق عرض کرتے ہیں۔ جلال خان کے پانچ بیٹے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد پانچ بڑے فرقے لڑکوں کے نام سے رائج ہوئے یعنی رند، لاشاری، کورائی، جتوئی، ہوت۔ باقی چوالیس فرقے بھی انہی پانچ فرقوں میں مدغم ہو گئے۔ وہ تو ہونا تھا کیونکہ سوسائٹی اسی قسم کی تھی۔ بجاؤ سردار

ہی مہیا کرتا تھا اور سردار کی طاقت فرقے کی نفری پر منحصر ہوتی ہے۔ جتنا طاقتور سردار ہوا اتنے ہی لوگ اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان پانچ فرقوں میں سب سے مضبوط دو مشہور ہوئے یعنی رند اور لاشاری، ہوت، جتوئی بھی رند کے ساتھ مِل گئے۔ کورائی کچھ رند اور کچھ لاشاری سے مل گئے اس کے بعد ان سب نے مل کر مکران، قلات کا کچھ حصہ، کچھی اور سبی پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ لنگھاؤں کا برائے نام سبی اور کچھی پر اثر تھا۔ تقریباً تیس سال تک اِن فرقوں میں بڑی دوستی رہی آپس میں رشتہ داریاں تھیں۔ آخر حسب و نسب ملتا تھا۔ اس کے بعد آپس کی تیس سالہ جنگ چھڑی جس کا ذکر آئندہ اوراق میں کیا جائیگا۔

تیس ۳۰ سالہ جنگ
KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI
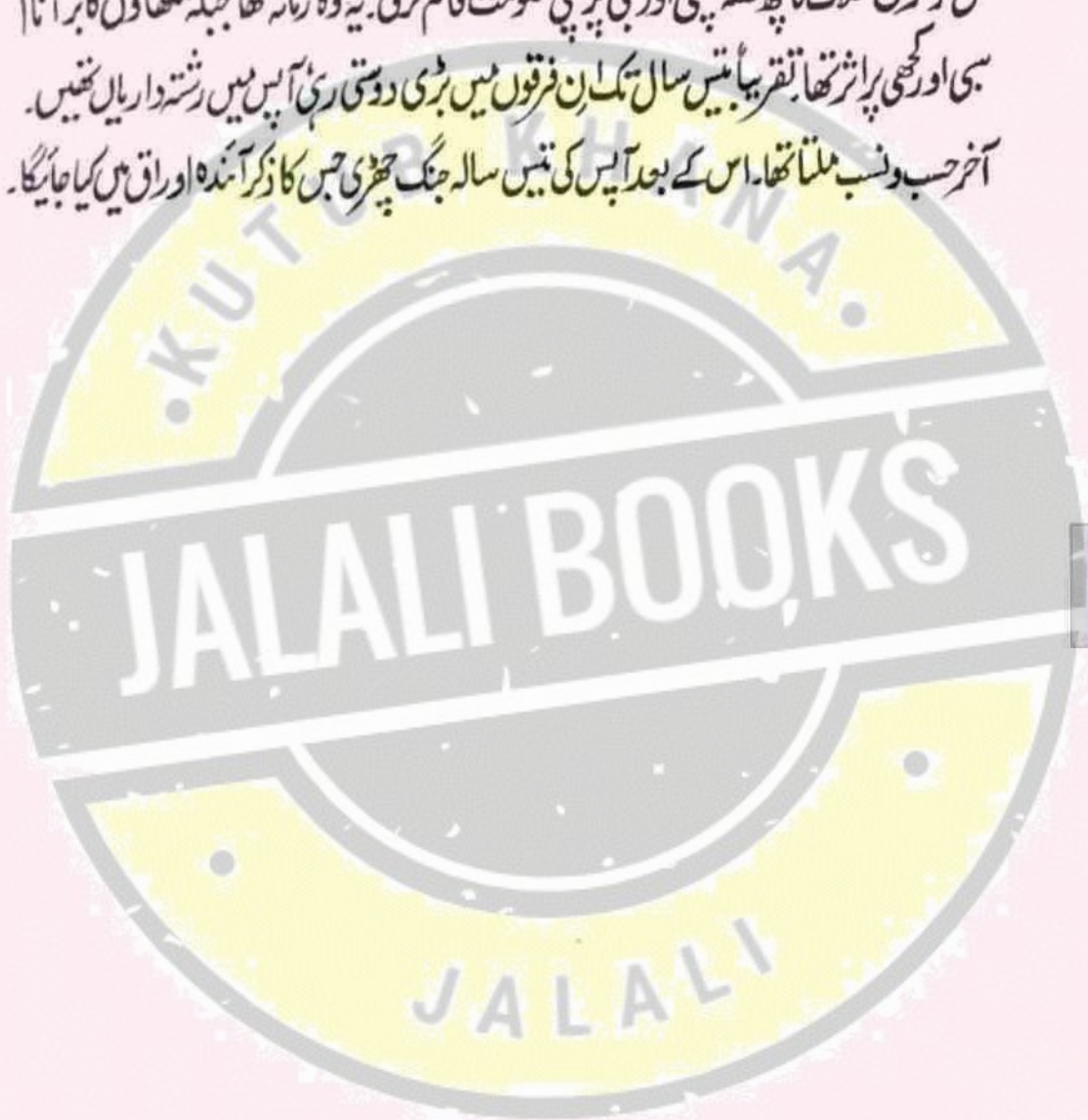
حلق کی ایک تصویر۔ جو نزدیک سے اُتاری گئی

تیس سالہ جنگ

KUTUB KHANA. JALALI BOOKS

اب بلوچوں کی ایک سلطنت سی بن چکی تھی۔ قلات و مکران کا کچھ حصہ، سبی، کچھی کا علاقہ اور آج کل مری بگٹی ایجنسی، یہ تمام علاقہ ان کے زیر اثر تھا۔ یہ واقعہ پندرھویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کے شروع کا ہے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سردار رند "شہک" کے بیٹے "میر چاکر" اور سردار لاشاری "گواہرام" کے بیٹے "رامن" میں گھوڑا دوڑانے کی شرط لگی یہ طے ہوا کہ رامن لاشاری کی گھوڑی "مہمل" اور ریحان رند جو کہ میر چاکر کے بھائی تھے، ان کی گھوڑی "سیاہ مزار" اس دوڑ میں حصہ لیں گی۔ دوڑ کے بعد یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ کون جیتا کیونکہ دونوں فریقین اس پر بضد تھے کہ ہم جیتے۔ کچھ نے فیصلہ دیا کہ میر چاکر شرط جیتے ہیں۔ اس کا رامن کو بہت قلق ہوا۔ قلق تو ہونا ہی تھا کیونکہ شرط ہی جیتنے کے لئے لگائی جاتی ہے۔ پھر یہ معاملہ قبیلے کی عزت کا بھی تھا۔ عزت ایسی آسانی سے گنوائی نہیں جا سکتی اب کیا کیا جائے۔ رندوں سے بدلہ لینا واجب۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عورت مسمات "گوہر جتنی"[1] میر چاکر کی پناہ میں

---

[1] جت ایک ذات ہے جن کا کام جانوروں کی دیکھ بھال ہوتا ہے۔ جت کا مؤنث جتنی یہاں استعمال کیا جاتا ہے۔

تھی۔ اس کے اونٹوں کو لاشاریوں نے رامن کی ہدایت پر ذبح کر دیا اور غارت کیا۔ مسمات "گوہر جتنی" فریاد لے کر میر چاکر کے پاس پہنچی۔ اس کا منظر ایک بلوچی نظم میں خوب بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم کے کچھ حصے کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

باہُگی جت گوں چاکرءَ گریئَنت	جت چاکر کے پاس جاکر روئے۔
گِنہ کہ رامین ءَ چھوں کھتہ غیری	دیکھو کہ رامن نے ایسی کی دشمنی
گوہرءَ ہترے گُڈّتہ پھیری	گوہر کے شتر بچے کو کاٹ دیا پرسوں
بے گناہی ءَ گریتھغاں خیری	بے گناہ امن پسندوں کو رلایا
گوہرانِ باہوٹ رندو لاشاری	گوہر باؤ دُھ تھی رند اور لاشاری کی
ہر دو راجانی نیام ءَ چاری	دونوں قوموں کے درمیان مال چراتی تھی۔
گیشتریں کُھرس چاکرءَ دائین	زیادہ تر میر چاکر کے پاس رہتی تھی
آن مزن کھونڑیں واہرائیں	وہ بڑا شیر تھا اور عزت والا تھا۔
داثئیَ وانہہ گوں بُرزیں دستان	فریاد کی اس نے ہاتھ اونچے کر کے۔
گوہر ہترِ راجتہ دھکّے	گوہر کے بچہ شتر کے مارے جانے کے بدلے
من گِد رولان گا ہتہ لکھے	ہم لائیں گے لاکھوں اسپ میدان میں
بیاتہ ماسی سال ڈیوں بکھے	آ جو تیس برس تک کریں جھگڑا
اش ہمے گالاں بُل کھڑو بیثہ	اس بات پر ہنگامہ بپا ہو گیا۔
زند و لاشارءَ جنگ کھڑو بیثہ	رند لاشاری جنگ شروع ہو گئی۔

یہ تو خیر بہت بڑی بات تھی کہ کسی کو پناہ دی گئی ہو اور وہ بھی عورت کو اور اسے تنگ کیا جائے بلوچی غیرت کا پناہ کے معاملے میں ایک نظم سے اندازہ لگا سکتے ہیں جو ترجمے کے ساتھ ذیل میں درج ہے:

شاہ حسین ءِ چہرہ ءَ روشن ءَ	ایک دفعہ امام حسینؑ کے ماتم کے دنوں میں
درکھنی باغارے اثرءَ گیڈءَ	جھاڑی میں سے ایک گرگٹ نکلا۔

KUTAB KHANA JALALI BOOKS JALALI

چھورواں انعار بوختہ پہ ویم ءَ
لڑکوں نے اس کے پیچھے دوڑنا شروع کردیا

گڑکھناں ءَ واں مہتر ءِ لوغ ءَ
اور دوڑتے ہوئے مقدم کے گھر تک آئے۔

نیست آمن لوغ ءَ تھوی سالوخ
اس وقت صاحب خانہ گھر میں موجود نہیں تھا۔

ورکھنی ویم ءَ مڑدے جوائیں
گھر کی نیک سیرت مالکہ باہر آئی اور

بیسٹری گال آختہ مزن شاخیں
پُروقار خاتون مخاطب ہوئی

قیانہی منت اش کُھتی ءَ بازیں
اس نے حد سے بڑھ کر منت سماجت کی۔

"چھورواں بے اے منی راہسھایں"
اور کہا "بچو۔ اسے چھوڑ دو یہ میری پناہ میں آگیا ہے"

بچ نہ ویثہ پہ منتاں جتاں
"لیکن "گنوار بچوں پر منت سماجت کا کوئی اثر نہ ہوا۔

چھورواں باغار کُھتنہ پہ لٹھاں
اور لڑکوں نے گرگٹ کو لاٹھیوں سے مار ڈالا

جلد کھوڑی ءَ بھیجثی ءَ واہنیں
عورت نے فوراً خاوند کے پاس فریاد پہنچائی

"تھو پہ باغار ءَ اغ نہ کھث کائی
"اگر تو نے گرگٹ کا بدلہ نہ لیا

من تھئی بھینڑو تھو منی بھائی"
(تو پھر) مجھے اس کے بعد اپنی بہن سمجھو اور میں تجھے اپنا بھائی سمجھوں گی"۔

اوا ئں ماہیں! گال میاگوما
(خاوند نے کہا) "اے ماہ رو! تو مجھ سے ایسی بات مت کہہ

تھو منی زال و من تھئی جوداں
تو میری بیوی اور میں تیرا خاوند ہوں۔

من پھر آیا غار ءَ کھناں پھیوں ءَ
میں گرگٹ کا بدلہ یوں لے کر دکھاؤں گا۔

کہ "لے ڈغار تھئی بیث از خون ءَ"
کہ زمین خون سے لالہ زار بن جائے گی۔

شنگر ءَ شصت و شانگر ءَ پنجاہ
(چنانچہ) ایک جانب سے ساٹھ اور دوسری جانب سے

درہ پہ باغار بثیغاں یک جاہ
پچاس یہ سب کے سب گرگٹ کی نذر ہوگئے

تو یہ قصہ تھا ایک عورت کا جس نے ایک گرگٹ کو پناہ دی تھی۔ ذکر ہو رہا تھا رندوں اور لاشاریوں کی جنگ کا۔ یہ سن ۱۶۰۰ء کے اوائل کی بات ہے اس وقت رندوں کا قبضہ سبی، کچھی قلات کا پہاڑی حصہ اور

آج کل کے مری علاقے پر تھا۔ ویسے یہ علاقہ ملتان صوبے کا حصہ گنا جاتا تھا۔ ملتان پر لنگھاؤں کی حکومت تھی۔ لاشاریوں نے لنگھاؤں سے مدد طلب کی اور سبی پر قبضہ کرلیا۔ یہ قبضہ تھوڑے ہی عرصے رہا۔ جیسے پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ مغلوں نے کوئٹہ پشین اور سبی کا علاقہ امیر ذوالنون کو ان کی خدمات کے سلسلے میں دیا تھا۔ لہٰذا امیر ذوالنون کے بیٹے شاہ بیگ ارغون نے سبی پر چڑھائی کی ٹھانی۔ میر چاکر بھی ارغونوں کے ساتھ شامل ہوگئے۔ زبردست جنگ کے بعد سبی فتح کرلیا کہا جاتا ہے کہ جنگ سے پہلے ارغونوں نے وعدہ کیا تھا کہ سبی کا علاقہ میر چاکر یعنی رندوں کو واپس کردیا جائے گا۔ اب بلوچ اپنی ہی نااتفاقی سے کمزور ہوچکے تھے اور ترکوں کا ارادہ بھی بدل چکا تھا۔ میر چاکر نے رات کی تاریکی میں سبی کو خیرباد کہا مگر ترکوں نے پھر بھی پیچھا کیا۔ میر چاکر مہوند اور رندری کے علاقہ میں آکر ٹھہرے۔ یہاں پر روایات میں معمولی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ یہاں ترکوں سے جنگ کرکے پنجاب چلے گئے اور بعض کا کہنا ہے کہ جب ہمایوں واپس دہلی گیا تو اس کے ساتھ گئے۔ اس کا ذکر وضاحت سے آگے کیا جائے گا۔ لاشاریوں کے سردار گوہرام پر کیا بیتی۔ جب سبی پر لنگھاؤں کو شکست ہوئی تو شاہ بیگ نے پیچھا نہ چھوڑا۔ گوہرام سنا ہے یہاں سے گجرات چلے گئے اور آج تک کسی کو ان کی قبر کا پتہ نہیں۔ یہ بددعا میر چاکر نے ان کو دی تھی کہ "تیری قبر کا پتہ تک نہیں چلے گا"۔

یہ تیس سالہ لڑائی تو ہم نے بڑے مختصر طور پر بیان کی ہے، اگر آپ یہاں کی نظمیں سنیں تو پتہ لگتا ہے کہ کتنی بہادری رندوں اور لاشاریوں نے دکھائی اور کیا کیا معرکے سر کئے۔ سبی کے معرکے کے بعد لاشاری شکست کھاکر بکھر گئے۔ کچھ ڈیرہ غازی خان کی سرحد پر جا بسے اور کچھ نے ڈیرہ اسمٰعیل خان میں پناہ لی۔ کچھ نے جھلوان کا رخ کیا اور براہویوں کے ساتھ رہنے لگے۔ کچھ چلتے چلتے سندھ اور کاٹھیاواڑ تک پہنچ گئے۔

میر چاکر کا نام بلوچ اب بھی بڑی عزت اور احترام سے لیتے ہیں۔ کچھ اسے ولی کا رتبہ دیتے ہیں اور کچھ اسے بے حد عقلمند اور بہادر جنرل گردانتے ہیں۔ روایت ہے کہ میر چاکر کا ایک بہت اچھا دوست شاہ مرید تھا۔ دونوں بچپن کے ساتھی تھے۔ شکار کھیلتے کھیلتے دور تک نکل گئے۔ سخت پیاس لگی تو دونوں

ایک خیمے کے قریب پہنچے۔ وہاں دو لڑکیاں ملیں۔ ان سے پانی مانگا۔ لڑکیاں پانی لے آئیں۔ میر چاکر کیلیے جو پانی لائی تو اس میں کافی گھاس پھونس پڑا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ پانی تیزی سے نہ پی سکا اور کم بھی پیا۔ دوست کے لیے جو پانی لائی وہ صاف اور ٹھنڈا تھا۔ لہٰذا شاہ مرید نے خوب پیا۔ اب گرمی میں جو واپس لوٹے تو شاہ مرید تھوڑی دور چل کر بیمار ہو گئے۔ اس قصے سے میر چاکر تاڑ گئے کہ لڑکی جس نے انھیں پانی پلایا تھا۔ بیحد عقلمند تھی کیونکہ اس نے جان بوجھ کر اس طرح پانی دیا تھا کہ وہ زیادہ پانی نہ پی سکیں۔ لامحالہ کسی سے محبت ہو سکتی ہے کہ ایک لڑکی جوان لڑکے کے ساتھ ایسی حرکت کرتی ہے بعد بعد میں یہ پتا چلا کہ جس لڑکی نے میر چاکر کو پانی پلایا تھا وہ دوست کی منگیتر تھی مگر میر چاکر دل دے چکے تھے لڑکی کی خوبصورتی اور اس کی عقلمندی پر۔ دل کا معاملہ سنگین ہوتا ہے اور پھر وہ بھی دوست کے حق پر کیا کیا جائے کوئی صورت تو بہر حال نکالنی تھی کہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو۔ زبردست جشن منایا گیا خوب سجی بنی۔ کھیل تماشے ہوئے۔ جب سب بیحد خوشی کے موڈ میں ہو گئے تو میر چاکر نے اعلان کیا کہ آج اس خوشی کے موقعہ پر سب کو اجازت ہے کہ جو کچھ مانگے گا وہ پائے گا۔ سب نے اقرار کیا اور حامی بھر لی۔ جو بھی جس کے جی میں آیا اس نے مانگا اور پایا۔ آخر میں میر چاکر کا نمبر آیا تو انھوں نے شاہ مرید سے مخاطب ہو کر کہا "مجھے اپنی منگیتر دے دو" اب بیچارہ زبان دے چکا تھا انکار کیسے کرتا اور وہ بھی بلوچی وعدہ۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ وعدہ وفائی کی حد ہوتی ہے۔ وعدہ نبھایا اور ایسا نبھایا کہ لوگ آج تک یاد کرتے ہیں۔ وعدہ وفا کر کے فقیری لے لی اور جنگل کا رخ کیا کہتے ہیں کہ وہ ابھی تک زندہ ہیں اور ان پہاڑوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔

میر چاکر کی زوجہ کا نام بی بی بانی تھا۔ ان کی عقلمندی کی بیشمار داستانیں مشہور ہیں، ایک تو پانی پلانے والی آپ نے سن لی، اب ایک اور سن لیں۔ سبی کی جانب سے اگر آپ میوند کی طرف جائیں تو ایک تنگی پڑتی ہے۔ اس کا نام چاکر تنگی مشہور ہے۔ ہم بھی وہاں کئی دفعہ گئے۔ اس تنگی کی اونچائی تقریباً ۔ ۱۰ فٹ ہے۔ یہاں فوجی انجینئروں کو سڑک بنانے میں خاصی دقت ہوئی کیونکہ بیچ میں گہرا نالہ ہے اور دونوں طرف اونچی چٹانیں۔ میر چاکر سبی سے نکل کر جب میوند کی طرف آئے تو یہاں ترکوں نے انھیں گھیر لیا۔ ترکوں کے

ساتھ بڑی فوج تھی۔ ہاتھی، گھڑسوار اور پیدل فوج۔ مگر سب سے زیادہ ڈر ہاتھیوں سے تھا۔ اب نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ بی بی ہانی سے صلاح ومشورہ کیا۔ انھوں نے جو مشورہ دیا وہ واقعی بہت مؤثر اور فوجی لحاظ سے بہت ہی کامیاب ثابت ہوا۔ کہنے لگیں کہ "گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ترکوں کا گھیرا عقلمندی سے توڑا جا سکتا ہے۔ سارے اونٹوں کے بچوں کو اکٹھا کرو، ان کی دُموں میں مشعلیں باندھ کر کجاووں پر لکڑیاں لاد دو، جب شام پڑے تو مشعلوں کو آگ لگا کر چھوڑ دینا" چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ رات کو آگ کی اس طرح حرکت دیکھ کر ہاتھی گھبرا گئے۔ ہاتھیوں کے ساتھ گھوڑے اور اونٹ بھی ادھر ادھر بھاگے اور افراتفری کے عالم میں گھیرا ٹوٹ گیا۔

یہ قصے سینہ بہ سینہ چلے آئے ہیں لیکن میر چاکر کی بہادری اور ان کی قیادت میں کسی کو کوئی شک نہیں۔ کچھ لوگ ابھی تک میر چاکر کو صاحب کرامت اور ولی سمجھتے ہیں۔ کہاوت مشہور ہے کہ "ڈنگن کے پہاڑ پر ابھی تک میر چاکر کی زرہ پڑی ہے اس پر جانے کا کوئی راستہ نہیں لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ وہ صاحب کرامات تھے اس وجہ سے بآسانی وہاں جا اور آ سکتے تھے۔" "ڈنگن" پہاڑ کی چڑھائی واقعی بہت مشکل ہے۔ مگر یہ پرانی باتیں ہونگی اب لوگ وہاں رہتے ہیں۔ جاتے اور آتے ہیں۔ ہم بھی وہاں گئے تھے مگر زرہ کا کوئی پتا نہ چلا۔ جب میر چاکر کی زرہ کی بات ہوی رہی ہے تو ایک روایت اس کے بارے میں اور سُن لیجئے۔ جاکر تنگی پر جب میر چاکر نے ترکوں کا گھیرا توڑا اور ترک پیچھے ہٹنے لگے تو تنگی کے اوپر سے میر چاکر نے اپنے علاقے پر نظر ڈالی اور بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اپنی زرہ، تلوار اور ڈھال چھوڑی۔ ساتھ میں ایک لوڑی (میراثی) تھا۔ اسے وہیں موت کے گھاٹ اُتارا کہ کہیں وہ دوسروں سے آنسو بہانے کا ذکر نہ کردے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میر چاکر اور ان کے ساتھیوں نے پنجاب کی راہ لی اور وہیں جا بسے۔ ان کے ایک ساتھی بجار خان بھی تھے۔ جن کا ذکر آگے وضاحت سے ہوگا۔ وہ بھی گئے مگر واپس آگئے اور میر چاکر سے اس بات پر مصر رہے کہ سبی کا علاقہ پھر لڑ کر واپس لیں۔

دوسری روایت جو زیادہ مستند ہے کہ ہمایوں جب خراسان سے چلا تو ۱۵۶۰ء میں دہلی پر چڑھائی کی۔ وہ درہ بولان ہی سے گزرا تو میر چاکر کو معہ ان کی بلوچی فوج کے ساتھ لے گیا۔ جب فتحیاب ہوا تو بلوچیوں

کو ان کی بہادری اور خدمت کے صلے میں علاقہ ستگڑھ ضلع ساہیوال جسے انگریز نے منٹگمری کا نام دیا تھا۔ مگر اب پھر ساہیوال ہو گیا ہے، کا علاقہ انعام میں دیا۔ بچارہ منٹگمری اب بھی بیقرار ہو گا کہ پاکستانیوں کو مجھ سے ہی بیر تھا۔ کیمبل، جیکب، ایبٹ اور پتا نہیں کتنے اور ہوں گے جن کے نام پر ابھی تک پاکستان میں شہر آباد ہیں۔ ان کے ناموں میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بات میر چاکر اور ستگڑھ کی تھی جو انہیں عطا کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ستگڑھ (ست گھرہ) ہندی لفظ ہے جس کے معنی سات گھر (سات خانے) کے ہیں۔ میر چاکر کے پانچ صاحبزادے تھے یعنی میر شہداد، میر اللہ داد، میرداد، میر باگر خان، میر نوح۔ تو پانچ خانے تو ہو گئے لڑکوں کے۔ ایک خانہ اپنے لیے اور ایک خانہ اپنی بیگم بی بی ہانی کے لیے۔ جو کہ خود بھی اس مہم پر بنفس نفیس خاوند کے ہمراہ تھیں۔ تیار کیے گئے۔ میر چاکر اُدھر ہی رہ گئے اور وہیں رحلت فرمائی۔ اگر کبھی ساہیوال جانے کا اتفاق ہوا تو تاریخی نقطۂ نظر سے ہم اس کے پتہ چلانے کی کوشش کریں گے۔

یہاں کی تاریخ کا ان کی ذات سے براہ راست تعلق ہے۔ ستگڑھ میں کافی بلوچ آباد ہیں۔ اب تو شاید نام کے بلوچ رہ گئے ہوں۔ میرا مطلب زبان، لباس اور طور طریقے سے ہے۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد روایات کو قائم رکھنا مشکل ہی ہوتا ہے۔

میر چاکر کے اس طرح علاقہ چھوڑ دینے سے بلوچوں کی قیادت میں ایک وسیع خلا پیدا ہو گیا۔ بلوچی کافی تعداد میں سندھ اور ڈیرہ جات کی طرف نکل گئے۔ بہاولپور، مظفر گڑھ اور شمالی پنجاب پہنچے۔ کچھ نے جنوبی ہندوستان کا رخ کیا۔ قلات کے علاقے کو میر مندو کے سپرد کیا جو زیادہ دیر تک قبضے میں نہ رہ سکا۔ میر چاکر کے جانے کے بعد رندوں یا یوں کہیے کہ بلوچوں کا زور ٹوٹ گیا۔ اب کوئی ایسی شخصیت نہ تھی جو انھیں یکجا کر سکتی۔ سب بکھر گئے۔ جہاں جس کو جگہ ملی آباد ہو گئے یا پھر کچھ نے خانہ بدوشی اختیار کرلی۔ جو پیچھے رہ گئے انھوں نے اپنی اپنی تمن داری سنبھالی۔

تھوڑے عرصے بعد جو بلوچوں کے فرقے بلوچستان میں رہ گئے تھے انھوں نے خان آف قلات کی تابعداری قبول کرلی۔ لوگ تو پلہ بھاری دیکھتے ہیں تو اکثر نے یہی کیا۔ بعض نے اپنا بلوچی نام چھوڑ کر براہویوں کے ساتھ مماثلت اختیار کی۔ بنگل زئی جو اب براہوی کہلاتے ہیں دراصل بلوچ فرقے رندسے ہیں۔ کہنے کو تو براہوی

بھی ایک قسم کے بلوچ ہیں مگر براہوی اور بلوچ حالانکہ صدیوں سے ایک ساتھ رہ رہے ہیں مگر دونوں کے رواج اور راہ و رسم میں بڑا فرق ہے۔ دونوں کی زبانیں علیحدہ ہیں یہاں سردار صاحبان کی بات نہیں ہو رہی بلکہ ایک عام آدمی کی۔ سرداروں کے خاندان تو بہت "ایڈوانس" ہیں۔ آپس میں رشتہ داریاں ہیں۔ رہن سہن بھی تقریباً "فارن" ہے۔ جہاں تک عام آدمی کا تعلق ہے۔ براہوی دوسرے قبیلوں میں رشتہ دینے میں کوئی عار نہیں کرتے حالانکہ اور بلوچ اس کو برا مانتے ہیں۔ براہوی جن کے پاس جانور ہوں ان کا دودھ بیچنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ بلوچ اس کو معیوب سمجھتے ہیں۔ بلوچوں اور براہویوں کی پوشاک میں بھی فرق ہے۔ خاص طور سے مری بگٹی، مزاری وغیرہ، یہ لوگ حلبی جبہ نما کرتہ پہنتے ہیں۔ براہوی صرف ایک دراز چولا یا پیراہن زیب تن کرتے ہیں۔ کرتہ نہیں پہنتے۔ بلوچ عورتیں گھگھر جو گاؤن کے نمونے کا فراک ہوتا ہے پہنتی ہیں۔ یہ رواج حلب سے چلا آرہا ہے ظاہر ہے کہ بلوچ اور براہوی ہمیشہ سے جدا فرقے تھے۔

ہاں تو جناب! بات کیجئے قومیتوں کی۔ کہاں تک چلے گا۔ آپ پاکستان کی سطح پر قومیت کی بات کرتے ہیں یہاں تو اس لحاظ سے اس علاقے میں کتنی قومیتیں ہوگئیں۔ ابھی تو کھتران اور پٹھانوں کا ذکر ہی نہیں آیا۔ اس بحث کو جانے دیں تو بہتر ہے۔ دراصل ان نعروں کے درپردہ "میں" ہوتا ہے۔ یعنی آپ نے سلسلہ شروع کیا پاکستان سے پھر آگئے قومیت پر پھر آجائیں قبیلے پر پھر فرقے پر اور پھر آخر میں بات "میں" پر پہنچتی ہے دراصل آخر میں تو "میں" نہیں ہوتا۔ یہ تو ہوتا ہے شروع میں۔ یا یوں کہہ لیجئے اولین چیز "میں" ہوتا ہے۔ لوگوں کو دکھانے کے لئے اس کا ذکر نہیں کیا جاتا مگر جاننے والے جانتے ہیں یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ ہم نے تاریخ آپ کے سامنے بیان کردی۔ اب ذرا اس پر سوچیے، کس کا نقصان ہوا اور ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے فلسفیوں نے تو یہاں تک کہا کہ مذہب کی بنیاد بھی "میں" کو کم کرنے پر ہوتی ہے۔ مگر کیا کیا جائے حضرت انسان کی فطری عادتوں کا آجکل تو قومیں یکجا ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ دیکھ لیجئے یورپ کو اور آپ قومیت کی بات کر رہے ہیں۔ کہاں تک تاریخ کو پیچھے گھسیٹئے گا۔ اسلام کی اگر بات کرتے ہیں تو ؎

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

بھائی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بات تو صرف حالات کی ہے۔ کسی نے نعرہ لگایا قومیت کا تو دنیا اٹھ لے کر پیچھے پڑ گئی اس میں تو کسی کو عار نہیں ہو سکتا کہ جناب کافی لوگ اس نعرے کے پیچھے ہیں۔ اب زبانی جمع خرچ شروع ہے ایک دوسرے پر لعن طعن۔ یہ باتیں بحث سے تو دور نہیں کی جا سکتیں۔ ٹھنڈے دل سے سوچئے اس کا تدارک کیجئے۔ بات "ماضی" اور "حال" پر آکر رک جاتی ہے۔ ابھی تک یہاں زرعی ترقی، صنعتی کارخانے معاشی انصاف کا لوگوں نے نام بھی نہ سنا تھا۔ اب سن رہے ہیں۔ اب تک سنتے ہی کیسے۔ تعلیم ندارد۔ قبیلوں کی ایک الگ دنیا بسی ہے۔ دوسروں سے سروکار نہیں پھر کہاں سے قومی سطح پر ہم آہنگی ہوتی۔ انگریز ایسے علاقوں کے لئے ایک نقطہ چھوڑ گیا تھا یعنی پیسی فیکیشن (PACIFICATION)۔ جس کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا جائے تو مزہ نہیں آئے گا۔ عام اردو میں "ٹھنڈا کرنا" کافی مؤثر ہوگا۔ مطلب یہ کہ جب گرمی پیدا ہو تو پانی ڈال دیجئے۔ آنچ ہلکی ہو جائے گی۔ اسی لئے ایسے علاقوں میں اس نے ایسی ہی انتظامیہ قائم کی تھی یعنی جب بھی گڑبڑ شروع ہوئی، جوڑ توڑ شروع ہوگیا۔ سردار صاحبان میں پیسہ بانٹا اور آپس میں لڑوا دیا اور معاملہ کچھ عرصے کے لئے ٹھنڈا۔ اب جب آزاد مملکت بن گئی تو "ٹھنڈا" کرنے سے کام نہیں بنتا۔ اب ضرورت ہے ترقی یا ڈویلپمنٹ (DEVELOPMENT) کی۔ ماضی کو حال میں لانا۔ آزاد مملکت میں جہاں قوم کی بات کی جاتی ہے تو قوم کی فلاح کی بھی بات کیجئے۔ "ٹھنڈا" کرنے کی بات نہ کریں۔ ٹھنڈا کرتے کرتے آگ بھڑک اٹھتی ہے جو بجھائے نہیں بجھتی۔ بہر حال کام کچھ تو شروع ہو چکا ہے۔ اس میں جا بجا رکاوٹیں بھی در پیش آرہی ہیں۔ آخر نظام تبدیل کرتے ہوئے دیر تو لگے گی۔

JALALI BOOKS

*

عورتیں اور بچے ڈاکٹر سے ملنے جا رہے ہیں

مری ۔ انگریز کے دور میں
KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

" خلق "
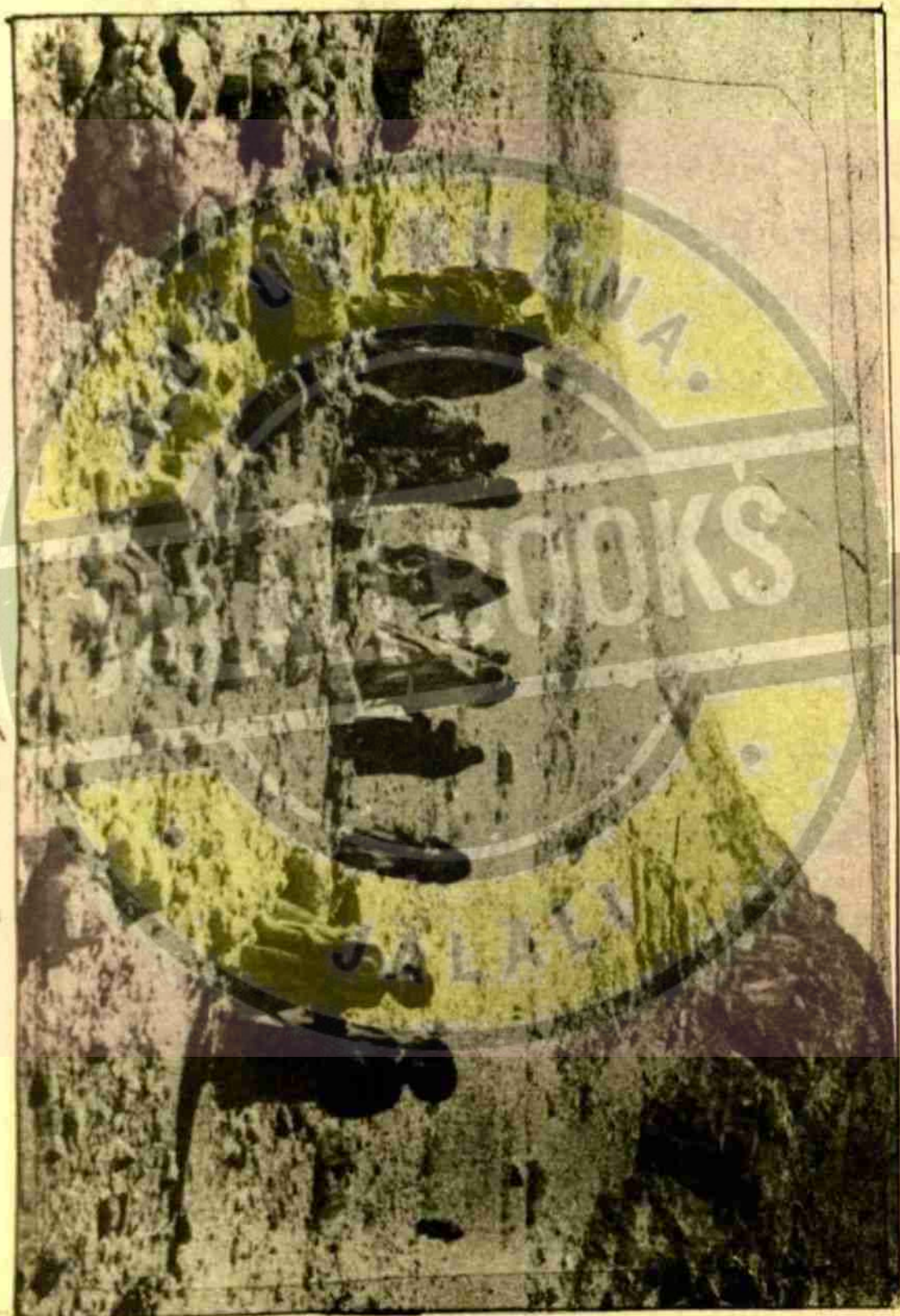
مری۔ انگریز کے دور میں

مری کی وجہ تسمیہ:

بلوچیوں کے بارے میں عام بحث کافی ہو گئی۔ اب ہم مری قبیلہ کے بارے میں وضاحت کرنا چاہتے ہیں جس کا اس کتاب سے براہِ راست تعلق ہے۔ میر جاکر تو سارے بلوچیوں کے ہیرو ہیں۔ جب وہ ہمایوں کے ساتھ جانے لگے تو انھوں نے اپنے قبیلے کو ایک فرقے کے تمندار، جن کا نام بجار خان تھا، ساتھ جانے کو کہا یہ فرقہ اس وقت تمندار کے نام پر "بجارانی" کہلاتا تھا۔ میر جاکر کے بے حد اصرار پر بھی وہ ساتھ چلنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ غصے میں آکر انھوں نے کہا "بجار خان مری ہے" مری کے معنی "ضدی" یا "جن" کے ہیں۔ اسی دن سے قبیلے کا نام "مری" پڑ گیا۔ ایک روایت اور بھی ہے۔ پہلے یہ لوگ کچھ "مورائی" میں آباد تھے۔ اس لئے پہلے انہیں "مورائی" کہا جاتا تھا۔ پھر کثرتِ استعمال سے "مری" ہو گیا۔

میر جاکر کے جانے کے بعد بجار خان کے ساتھ معتبرین میں سے، منڈو خان، علی خان، رند اور ان کے علاوہ ایک "لوہار" ایک "باغبان" جن کو کانگرا کہا جاتا تھا اور ایک حبشی جنہیں شاہجہ کہتے تھے موجود تھے، ان سب کی اولاد اور ساتھیوں کو ملا کر مری قبیلے کی داغ بیل پڑی۔

یہ لوگ اس وقت مہوند اور تندری بجارروڈ، مندو تحصیل اور کچھ مورائی کے علاقے میں آباد تھے۔ اِن کے قریب کلمتی اور کیچانی قبیلے بھی آباد تھے۔ لیکن اب ان کا نام و نشان بھی مشکل سے ہی ملتا ہے البتہ کہیں کہیں پر اِن کی یادگاریں باقی ہیں مگر اب وہ بھی معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔

بلوچستان میں قبیلوں کی آبادی کے لحاظ سے مری قبیلے کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہ لڑائی اور بہادری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور ہو بھی کیوں نہ۔ جس کسی کی اپنوں میں نہ بنی یا لڑائی ہو گئی، آ گیا ان کے پاس امان لینے۔ کئی دفعہ امان لینے والے ایک دو نہیں بلکہ سَو دو سَو سے بھی زیادہ اور پھر ان کے ساتھ ایسے مدغم ہوتے کہ "مری" بن جاتے۔

مری قبیلے کے تین بڑے جزوی قبیلے ہیں۔ جنہیں ان کی اصلاح میں تکر کہا جاتا ہے۔ یعنی "بجارانی" جو کہ بجار خان کی اولاد یا ان کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ "لوھارانی" جن کا سلسلہ "لوہار" سے چلا اور "گزینی" جو کہ "غازو" یا "غذن" کی اولاد سے ہیں "غازو" یا "غذن" ایک "بلیدی" لڑکا تھا۔ جسے علی خان نے پالا تھا جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ہر ایک "تکر" پھر "فرقے" میں منقسم ہے پھر ان کے جزوی فرقے ہوتے جاتے ہیں۔ وضاحت کے لئے دیئے گئے نقشے کو ملاحظہ کیجئے۔ یہ نقشہ گزیٹیر سے لیا گیا ہے۔

جیسے جیسے مریوں کا زور بڑھتا گیا اور قبائل بھی ان کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ جب بھی کوئی نووارد قبیلے میں داخل ہوتا تو وہ نیکی بدی میں ساتھ رہنے کی قسم کھاتا۔ وفاداری تو اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی، خاص طور سے قبائلی رسم و رواج کے تحت جب تک کہ خون کا رشتہ قائم نہ ہو۔ نوواردوں کو اپنی لڑکی یا لڑکا رشتے میں دینا ہوتا اور اس طرح پکا رشتہ قبیلے کے ساتھ قائم ہو جاتا۔ جب آبادی بڑھتی ہے تو پھیلنے کے لئے زمین بھی ضروری ہے۔ لہٰذا انہوں نے پڑوسیوں کو مجبور کیا کہ اپنی زمین دو۔ اگر نہیں دیتے تو پھر فیصلہ میدانِ جنگ میں ہو گا۔ کچھ تو ڈر گئے اور کچھ کو زور سے پیچھے ہٹا دیا۔ حسنی، بروزئی اور دیگر قبائل اپنی زمینوں سے دستبردار ہو گئے۔ اب علاقہ تو مل گیا مگر ڈر یہ تھا کہ کہیں آپس میں لڑائیاں شروع نہ ہو جائیں۔ اس لئے آپس میں مل بیٹھ کر زمینوں کو بانٹا گیا۔ یہ بانٹ اس طرح ہوئی کہ پہلے تکروں اور پھر فرقوں کی حد بندی ہوئی۔ یہ ہی سلسلہ ابھی تک چلا آ رہا ہے۔ دس پندرہ سال گزرنے کے بعد از سرِ نو

حدود متعین کی جاتی ہیں۔ پہلے زمانے میں تو یہ ہوتا تھا کہ جنگ ہوئی، نیا علاقہ فتح کیا تو جناب اس میں سے پانچواں حصہ تو سردار کا باقی حصوں کو "ٹکروں" میں تقسیم کر دیا۔ ٹکروں کے "تمنداروں" نے اسی حساب سے اپنا حصہ رکھا اور باقی فرقوں کے سپرد۔ اب آئی باری فرقوں کی تو وڈیرے نے اپنا حصہ رکھا اور باقی قومی ملکیت۔ چونکہ تمنداری اور باقی عہدے وڈیروں کے اس لئے ان لوگوں کی اپنی ملکیت ہوئی۔ عام آدمی بچارہ قومی ملکیت میں پھنسا۔ قومی ملکیت کا تو حال آپ کو معلوم ہی ہے مال چرائی کرو اگر کسی کو کاشتکاری کے لئے دیا بھی تو حصہ کیا آئے گا۔ حصے کی بھی عجیب حالت ہے۔ جناب حصے کے وقت بھی حسب ونسب کا خیال رکھا جاتا ہے۔

شروع شروع میں حد بندی سے بہت فائدہ ہوا اور یہی سلسلہ ابھی تک چلا آ رہا ہے۔ لوگ اپنی اپنی حدود میں اپنے علاقے کے ذمہ دار ہو گئے اور پھر جب کبھی جنگ کرنی ہوئی یا علاقے کا دفاع کرنا ہوا، منفرد علاقے کے لوگ اپنا اپنا لشکر لے کر اکٹھے ہو گئے۔ ہر ایک قبیلے کا اپنا کمانڈر بھی ہوتا اور اعلیٰ کمان سردار سنبھالتا اور پھر جنگی کونسل تشکیل ہیں آتی لڑائی کی چالوں پر غور ہوتا۔ اب آئے جسے میدان میں آنا ہے یہی ہر دفعہ ہوتا آیا ہے۔ اس دفعہ بھی تقریباً یہی ہوا۔ حال کو اب جانے دیں۔ ماضی کی تھوڑی بات اور ہو جائے "زن" "زر" "زمین" ہمیشہ لڑائی کی جڑ رہے ہیں۔ زمین آئی۔ زن تو پہلے ہی موجود تھی، زر بھی تھوڑا بہت اکٹھا ہوا۔ آپس میں لڑائیاں ہو گئیں۔ بجار خان جنہوں نے بجارانی قبیلے کی داغ بیل ڈالی تھی انہوں نے سارے مرلوں کو اکٹھا کیا اور سردار بن گئے یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ رہا۔ پھر سرداری گزینیوں کے پاس آ گئی جو ابھی تک ہے، ویسے بیچ میں ایک دفعہ سرداری کسی اور کے پاس بھی رہی۔

جب کبھی بھی باہر سے لڑنے والا نہ ملا تو آپس کے جھگڑے شروع ہو جاتے۔ لیکن جب بھی سردار تگڑا ہوا تو امن وامان قائم رہا جب سرداری گزینیوں کے ہاتھ آئی تو پہلا سردار ساحتک تھا۔ سرداری کو مستحکم کرنے اور امن وامان برقرار رکھنے کے لئے نئے رواج اور قانون بنائے گئے۔ اگر کوئی بھی ان کی خلاف ورزی کرتا تو گردن مار دی جاتی۔ کیا بات ہے گردن مارنے کی۔ اس طرح تو مشکل جلدی آسان ہو جاتی ہے مزا تو تب ہے کہ گھٹ گھٹ کر جان نکلے تاکہ اوروں کو نصیحت ہو۔

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALY

ہاں تو نئے رواج بنے۔ گھال کو رائج کیا گیا یعنی ہر بیس بھیڑوں پر سال میں ایک بھیڑ سردار کی۔ یہ رواج حال ہی میں ختم ہوا ہے۔ جب کبھی بھی سردار کے کارندے یا ہرکارے کسی علاقے میں جاتے تو انہیں بھی نذرانہ دینا ضروری قرار پایا۔ اس کے علاوہ سرداری خاندان میں اگر کوئی تقریب ہو جیسے کہ لڑکے کی شادی یا ختنہ تو بھی ہر ایک وڈیرے کو حیثیت کے مطابق نذرانہ پیش کرنا واجب تھا۔ وڈیرہ کب اپنے پاس سے دیتا ہے۔ بار نیچے والوں پر۔ مقدمات کے فیصلے ہوتے جرمانہ بھرا جاتا۔ اس کا آدھا حصہ سردار کا۔ سردار کو شادی کرنی ہوتی تب بھی خاص قسم کا ٹیکس رعایا پر لگتا۔ اس کے علاوہ کچھ پیسہ سردار کو سرکار برطانیہ دیتی تھی۔ وہ اب تک حکومت پاکستان کے ذمے تھا۔ امن وامان قائم رکھنے کے لئے "لیوی" یعنی ایک قسم کی سردار کی اپنی فوج ہوتی تھی۔ پہلے اس کا خرچہ سرکار برطانیہ دیتی تھی۔ اس کے بعد حکومت پاکستان ابھی تک گز بڑ سے پہلے برداشت کرتی تھی۔ اس کا ذکر وضاحت سے کہیں اور کیا جائے گا۔ کچھ اچھے رواج بھی تھے۔ رواج کی پابندی ہر ایک شخص کرتا اگر کسی نے ان کو پامال کرنے کی کوشش کی تو قہرِ سردار نازل ہوتا کہ الامان الحفیظ۔ اگر کوئی مسافر یا بیوپاری علاقے میں آتا تو وڈیرہ یا سردار اسے ایک انگوٹھی دیتا جو کہ پاسپورٹ کا کام کرتی اور محفوظ و مامون سفر کرتا تھا۔ اس کام کے لئے سردار اپنی فیس بھی لیتا۔ یہ رواج ذرا سی ترمیم کے ساتھ اب تک چلا آ رہا ہے وہ یہ کہ پیسے سردار کی بجائے وڈیرے لیتے ہیں۔ ہمارے ہندو بیوپاری یہ ٹیکس دیتے رہے ہیں۔ اگر کسی باہر والے سے لڑائی ہوتی یا کوئی آپس کا معاملہ ہوتا تو جرگہ اکٹھا ہوتا۔ سردار جو فیصلہ دیتا تو یہ حکم پورا قبیلہ ایک ہو کر مانتا۔ کسی کی کیا مجال کہ پیچھے ہٹے۔ یہ رواج صدیوں سے چلا تو مری سردار کی حیثیت اور قبائلی سرداروں سے کہیں بڑھ چڑھ کر رہی۔ سردار کو عام آدمی نہیں گنا جاتا۔ مطلب یہ کہ اس کی حیثیت انسان سے بڑھ کر تھی جس میں بزرگی سے بھی بڑھ کر اگر کوئی درجہ ہے تو وہ دیا گیا ہے۔

۱۷۵۰ء سے ۱۷۹۴ء تک جب نصیر خان قلات کے خان تھے، مری بگٹی علاقہ قلات کی عملداری میں رہا۔ ان کے رویہ سے لوگ کافی متاثر تھے کیونکہ یہ ان لوگوں کی جائز مدد بھی کرتے تھے۔ ویسے عملداری نام کو ہی تھی کیونکہ جزیہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ سال میں ایک دفعہ مری بگٹی کے سردار یا ان کے نمائندے ان کے دربار میں حاضر ہوتے۔ نصیر خان کے انتقال کے بعد یہ گرفت بھی ڈھیلی ہو گئی بس بھر گیا تھا۔ پڑوسیوں کی

مصیبت ۔ مجال ہے کہ کوئی ان کے راستے سے گزر جائے ۔

گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے کہ انگریز نے ۱۸۳۹ء میں افغانستان پر چڑھائی کی ۔ سبی کے پاس سے جب انگریز فوج گزری تو اسے تنگ کیا گیا ۔ لہٰذا انگریز نے سبی پر قبضہ جما لیا ۔ اس قبضے کے بعد اس نے مری بگٹی علاقے کی طرف بھی رُخ کیا ۔ میجر بلیمور کو حکم ملا کہ ان لوگوں کی خبر لی جائے اور احکامات کے مطابق یعنی "سبق سکھایا" جائے ۔ انگریز کو کیا ہمدردی ۔ زبان بھی "امپریلسٹ" (IMPERIALIST) بولتا تھا ۔ عورتوں بچوں سمیت گھر جلائے ۔ لوگوں کو اکٹھا کیا ۔ توپ کے سامنے باندھا اور اڑا دیا ۔ آگ اور خون کا کھیل کھیلتے ہوئے ۔ "کہان" پہنچے جو مریوں کا صدر مقام تھا ۔ "کہان" کا قلعہ فتح کیا اور کیپٹن لوئس براؤن کو حکم دیا کہ کہان میں رہے تاکہ سرکارِ برطانیہ کا قبضہ پختہ ہو جائے ۔ کپتان صاحب کے ہمراہ تین سو جوان بمبئی انفنٹری کے ، پچاس گھڑ سوار سندھ ہارس (SCINDE HORSE) کے اور پچاس پٹھان گھڑ سوار تھے ۔ تھوڑے دنوں کے بعد اپنے ایک لیفٹننٹ کو مع تین سو سپیل فوج اور پچاس گھڑ سواروں کے واپس "پھلیجی" رسد کے لئے بھیجا ۔ جب یہ دستہ "سرتاف تنگی" کے پاس پہنچا تو مری گھات لگائے بیٹھے تھے ۔ گھات اتنی عمدہ تھی کہ لفٹیننٹ مع اپنے آدمیوں کے مارے گئے ۔ صرف بارہ آدمی زندہ بچ سکے ۔ اس جگہ کو ہم نے خود بھی دیکھا ہے ۔ مری قبائل کی فوجی صلاحیت کی تعریف کرنی پڑتی ہے ۔ اب کیپٹن براؤن صاحب مع ایک سو چالیس آدمیوں کے "کہان" میں پھنس گئے ۔ انگریز نے اپنے آدمیوں کو تو یہاں سے نکالنا تھا ۔ فوراً ایک دستہ میجر کلیبورن کی قیادت میں مع بمبئی گرنیڈیرز کے ۴۶۴ سپاہی اور ۶۶۳ گھڑ سوار وں کے جو پونا ہارس اور سندھ ہارس پر مشتمل تھے روانہ کیا ۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ چار توپیں بھی تھیں ۔ یہ مہینہ اگست کا تھا ۔ گرمی ماہ اگست میں اپنے عروج پر ہوتی ہے ۔ مری قبائل کی فوجی ہنرمندی اور عقلمندی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے ۔ انھیں پتہ تھا کہ انگریز اپنے آدمیوں کو چھڑانے کے لئے ضرور آئے گا ۔ اس مرتبہ انھوں نے نفوسک پاس پر گھات لگائی ۔ جب فرنگی فوج ادھر سے گزری تو اس پر دھاوا بول دیا ۔ یہاں پر پانی کی کمی اور علاقہ پہاڑی کھل کر لڑائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ سارا دن لڑائی جاری رہی ۔ پیاسی فوج کہاں تک لڑتی ۔ پہاڑوں کی وجہ سے نہ تو توپ خانہ ٹھیک طریقے سے استعمال ہو سکتا تھا ۔ نہ ہی گھوڑے ۔ لہٰذا انگریز نے واپسی کی ٹھانی ۔ اس لڑائی میں چار انگریز افسر دو کالے اور ۱۷۰ سپاہی کام آئے اور ۹۲ زخمی ہوئے ۔ توپیں اور باقی ساز و سامان میدانِ جنگ

کی نذر کیا اور جانیں بچائیں ۔ یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ مری بگٹی علاقے میں دو بدو لڑائی مہنگی پڑے گی ۔ فرنگی نے پینترا بدلا اور روپیہ پیسہ دے کر جان چھڑائی ۔ اس وقت مریوں کا سردار دودا خان تھا اس نے کیپٹن براؤن اور ان کی فوج کو واپس جانے کی اجازت دی اور وعدہ خوب نبھایا ۔ اب جناب دیکھیے انگریز کی دور اندیشی اس کی سیاست اور چالبازی جس کی وجہ سے اس نے صدیوں ہم پر حکومت کی ۔ پھر اپنی بے وقوفی یہ کہ ہم آپس کے قومیتوں اور قوموں کے جھگڑے، نااتفاقی جہالت اور زبان اور لباس کے چکر میں پڑے ۔

"تذکرہ انگریز کی چالبازیوں کا ہو رہا تھا ' انگریز نے سب پہلے سبی کے آس پاس کے قبائل کو ملایا ' کچھ ڈرا کر کچھ دھمکا کر ۔ بہلایا بھی اور پھسلایا بھی لالچ بھی دیا ۔ ان پر زور ڈالنا کوئی مشکل کام نہ تھا میدانی علاقے میں لوگ اکٹھے ہو کر رہتے تھے ۔ زمینیں نہیں ۔ مری علاقے کی طرح تو نہ تھا کہ نہ گھر نہ بار ۔ حملہ کیا اور غائب ۔ پہاڑی علاقے میں پیچھا کرنا مشکل ۔ مری قبائل میں بھی پیسے بانٹے کہ ہمیں دم لینے دو ۔ پھر جناب ۱۸۳۹ء میں مری اور براہویوں کو لڑا دیا ۔ براہویوں کو کہا کہ یہ تمہاری رعایا رہے ہیں اور تم اپنے علاقے میں امن قائم نہیں رکھ سکتے ۔ انھیں سیدھا کرو ہم مدد کے لئے حاضر ہیں ۔ انھیں ہتھیار ۔ روپے پیسے دیئے اور قبائلیوں کو بھی اپنے ساتھ ملایا ۔ مریوں کو پیغام بھیجا کہ خبردار جو درۂ بولان کے قریب پھٹکے " ہم آئیں گے ' جس میں ہمت ہو ہمیں روکے " ضد تو تھی نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ " بی بی نانی " جو کہ درۂ بولان کے سرے پر ہے ' مری حملہ کر بیٹھے ۔ حملہ آور ۱۳۰۰ تھے جن میں میں سے ۷۵۰ کام آئے ۔ یہی غلطی تھوڑے دنوں بعد پھر مریوں نے ہڑپی پر حملہ کر کے کی ۔ مری قبائل کا زور کچھ کم ہوا اب یہاں کے قبائل انگریز کو تو بھول ہی گئے انھوں نے آپس کے جھگڑے شروع کر دیئے علاقہ بھی ٹھنڈا "یعنی پیسیفائی (PACIFY) ہوتا رہا ۔ رسل و رسائل کے راستے کھلے ہیں ' آپس میں خونریزی جاری ہے ۔ انگریز تو ہر ایک قبیلے کا دوست تھا ۔ پیسہ تو ہر ایک کو مل ہی رہا تھا ۔ مری علاقے کی حد جو درۂ بولان کے نزدیک تھی اس کا تو علاج ہو گیا ۔
اب رہ گیا وہ علاقہ جو پنجاب سے ملتا تھا تو بگٹی قبیلے کو اکسایا گیا ۔ بگٹیوں نے موقع غنیمت جانا اور اچھی خاصی لوٹ مار کر کے اپنے علاقے میں واپس ہو گئے ۔ اس طرح مری قبائل کا زور کافی حد تک کم ہو گیا ۔

سرکار برطانیہ کو جب یہ یقین ہو گیا کہ قبائل آپس میں بٹ چکے ہیں اور ان میں پھوٹ پڑ چکی ہے ' نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں ۔ اس دشمنی کا جب یقین اور پورا اسٹیج تیار ہو گیا تو انگریز امن کے

دیوتا کا کردار ادا کرنے نکلا۔ وہی نو آبادیاتی پالیسی، یعنی آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو (DIVIDE & RULE) اختیار کی۔ ۱۸۵۹ء میں خان آف قلات کو احکام پہنچے کہ چونکہ یہ آپکا علاقہ ہے، ہر قیمت پر یہاں امن و امان قائم ہونا ضروری ہے، اس لیے آپ کی اس کارروائی میں ہر قسم کی مدد کی جائے گی۔

خان صاحب نے اپنا لشکر تیار کیا۔ ادھر سے انگریز نے اپنی فوج بھی شامل کی۔ سرہنری گرین اور جنرل جیکب، جن کے نام پر آج تک جیکب آباد بسا ہوا ہے اور بسا رہے گا، اور جنرل ممدوح لشکر کے ساتھ پابہ رکاب ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس لشکر میں چار ہزار پیدل فوج اور چار ہزار گھڑسوار موجود تھے۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ بہت بڑی فوج تھی۔ کیونکہ یہاں کی آبادی بھی تقریباً اتنی ہی ہوگی۔ حملے کا ارادہ کہان اور ڈیرہ بگٹی پر تھا۔ یہ مری اور بگٹی قبائل کے صدر مقام تھے۔ اگر سردار قابو میں آجائیں تو آدھا کام ویسے ہی ختم ہو جائے گا۔ انگریز نے خود تو حملے کی نہیں ٹھانی۔ توبہ توبہ، یہ بات تو خود وہاں کے لوگوں نے انگریز سے کہی تھی کہ خدا کے واسطے امن و امان قائم کرو۔ حملہ آور کامیاب ہوا۔ شرپسندوں کو عبرتناک سزائیں دی گئیں اور صاف صاف بتا دیا کہ اگر پھر کسی نے شرپسندی کی تو عبرتناک سزا دی جائے گی۔

جب حالات ٹھیک ہوئے تو انگریز نے سوچا کہ اس غیر نفع بخش علاقے پر خرچہ بیکار ہے مگر علاقے کو بھی قابو میں رکھنا ہے۔ سرداروں کو جاگیروں سے نوازا، پیسے دیئے اور کہا کہ تم لوگ اپنی فوج رکھو اور اپنی روایات کے طور پر حکمرانی کرو، مگر امن رہنا چاہیے۔ سرکار برطانیہ کو کوئی تکلیف نہ ہو ورنہ پھر وہی حشر ہوگا۔ اگر یہ شرائط منظور ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ ہم کوئی اور سردار مقرر کر دیں گے اور بعض اوقات کر کے بھی دکھایا۔ اب یہ علاقہ تو قابو میں آگیا قلات تو ویسے بھی اثر میں آچکا تھا، مگر اثر کافی نہ تھا۔ اب تو طاقت کے کس بل سے اس اثر کو مستحکم کیا گیا۔

۱۸۷۵ء میں میجر سنڈے مان صاحب نے مری بگٹی سرداروں کو طلب کیا اور ان سے کہا اگر آپ لوگ ہمارے ساتھ ہیں تو پھر قلات جانے کے لئے تیاری کریں۔ کون منع کر سکتا تھا۔ ایسا ہی ہوا اور قلات پر انگریز کی پکی حکومت قائم ہوئی، مری اور بگٹی علاقے کی طرز پر۔ ۱۸۷۶ء میں جب پورا علاقہ قبضے میں آگیا تو بندوبست مکمل کرنے کے لیے کوئٹہ میں بلوچستان ایجنسی قائم کی گئی۔

انگریز جب تک یہاں رہا چھوٹے موٹے قصے ہوتے رہے، مگر جب بھی گڑبڑ ہوئی تو سزا کچی امپریلسٹ کے

طور پر آپ کو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ انگریز تھا ہی امپیریلسٹ بغیر ایسے کام کیسے چلتا۔ مگر وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ آپ اپنوں کے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں۔ کیجیے وہی حشر ہوگا جو کہ تاریخ بار بار دہراتی رہی ہے۔

بہرحال جب تک انگریز رہا یہ چھوٹے موٹے قصے چلتے رہے مگر ان کا تدارک زور سے کیا۔ انگریز چلا گیا مگر کالے انگریز چھوڑ گیا کہ کرو اس پر عمل جو ہم نے تم کو سکھایا ہے مت بات کرو "نیشنلزم" یا "اسلام" کی۔ تم لوگ حکمراں ہو، حکمران، حکمران ہونا ہے سیاہ و سفید کا مالک۔ ڈنڈا چلاؤ، سب ٹھیک رہے گا کہیں ڈیفیسٹ ایریا میں بھی ترقی ہوئی ہے۔ "ٹھنڈا" کر دو اور روپیہ بانٹو اور آپس میں لڑاؤ۔ یاد رکھو ایسے حالات میں صرف ایک پالیسی ہوتی ہے "آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو" اسے قائم رکھو۔ ویسے ہمارا سارا نظام قائم رکھنا تو بہتر ہے اگر اس پر عمل نہ کیا تو زیادہ دیر ٹِکنے نہ پاؤ گے! ٹھنڈے دل سے اس کا جائزہ لیجیے کہ کہاں تک ہم نے انگریز کی اس پالیسی پر عمل کیا۔ کیا کھویا کیا پایا۔
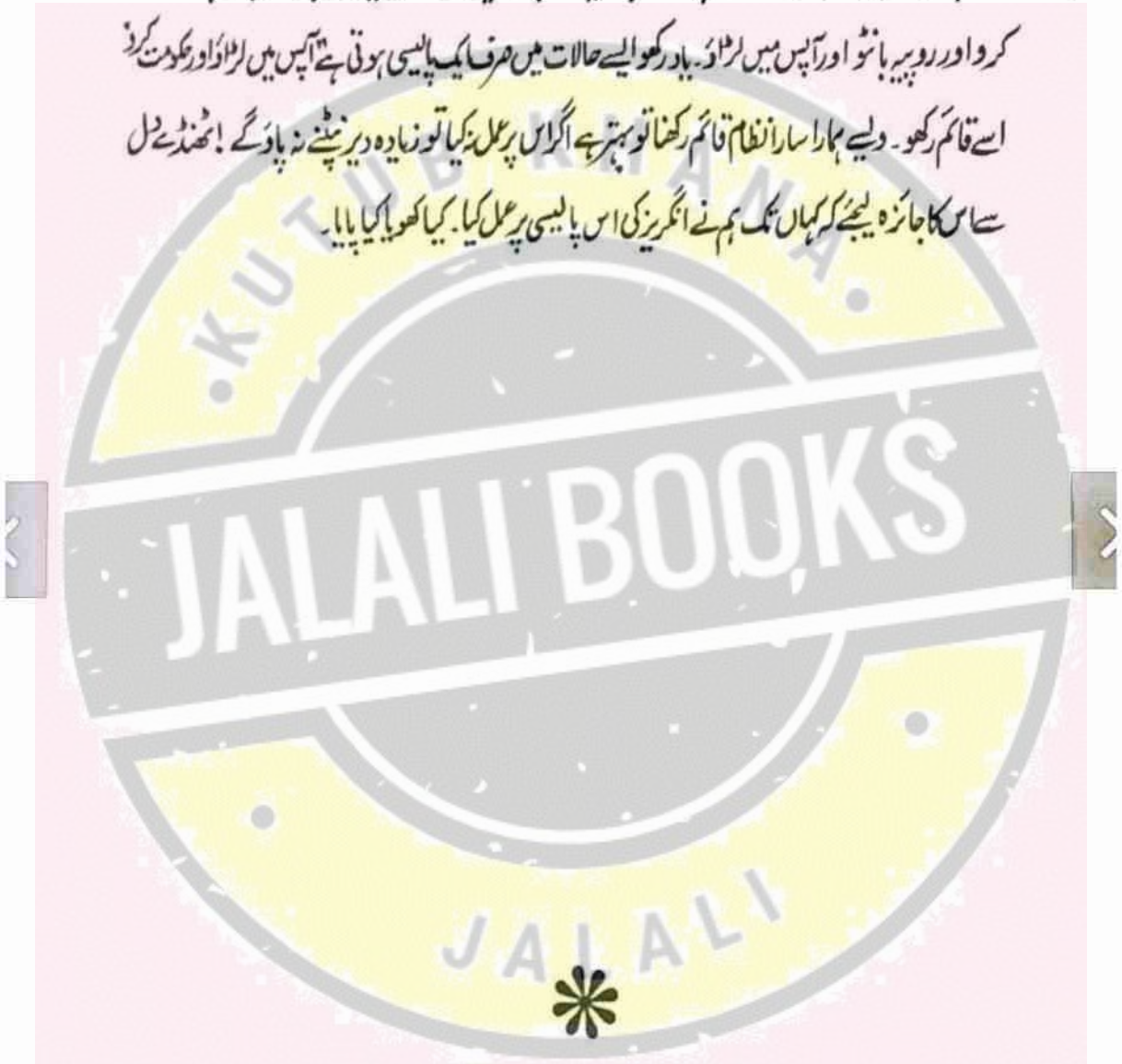
مری قبائل

لوہارانی	گزینی	بجارانی
شیرانی	بہاولان زئی	کلندرانی
جلمبانی	نوزبندگانی	راحمکانی
خانزانی	مرغیانی	پیردادانی
گوسرانی	عالیانی	سومرانی
سومرانی	اصفانی	سالارانی
محمدانی	جروار	کنگرانی
	لوہڑی کش	پواہدی
	چوری	شاہجہ
	بڈیانی	کھلوانی
	لانگھانی	قیصرانی
	مہکانی	
	چیلگری	
	ٹھیگنانی	
	مہندانی	
	ژنگ	
	مزارانی	

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

زیر تعمیر سڑک

مری ۔ آزادی کے بعد
KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

سڑک کی تعمیر کا کام جاری ہے

مری۔ آزادی کے بعد

KUTUB KHANA JALALI BOOKS
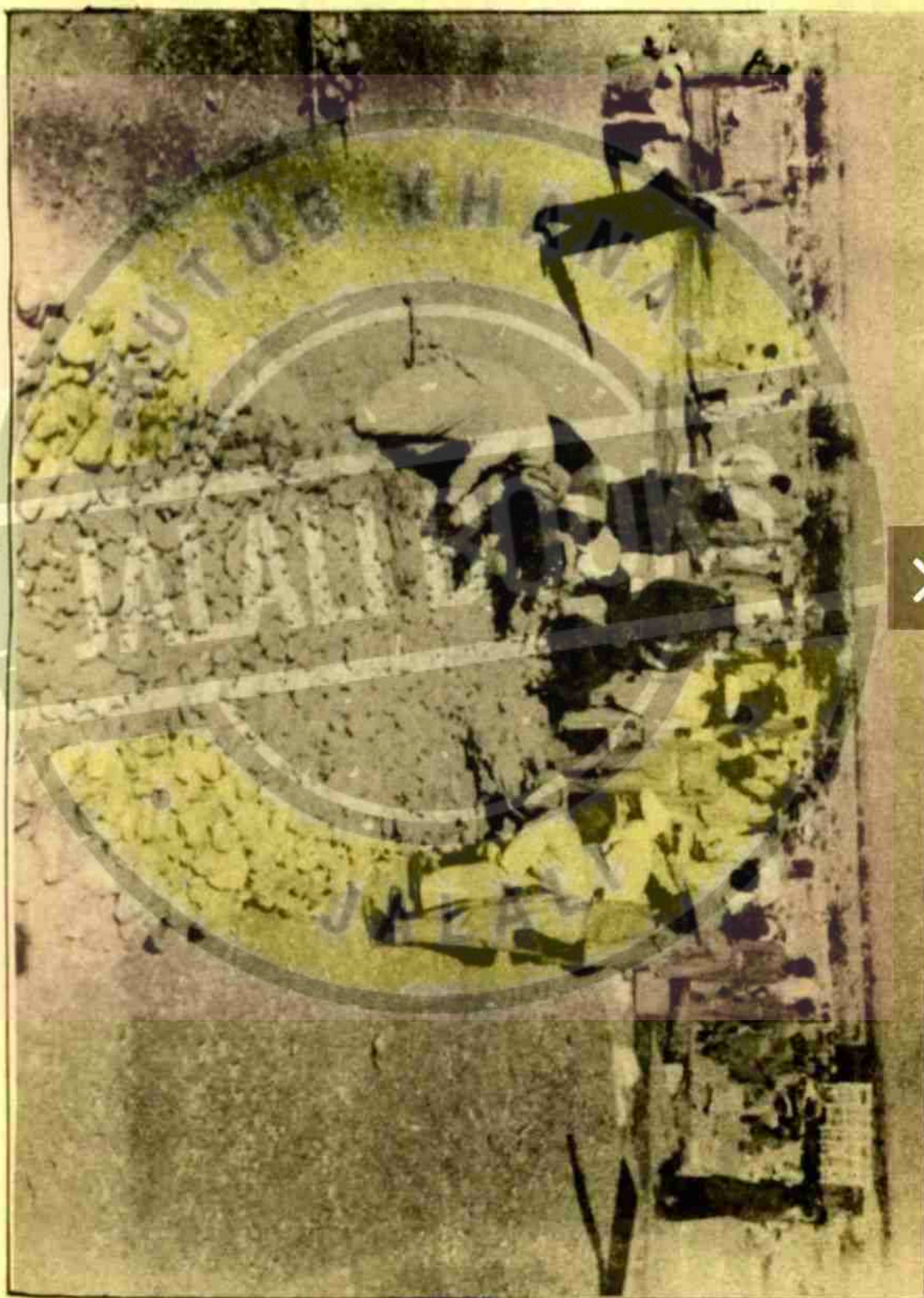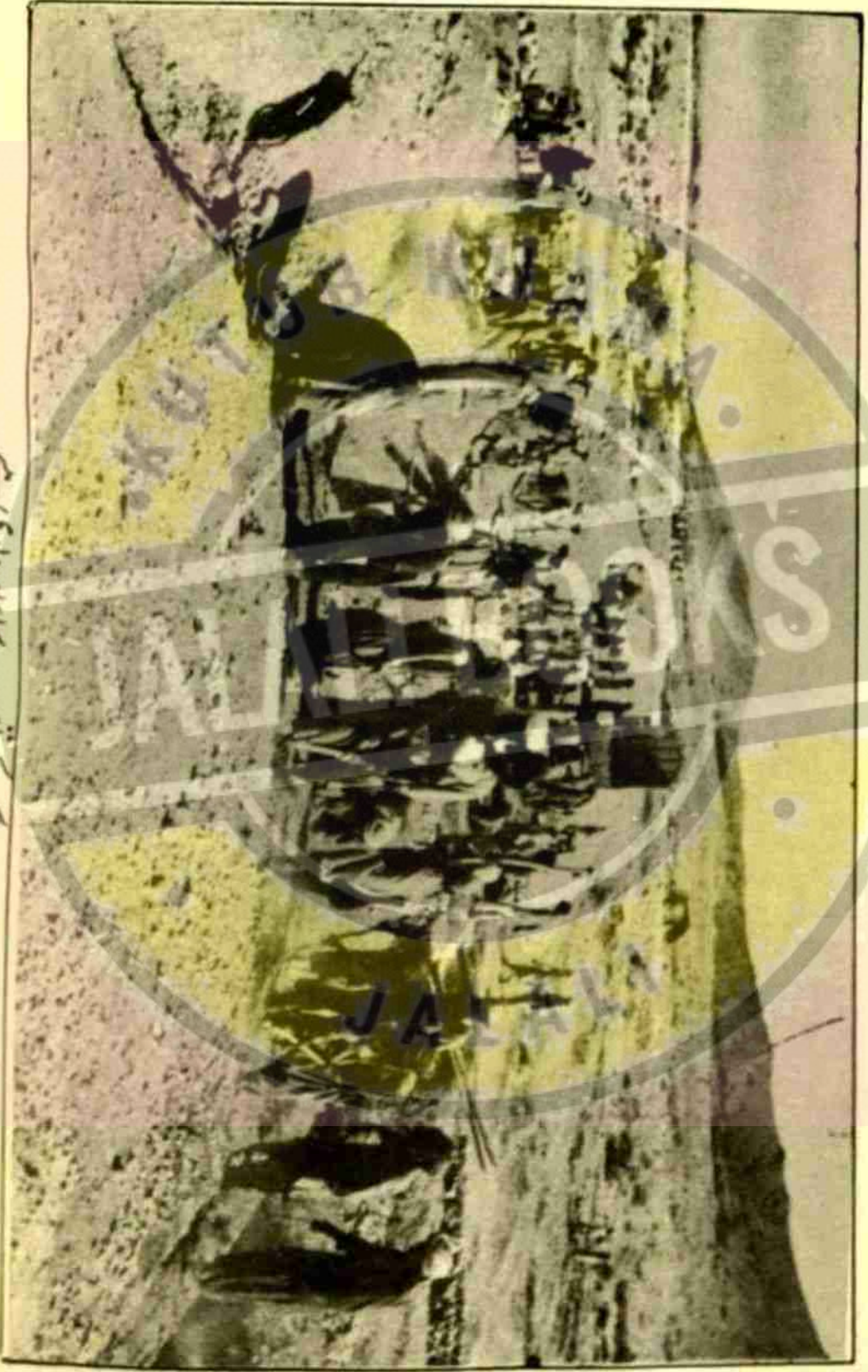
پاکستان بننے کے بعد یہاں انتظامیہ میں کیا فرق آیا وہ اگلے ابواب سے واضح ہو جائے گا۔ آج سے دو سال پہلے تک تو کوئی نمایاں فرق رُونما نہیں ہوا تھا۔ وہی سرداری نظام اور تقریباً وہی حالات بلکہ یوں کہیے کہ انتظامیہ کی گرفت بھی ڈھیلی ہی ہوتی گئی آگے چلیے عام آدمی کی زندگی میں کوئی فرق نہ پڑا۔ جب حالات میں ہی کوئی ردوبدل نہ ہو تو پھر آدمی کو اس سے کیا سروکار کہ انگریز کی حکومت تھی یا پاکستان بن چکا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ پاکستان کے بننے کے بعد کی تاریخ کو چھوڑیے اور یہاں کے ہی مختلف لوگوں سے باتیں کر لیتے ہیں کہ ان کا کیا خیال ہے اور آج کل کے حالات اس حد تک کیوں اور کیسے پہنچے ؟ اس طرح تھوڑا بہت اندازہ تاریخ کا بھی ہو جائے گا اور سب سے بڑی بات ان لوگوں کا حالات کے بارے میں اپنا کیا تجزیہ ہے۔ اس کا بھی پتہ چل جائے گا اور ہم اور آپ کون رائے دینے والے۔ بیشک رائے دیں مگر ان لوگوں کی باتیں سُن کر۔

ایک ہمارے دوست ہیں۔ رہنے والے کوہلو کے ہی ہیں مگر مری نہیں ہیں۔ وہ زرقونوں کے سردار ہیں۔ زرقون، وادئی کوہلو میں کافی آباد ہیں۔ یہ لوگ پشتو بولتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ان کے آباء و اجداد ایران سے آئے تھے اور یہاں بس گئے۔ ان کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ سردار صاحب کافی پڑھے لکھے ہیں کتب بینی

کا بھی بڑا شوق ہے۔ کافی نادر کتابیں ان کے پاس موجود ہیں۔ ایک دن ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم نے ان سے یہی سوال کیا کہ جو حالات آپ دیکھ رہے ہیں آخر یہ اس حد کو کیوں پہنچے۔ سردار صاحب کچھ سوچ کر بولے "ان حالات کی وجہ رشوت ستانی اور علاقے کا غیر موثر کنٹرول ہے"

یہ بات سنتے ہی ہم اچھل پڑے۔ جناب رشوت ستانی کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ آج سے دو سال پہلے تو یہاں صرف ایک تحصیلدار صاحب ہی ہوتے تھے اور ان کے ذمے یہ سارا علاقہ۔ پولٹیکل ایجنٹ صاحب سبی میں اور ان کے تحت اور بھی بڑا وسیع علاقہ تھا۔ سردار صاحب بات کاٹتے ہوئے بولے "رشوت ستانی سے مطلب آپس کی رشوت ستانی ہے"

یہ بات ہو رہی تھی کہ ہمارے ایک مری دوست تشریف لے آئے۔ ان کی ترین میں دکان ہے۔ ترین کوہلو سے کہان کی جانب تقریباً چالیس میل پر واقع ہے۔ یہ بھی کچھ پڑھے لکھے ہیں دکان ابھی تھوڑے دن ہی ہوئے شروع کی ہے۔ اس سے پہلے تو ہندو ہی اس کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ ان کا قبیلہ کنگرانی ہے۔ آئے تھے کہ انھیں ایک ٹرک کی ضرورت تھی تاکہ اپنا سامان لے جائیں مگر ہم نے انھیں اپنے پاس بٹھا لیا۔ انہوں نے بھی سردار صاحب کی بات سے اتفاق کیا۔

دراصل یہاں پر تین درجے کے لوگ شامل ہیں ایک تو بڑے لوگ جنھیں انگریزی میں PRIVILEGED CLASS کہا جاتا ہے۔ ان میں اوپر درجے کے لوگ شامل ہیں۔ جیسے تمندار اور وڈیرے۔ ان لوگوں کی اپنے علاقوں میں حکومت ہوتی ہے۔ اپنی زمینیں بھی ہیں باقی اوروں کی قومی ملکیت۔ آج سے پہلے یہی لوگ اپنے علاقے کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ ان کی جوابداری صرف سرداری کو تھی۔ ان سب کی حکومت موروثی۔ کسی علاقے میں جھگڑا ہو گیا۔ بلالیا لوگوں کو۔ جرگہ اکٹھا کیا۔ جرگہ خود ہی بٹھاتے تھے۔ اب دونوں طرف سے پیسے لیے۔ پیسے لوگوں کے پاس کہاں ہوتے ہیں چلیے دنبے ہی لے لیے اور فیصلہ اپنی مرضی سے کرا یا۔ جرمانہ ادا کیا۔ آدھی رقم سرکار کے خزانے میں اور باقی اپنی۔ زیادہ تر فیصلے خود ہی دیتے تھے۔ اب غریب آدمی اتنا تنگ آ گیا کہ وہ مقدمہ ہی لے جانے سے ڈرنے لگا۔ چھوٹے مقدمے وڈیرے ہی طے کرتے تھے مگر جہاں جیل میں سزا کا سوال ہوتا تو اس کی توثیق کا حق صرف حکومت کے نمائندے ہی کو تھا۔ لوگ ان رواجوں میں اتنے جکڑے ہوئے تھے کہ ملزم کو ایک پروانہ دیا

جاتا تھا کہ تمہیں تین سال کی سزا ہو گئی وہ یہ پروانہ لے کر خود ہی جیل میں حاضر ہو جاتا ۔ نہ کوئی سپاہی ساتھ اور نہ کوئی گارڈ ہم جرگوں کا ذکر آگے وضاحت سے کریں گے ۔

اب جب سزا کی توثیق کا سوال آیا تو حکومت کے نمائندے کے پاس وڈیروں نے چکر لگانے شروع کر دیئے حکومت کے نمائندوں تک رسائی انہی لوگوں کی ہوتی تھی کیونکہ نظم و نسق ہی یہ لوگ چلاتے تھے ۔ جب رسائی انہی لوگوں کی تھی تو یہ لوگ اپنی فیس بھی لیتے تھے زرقون سردار صاحب زور دیتے ہوئے بولے اور ہمارے کنگرانی دوست نے بھی سر ہلا دیا ” اس وقت جانے دیں ۔ اب بھی آپ دیکھ لیں کہ جب آپ آئے تو وڈیرے آپ کے ارد گرد گھومتے تھے کسی کی بھیڑیں گم ہیں ۔ راشن کا معاملہ ہے ۔ ان کی سفارش آپ تک یہی لوگ لاتے تھے جب کام ہو گیا وڈیرے نے اپنی فیس فوراً وصول کی “ بھائی بات تو ٹھیک ہے ۔ کئی دفعہ ہمیں بھی یہ شکایتیں ملیں جب تفتیش کی تو بات سچ نکلی ۔

ہمیں یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک وڈیرے صاحب تشریف لائے کہ صاحب ہماری قوم کا آدمی گرفتار ہوا ہے یہ واردات کے علاقے میں رہتا ضرور ہے مگر اس کا واردات میں کوئی ہاتھ نہیں اور اس کی بوڑھی ماں بیمار ہے اسے چھوڑ دیں جب ضرورت ہو گی میں اسے حاضر کر دوں گا ۔ ہمارے اوپر وڈیرے کی خدا ترسی کا بڑا اثر ہوا ۔ بات آئی گئی ہو گئی ۔ ہم ویسے بھی عام آدمیوں سے ملنے جلنے کے قائل ہیں ۔ ایک ہمارے دوست ہیں جو بھیڑیں چراتے ہیں ۔ اکثر شام کو ٹہلتے وقت ان سے ملاقات ہو جاتی ہے کچھ دن بعد ملے تو شکوہ کرنے لگے ” پھر آپ لوگ وڈیروں کے چکر میں آ گئے ہیں “ ہم بالکل نہیں سمجھے ۔ وضاحت چاہی تو پتہ چلا کہ وڈیرے صاحب نے آدمی کو چھڑانے کے لیے چار دنبے لیے ہیں ۔ جب پوچھ گچھ کی تو بات درست نکلی ۔ جب لوگ براہ راست آنے لگے تو وڈیروں کو تکلیف ضرور ہوئی ۔

بہر کیف ہمارے کنگرانی دوست اور زرقون سردار صاحب اس کی وضاحت کرتے رہے کہ عام آدمی کو اتنا دبا کر رکھا گیا کہ وہ وڈیروں اور سرداری نظام کے خلاف کچھ کہہ نہیں سکتا تھا ۔ مگر عام آدمی پریشان ضرور رہا ۔

اب دوسرا طبقہ یہاں کے عام آدمی ہیں ۔ عام آدمی تو جناب وڈیرے کی طرف دیکھتا ہے جتنا تگڑا وڈیرہ اتنا ہی زیادہ علاقے میں اس کا اثر ۔ جتنا ظالم اتنے ہی لوگ اس سے ڈرتے ہیں ۔ آپ ہماری بات کا پتہ نہیں یقین کریں

یا نہ کریں۔ ہم این فرسن صاحب کی کتاب جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں اس کے حوالے سے ایک قصہ سنائے دیتے ہیں آپ بھی سن لیجیے۔

یہ واقعہ ۱۹۵۵ء کا ہے۔ اس واقعہ کو بیان کرنے سے پہلے این فرسن صاحب یہ بیان کرتے ہیں کہ جو موروثی وڈیرے اپنی طاقت کا استعمال کرنے سے قاصر ہوتے ہیں وہ انتظامیہ کی نظروں سے گر جاتے ہیں اور پھر انہیں زیادہ مُنہ نہیں لگایا جاتا اور جرگے سے بھی ہٹا دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مبری موجودگی میں ایک جوان وڈیرے ای۔اے۔سی (EXTRA ASSISTANT COMMISSIONER) کے پاس آیا اور شکایت کرنے لگا کہ میری کوئی بھی نہیں سنتا، کیونکہ انتظامیہ میری مدد نہیں کرتی۔ اسے بتایا گیا کہ اس میں قصور تمہارا ہے اگر تم بگڑے رہو تو مجال ہے کہ تمہاری بات تمہارے آدمی نہ سنیں۔ جب تمہارے آدمی تمہارے کہنے پر چلیں گے تو پھر انتظامیہ بھی تمہاری عزت کرے گی۔"

اسی طرح موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں کہ انتظامیہ کا ڈھانچہ کچھ اس طرح سے ہے کہ حکومت کے نمائندے کے توسط سے طاقت قبائلی تمندار اور وڈیرے حاصل کرتے ہیں۔ پھر ایک وڈیرے کا قول دہراتے ہیں "میں پولیٹیکل ایجنٹ صاحب کے جوتوں کی خاک صاف کرتا ہوں اور اس کے بدلے ہزاروں میرے جوتے صاف کرتے ہیں۔"

ہم نے این فرسن صاحب کی کتاب کا حوالہ اس وجہ سے دیا کہ شاید ہماری بات کا یقین نہ کریں۔ چلیے باہر والوں کو ہم سے کیا مطلب۔ اس نے جو دیکھا وہ لکھ دیا۔ ویسے ہم بھی آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے جو اپنے کانوں سے سنا آنکھ سے دیکھا اور کتابوں میں پڑھا وہ ہی بیان کر دیا ہے۔ تجزیہ آپ پر چھوڑتے ہیں۔

"تیسرا درجہ آتا ہے۔ جناب کمین/کم اصل یا غریب "سیال" کا یہ وہ طبقہ ہے جس میں ڈوم، مرہیا وہ لوگ شامل ہیں جو کہ پشتینی غلام تھے۔ یہ کم درجے کا کام کرتے ہیں۔ یعنی گانے بجانے کا زمینوں پر ہل چلانے کا یا اس قسم کے اور کام۔ ان کے ساتھ آغاز سے ناروا سلوک ہوتا آیا ہے۔ آخر کو غریب کم درجے کے لوگ ہیں۔ اگر کوئی ان کی عورتوں سے شادی کر بھی لے تو اس کی اولاد کا نہ تو ورثے میں کوئی حق اور پھر وڈیرہ یا سردار بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کم درجے کے لوگوں میں جت بھی شامل ہیں جو زیادہ تر اونٹوں کو چراتے ہیں۔

یہ حالات تو ہمارے دوستوں نے سرسری طور پر بیان کیے آگے چل کر اور وضاحت ہو جائے گی۔ اب ہمارے

دوست کہنے لگے کہ جب ایسے حالات ہوں تو وڈیرے سخت جوڑتوڑ میں لگ جاتے ہیں۔ ایک کو گھٹیا' دوسرے کو بڑھانا۔ جب بات امن و امان اپنے علاقے میں قائم کرنے کی ہو تو پھر نئے نئے لوگ میدان میں آتے ہیں اور اپنا اپنا زور دکھاتے ہیں تاکہ حکام ان کی طاقت کو مانیں اور ان کی مدد کریں اور ان کو وڈیرہ بنادیں۔ لڑائی اور گڑبڑ ہوتی ہے تو آپس میں۔ کیا بات کی ہے انگریز والی۔ تو جناب ادھر تو کام ایسے ہی چلتا رہا ہے۔

ہمارے نگرانی دوست بولے "تو اسی قسم کی ایک ہستی ہیں جو خاندانی وڈیرے تو نہیں مگر سب سے بڑے وڈیرے گنے جاتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے کافی لوگوں کو تنگ کیا اور بہت سے پشتینی وڈیروں کو نیچا بھی دکھایا ان کے نام کو جانے دیں اپ اسٹارٹ" وڈیرے کے نام سے ہی یاد کرلیتے ہیں۔ ماشاء اللہ تھوڑے بہت پڑھے لکھے ہیں یعنی میٹرک پاس۔ یہ بجارانی مکرے سے تعلق رکھتے ہیں یہ بجارانی اور مکروں یعنی لوہارانی اور غزنی سے بہت بڑا ہے سرداری تو گزینوں کے پاس ہے اسی وجہ سے بجارانی اس پر کچھ خوش نہیں ہیں۔ مگر معاملہ مجبوری کا ہے۔ تو جناب اپ اسٹارٹ وڈیرے صاحب نے دبے پاؤں بھی راستہ اختیار کیا۔ پہلے تو ایک مظلوم پارٹی بنائی۔ مطلب یہ ہی کہ ظلم کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔ سرداری کا ذرا زور بھی کم ہو۔ پھر کچھ مظاہرے بھی کرائے کہ راشن وڈیروں کے ذریعے نہیں بٹنا چاہیے بلکہ براہ راست دیا جائے۔ باقی وڈیروں کا زور ذرا مضبوط تھا تو معاملہ آگے نہ بڑھا۔ پھر آس پاس نظر ڈالی اور مری علاقے سے باہر لوگوں سے رابطہ قائم کیا۔ اس عرصے میں غیر ممالک کے چکر بھی لگائے پیسہ بھی آنا شروع ہوگیا۔

۱۹۶۰ء کے اوائل میں مری علاقے میں سرداری تو قائم تھی مگر ایجنسی کا کام ایک سربراہ کونسل چلاتی تھی جس کے نو ممبر ہوتے تھے اس کونسل کے سربراہ دودا خان تھے جو موجودہ سردار صاحب کے چچا تھے زیادہ تر یہ کام پولیٹیکل ایجنٹ کی وساطت سے ہی کرتے تھے۔"

ہمارے دوست بیان کرنے لگے کہ جب اپ اسٹارٹ وڈیرے کا زور زیادہ ہوا تو انھوں نے اپنے قبیلے یعنی بجارانیوں کو کہا کہ "غلہ" دینا بند کردیں یعنی کہ بیس بھیڑوں پر ایک بھیڑ سردار کا ٹیکس ٹھکر لینے سے کیا فائدہ۔ یہ ٹیکس معاف کردیا گیا۔ پھر ایسی ہی اور باتیں ہوتی رہیں اس عرصے میں اپ اسٹارٹ وڈیرے اور ان کے ساتھیوں نے زور آزمائی کی سوچی اور حکومت کے خلاف تیاریاں شروع کردیں۔ باہر سے منشیر لائے اور تربیت شروع کردی۔

۱۹۶۴ء میں جب دودا خان کہان سے سبی جا رہے تھے۔ انھیں گھات لگا کر مارا گیا۔ ان کے ساتھ سربراہی کونسل کے تین اور وڈیرے تھے وہ بھی مارے گئے۔ تھوڑے عرصے بعد حکومت کا ایک ڈوزر جو کہان کے پاس کام کر رہا تھا' اُسے جلا دیا گیا۔ اب حکومت سے پنجہ آزمائی شروع ہو گئی۔ اَپ اسٹارٹ وڈیرے پہاڑ پر چلے گئے جب سرداری ختم کر دی گئی تو ان کا مفاد سرداری نظام کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ ۱۹۶۶ء میں ملیشیا اور پولیس کو امن وامان قائم کرنے کے لیے بھیجا گیا۔

اس وقت مغربی پاکستان کا ایک ہی صوبہ تھا۔ کالاباغ صاحب گورنر تھے۔ دونوں جانب کافی نقصان ہوا۔ کافی فراریوں نے ہتھیار ڈال دیے مگر اَپ اسٹارٹ وڈیرے ہاتھ نہ آئے۔ جب یہ باتیں ہو رہی تھیں تو کچھ اور ہمارے مری دوست آکر بیٹھ گئے۔ جہاں ہمارے دوستوں کے بیان میں فرق آتا تو وہ ٹھیک کر دیتے۔

ہمارے مری دوست نے پھر بیان شروع کیا کہ تقریباً ایک سال تک یہی حال رہا۔ فراریوں کا زور تقریباً ٹوٹ چکا تھا کہ گورنر صاحب بدل گئے۔ نئے گورنر صاحب نے بیان دیا کہ چونکہ ان قبائلیوں کی طرف سے پڑوسیوں نے معافی مانگ لی ہے اور یقین دہانی کرائی ہے کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ پھر سے وہی نظام قائم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۰ر جنوری ۱۹۶۷ء کو ملیشیا اور پولیس کو واپس بلا لیا گیا۔ حکومت کو ایسا واپس بلایا گیا کہ پولیس تھانے بھی تڑوا دیے گئے۔ حکومت کے درمیان ایک اور حکومت قائم کر دی گئی اور اَپ اسٹارٹ وڈیرے کوئٹہ میں رہنے لگے اور انھوں نے کام بھی سنبھال لیا۔

اب جن لوگوں نے حکومت کا ساتھ دیا تھا یا ہتھیار ڈالے تھے ان کے جانور ضبط کر لیے گئے۔ عورتیں چھین لی گئیں اور ایسی عبرتناک سزائیں دی گئیں کہ آپ یہاں آکر خود ان لوگوں سے پوچھ لیں۔ جو لوگ ان تخریبی کارروائیوں میں شامل تھے وہ ہیرو بن گئے۔ آئندہ جنگ کے لیے مزید تیاریاں کی گئیں۔ دوبارہ جب نظام بدلنے کی کوشش کی گئی تو اس کا احوال آپ کے سامنے ہے۔"

ہم نے اپنے دوستوں کے بیان کی تصدیق کافی جگہوں سے کی اور اس کے بعد آپ کے سامنے پیش کیا۔ ہمارے دوست جب بیان ختم کر چکے تو کہنے لگے کہ جناب "یہ نظام بدلتے بدلتے کافی دیر لگے گی۔ یہ دو تین سالوں کی بات نہیں ہے۔ صدیوں کی پسماندگی اور فرسودہ نظام کو جلد ختم نہیں کیا جا سکتا۔ سوال ختم کرنے کا نہیں بلکہ بدلنے کا ہے۔"

JALAL BOOKS

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

مہاوند کا ٹیوب ویل

KUTUB KHANA JALALI BOOKS

جنگی رواج۔ ایک جائزہ

آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ انگریز مری قبائل کو طاقت سے زیر کرنے میں قاصر رہا اور اس نے جوڑ توڑ کا طریقہ استعمال کیا۔ دراصل صدیوں سے رواج کچھ اس طرح کے ہیں کہ ہر ایک پیدائشی سپاہی ہوتا ہے۔ بلوچستان میں یا یوں کہیے کہ پورے پاکستان کے قبائل میں "مری" سے بہتر اور بہادر لڑنے والا کوئی اور قبیلہ نہیں۔ یہ آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہے۔ آپ تاریخ پڑھ لیں۔ فنِ سپاہ گری میں یہ اپنا ثانی نہیں رکھتے آخر کیوں نہ ہو عرب خون ہے اور صدیوں سے ان کا صرف یہی کام رہا ہے۔ صدیوں کی عادت جلد ختم نہیں ہو سکتی۔ ان کے طور طریقے، رہنے سہنے کے ڈھنگ، رواج سب اس کی شہادت دیتے ہیں۔ اگر فرق آیا ہے تو سرداروں اور وڈیروں کے خاندانوں میں۔ عام آدمی تو بے چارہ جیسے پہلے تھا ویسا اب بھی ہے۔ ہم جنگی رواج پر سرسری بحث کہیں اور بھی کریں گے۔ مگر یہاں تفصیل سے ذکر کرنا مناسب ہے۔

فنونِ لطیفہ:

پہلے فنون لطیفہ کی بات ہو جائے۔ پینٹنگ وغیرہ تو کی نہیں جا سکتی مگر یہاں اس کا اپنا رنگ ہے اکثر لکڑی پر ہلکی سی کھدائی کی جاتی ہے۔ اگر آپ سے کسی کو اُنس ہے تو وہ شاید آپ کو ایک چھڑی پیش کرے

اس چھڑی پر پوری زندگی کی کہانی درج ہوگی، پیدائش سے دمِ واپسی تک کی۔ نمایاں ترین بات جنگی مناظر ہوں گے کہ جنگ کس طرح ہوتی ہے۔ لڑائی اور مار کٹائی سے بھرپور۔ چھڑی پیش کرنے والے کو جتنا آپ سے اُنس ہوگا اتنے ہی لڑائی کے مناظر بھی محنت اور وضاحت سے پیش کیے جائیں گے۔ یہ کسی ہیرو کی کہانی ہو سکتی ہے یا پھر ایک عام مری کی زندگی۔ اس قسم کا آرٹ چھڑیوں تک اس لیے محدود ہے کہ لوگ گھر نہیں بناتے دیواریں ندارد۔ جھگیاں چٹائی یا کمبل کی ہوتی ہیں تو ان پر نقش کرنا ابھی تک انہوں نے سیکھا نہیں ہاں کہیں کہیں سردیوں سے بچنے کے لیے غار استعمال کیے جاتے ہیں۔ بشرطِ مجبوری یا وقتی طور پر۔ ایسی حالت میں جگہ کو خفیہ رکھنا ضروری ہے تو وہ رہتی ہے کہ کوئی نشان نہ چھوڑا جائے۔

بات گانے بجانے کی آئے تو جناب اس کو مری اچھا نہیں سمجھتا۔ یہ کام تو ایک علیحدہ فرقے کے سپرد ہے جیسا کہ پاکستان کے دیگر علاقوں میں جنھیں مراثی کہا جاتا ہے۔ ساز تو یہاں خاص نہیں ہیں۔ سوائے ایک "نڑ" کے یا ایک سارنگی کی قسم کی چیز ہوتی ہے۔ وہ بھی بہت ہی کم "نڑ" ہی عام ہے۔ یہ ایک طرح کی بانسری ہوتی ہے مگر بانسری سے تین گنا لمبی۔ موٹائی میں بھی یہی تناسب رکھ لیں۔ ٹھیک رہے گا۔ گانے والے کو "تری" کہتے ہیں۔ میرے خیال میں اس لفظ کا تعلق "سُر" سے ہے یعنی یہ صاحب گانے کے ساتھ ساتھ "سر" بھی دیتے ہیں۔ گانا عموماً ایک ہی لے میں ہوتا ہے اور بانسری کی بھی ایک جیسی لے برقرار رہتی ہے۔ گانے میں بہادری کی داستانیں ہوتی ہیں۔ عشقیہ عموماً کم ہی، وہ بھی پرانے زمانے کی۔ ایک جگہ ہم نے سسی پنوں کا بلوچی ورژن بھی سُنا۔ اس کا ذکر کہیں اور کریں گے۔ اتنا یہاں پر بتا دیں کہ بڑا ہی لطف آیا۔ بلوچی ورژن سندھی اور پنجابی سے ذرا مختلف ہے۔ "گانے" شاعر لکھتے ہیں۔ کیا ہتک کی ہے شاعروں کی۔ شاعر تو غزل کہتے ہیں۔ قصیدہ لکھتے ہیں۔ نظم میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ آج کل تو فلمی شاعری میں گیت بہت عام ہیں۔ بات اُردو یا کسی اور شاعری کی نہیں ہو رہی۔ یہ ذکر تو مری علاقے کا ہے۔ جی یہاں تو یہ ہی کہا جاتا ہے کہ "گانے" شاعر لکھتے ہیں۔ شاعر کا رُتبہ یہاں بہت بڑا ہے۔ کہتے ہیں کہ شاعر کو خواب آتا ہے اور صبح بیٹھ کر وہ گانے لکھ دیتا ہے۔ خداداد بات ہے جس میں الہام کو بھی دخل ہے۔ میر چاکر سے بہت پہلے، ان کے بعد اور حال کی بھی نظمیں ہیں۔ حال کی نظموں میں حالات کا بڑا دخل ہے۔ ایوب خان کے دورِ حکومت کی تو ابھی

خاصی مٹی پلید کی گئی ہے یا کروائی گئی ہے۔ اب ایک نظم کا مفہوم آپ بھی سُن لیں" ایوب خان تم اچھے بادشاہ بنے ہو کہ کالا باغ کو نائب بنایا جو کہ بلوچوں کا جانی دشمن ہے۔ مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے اس کو کم کرنے کے لیے خون بہایا جاتا ہے لیکن ہم بھی بڑے لڑاکا ہیں۔ جب جنگ شروع ہوئی تو ہمارے وڈیروں نے بھی جنگ کا اعلان کیا۔ اِن کی بہنوں نے بہادروں کے سر پر پگ رکھی۔ ہتھیار سجائے اور گانا گاتے ہوئے رخصت کیا۔ میدان میں سرکاری فوجوں کے پرخچے اڑا دیے پھر فتحیاب ہو کر گھر لوٹے' ان کی بہادری کی داستان دنیا گاتی ہے" یہ تو نمونے کے طور پر ہے۔ دورِ حاضر کے بارے میں بھی گانے بنے ہیں لیکن لوگ سنانے میں ہچکچاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ابھی تک ہمارے پاس پہنچے نہیں۔ کیا بات ہے؟ فلمی گانا ہوگا تو اس کے متعلق کہدیں گے کہ ابھی تک ریکارڈ مارکیٹ میں نہیں آیا۔ بہت اصرار کرنے پر سُنا بھی دیتے ہیں۔ نمونے کے طور پر مفہوم حاضر ہے"! ہم مری ہمیشہ سے بہادر ہیں۔ ہماری بہادری کی گواہی یہاں کے پہاڑ اور وادیاں دیتے ہیں۔ ہم ہمیشہ سے اپنے دشمنوں پر غالب رہے۔ ابھی ہماری غیرت کو کیا ہو گیا ہے؟"

بڑی کوشش کی کہ بھائی کسی شاعر سے ملاقات کرا دو۔ مگر بے سود۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ جناب بیسویں صدی ہے کوئی ان باتوں کو سُننے کے لیے تیار نہیں۔ ان لغو باتوں سے ترقی کو کب تک روکو گے۔ شاعری بھی تم نے پڑھ لکھ کر ہی سیکھی ہے اب تو لوگ خود آتے ہیں کہ اسکول کھولو۔ جہاں بیس بچوں کی جگہ ہے۔ وہاں پچاس ہوتے ہیں۔ سڑکیں بن گئی ہیں۔ بسیں بھی چلاؤ۔ اگر نہیں چلاتے تو ہمیں دو ہم خود چلائیں گے۔ ڈاکٹر کیوں نہیں ہیں۔ ہمارے بچوں کو پڑھاؤ ہم خود اسپتال چلائیں گے تو جناب بات شاعری کی تھی۔ شاعر لگے ہوتے ہیں اپنی دھن میں۔ آج سے نہیں صدیوں سے۔ ابھی تو زور کم ہے۔ جہاں عمل ہوتا ہے وہاں ردِعمل کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ قانون حرکیات کے بارے میں نیوٹن نے دریافت کیا تھا۔ تو اس کا اطلاق یہاں کی شاعری پر بھی ہوتا ہے۔ کچھ شاعر نئی نسل کے بھی ہیں۔ وہ ترقی کو بُرا نہیں سمجھتے مگر ان کی رسائی ابھی تک گانے والوں تک نہیں ہوئی ہے۔ شاید ریڈیو اور ٹی وی والوں تک ہو جائے۔

گانے بجانے اور شاعری کے سلسلے میں یہاں کا ایک دستور بھی ہے۔ جب بھی کوئی جنگ پر جاتا ہے تو عورتیں اس کی شان میں قصیدے گاتی ہیں۔ قصیدے بھی شاعر ہی لکھتے ہیں۔ خواب بھی تو انہی کو آتے

ہیں ۔ اگر کوئی بزدلی دکھائے تو مجھو بھی حاضر ہے ۔ اب بھاگے کوئی میدان سے ۔ قصیدے کیسے برے لگتے ہیں ۔
جوانی کا خون گرم ہوتا ہے تو پھر ہر ایک مارنے مرنے کو تیار کہ لکھو ہماری شان میں قصیدے ہم بھی اپنے
جوہر دکھاتے ۔ پھر جو بھی ہے لڑائی کا دیوانہ ۔ علی گل ٹھنگیانی، شانواز، صیدا جو اپنے زمانے کے ملنے ہوئے
لڑاکا ہیں انہیں جب اپنے ساتھ شمالنگ سے لائے تو ان کے ساتھیوں سے کہا کہ نمونے کے طور پر اور کچھ ہماری
معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے ایک آدھ قصیدہ ہمیں بھی سناؤ۔ پہلے تو تکلف کیا پھر سنایا اور خوب
سنایا ۔ اب تو معافی دے دو پرانی باتیں دل سے نکال دو تم نے کہا تھا تو سنا دیے ۔ یہ تو ہوا انگریزی کی زبان
اور فوجی اصطلاح میں موٹیویشن (MOTIVATION) کا طریقہ ۔ اسے جوش دلانے کا "رواج" بھی کہہ
سکتے ہیں ۔ پرانے زمانے میں بھی رجز پڑھے جاتے تھے ۔

اب نظر ڈالیے یہاں کی تنظیم پر ۔ یہ تنظیم امن اور جنگ کے لیے نہایت موزوں لیکن آج سے سو سال پہلے
کے لیے ۔ مگر دورِ حاضر کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دل کو نہیں لگی ۔ اسلامی اخوت، جمہوریت، سماجی اور
معاشی انصاف اور مساوات کے چکاچوند نعروں کے سامنے ویسے بھی یہ نظام کہاں ٹھہر سکتا ہے مگر جناب ٹھہرا
اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے ۔ اب بھی دانستہ یا نادانستہ کچھ لوگ اس نظام کی حامی بھرتے ہیں ۔ ایسے ویسے
نہیں پڑھے لکھے ۔ چلیے ضد یا ذاتی مفاد کی خاطر ہی سہی ۔ وہ بھی انگلستان کے تعلیمیافتہ ۔ تنظیم کا کہیں پہلے بھی
ذکر کیا ہے ۔ مگر جب جنگ کی بات آگئی تو تھوڑی سی وضاحت ہو جائے ۔ سب سے پہلے آتا ہے تمن سردار کا پھر
تمن دار اپنے قبیلے کا سب سے بڑا ہوتا ہے ۔ ہر لحاظ سے اپنے قبیلے کی حفاظت، انصاف، اندرونی اور بیرونی جنگی
معاملات کی گتھیاں یہ ہی سلجھاتا ہے ۔ تمن دار کی مدد کے لیے مقدم ہوتے ہیں ۔ جو تمن دار کی مدد کرتے ہیں اور
اپنے اپنے فرقے یا جزوی قبیلوں کے مالک ۔ ان کے نیچے وڈیرے ۔ یہ بھی اپنے چھوٹے حصوں کے مالک ہوئے ۔
تمندار، مقدم اور وڈیرے کی حکومت موروثی ہوتی ہے ۔ اگر اولاد نہ ہوئی تو نیا عہدیدار قبیلہ چنتا ہے اور
اس کے سر پگڑی رکھی جاتی ہے ۔ تمندار اور مقدم بیٹھ کر صلاح مشورہ کرتے ہیں کہ جنگ کس طرح کی جائے
اس کے بعد ہر ایک جزوی قبیلہ سپاہی اور کمانڈر مہیا کرتا ہے اور قوم لڑائی کے لیے تیار ۔ ویسے وڈیرے
کے نیچے معتبر بھی ہوتے ہیں ۔ ہر یوں کے جہاں اور قبیلے ہیں وہاں ایک خاص قبیلہ ہوتا ہے جو اب بھی ہے

مگر اب بات وہ نہیں رہی۔ انھیں رہزن کہا جاتا ہے۔ اس قبیلے کو خون بہا معاف ہوتا تھا۔ یہ لوگ جنگ کے دوران پیچھے بیٹھتے تھے تاکہ اگر کوئی میدان چھوڑ کر بھاگے تو اسے موقع ہی پر سزا دی جاسکے۔ سزا صرف ایک یعنی گردن اڑا دی جاتی تھی۔

شاہوں، تمنداروں، مقدموں اور وڈیروں نے سر دھڑ کی بازی لگائی کہ عہدے برقرار رہیں۔ مگر پرانا نظام پھر پرانا نظام ہوتا ہے۔ تمندار، مقدم اور وڈیرے قائم تو رہے مگر جو بھی تگڑا ہوا جنگ میں بہادری دکھائی۔ ہتھیا لیا اپنا عہدہ۔ یار لوگوں نے بھی آدمی تگڑا دیکھا، ہو گئے خاموش۔ آپس میں بھی بات وہ نہ رہی۔ مگر کچھ بات تو رہی۔

جہاں لوگ اس نظام کو برا کہتے ہیں اور صرف وڈیروں کو بے نقط سنانے کو اپنی ذمہ داری خیال کرتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ تھوڑی بہت زیادتی کرتے ہیں۔ قصور ہم سب کا ہے۔ اگر قصور ہم سب کا نہ ہوتا تو حالات کی یہ نوبت کیوں آتی۔ اب ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے یعنی صرف دو سال پہلے ہی کے حالات لے لیں۔ بری سے بری بھی یادداشت ہو تو بھی دو سال تک تو ساتھ دیتی ہے۔ سڑکیں ناپید، علاقہ دشوار گزار، تھانے غائب، غریب آدمی کو تو حفاظت چاہیے۔ حفاظت اپنی جان، مال اور بیوی بچوں کی

اب آپ کوہلو کے بالکل جنوب کی جانب دیکھیں تو جندران کا پہاڑ ہے۔ اس کی بلندی چھ ہزار فٹ ہوگی اوپر جاتے جاتے ہی سارا دن لگ جاتا ہے۔ دو سال پہلے یہاں کچھ بھی نہ تھا۔ جندران میں کافی آبادی ہے اب کوئی کسی کی بیوی چھین لے۔ مال لے جائے جو کہ عموماً ہوتا ہے یا آپس کے جھگڑے ہیں تو غریب داد فریاد کہاں لے جائے۔ مجبوراً وڈیرے کا سہارا۔ پھر وڈیرہ تو اپنی فیس لے گا۔ جو جتنی بہتر حفاظت مہیا کرے اتنا ہی بڑا آدمی۔ تو جناب سوسائٹی کی تشکیل ہی اسی طرح ہے۔ آپ وڈیروں کو ہٹا دیں تو خلاء رہ جائے گا۔ خلاء سے اور گڑبڑ ہوگی۔ اس کا علاج یہی ہے کہ وڈیروں کی جگہ پکا انتظام قائم ہو جیسا کہ کیا جا رہا ہے۔ دیر تو لگے گی مگر کوئی اور چارہ نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشی و زرعی ضروریات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ تعلیم پھیلانے کی رفتار کو بھی تیز کیجیے۔

سردار، تمندار اور وڈیرے کیسے اپنی میراث کو چھوڑیں۔ کچھ پڑھے لکھے بھی ہیں۔ پڑھائی اپنی جگہ اپنا

مفادِ کسے پیارا نہیں ہوتا ۔ مفاد اور پھر "میں" ہمیشہ سب سے پہلے ۔ عام آدمی جائے بھاڑ میں ۔ جب ذاتی بات ہو تو سردھڑ کی بازی بھی جائز ہے ۔ کچھ نے رگائے غیر ملکوں کے چکر، واپسی پر مشیر بھی لائے آج کل دنیا بہت چھوٹی ہے، ہر ایک پھٹے میں ٹانگ اڑانے کو تیار ۔ حالات بھی سازگار ۔ کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے ۔ دو بدو جنگ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ۔ لڑائی ایسے کی جائے کہ اپنی کمزوریاں ظاہر نہ ہوں اور دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جائے ۔ ۱۹۶۲ء میں کیمپ کھولے گئے ۔ تربیت ہوئی ۔ علاقے بانٹے گئے اب اس قسم کی تخریبی کارروائی کے لیے معلومات حاصل کرنا اور اپنی معلومات کو چھپانا اہم ہوتا ہے یہ بھی ضروری ہے کہ رسد اور اسلحہ کی فراہمی کا بندوبست بھی درست ہو ۔ کام سونپے گئے جو پڑھے لکھے تھے وہ "قراری" بنے جو لڑنے والے تھے وہ "فراری" ۔ "قراری" اور "فراری" یہ میری اصطلاح نہیں ۔ یہ ہیں کی اختراع ہے "قراری" وہ تمندار، مقدم یا وڈیرے تھے جن کا کام یہ تھا کہ ظاہراً اہم حکومت کے وفادار مگر کوشش یہ کہ نظام نہ بدلے اور رہے ہماری تھانیداری ۔ معلومات، رسد اور اسلحہ فراہم کرنا ہمارا کام ہے ۔ یہ بھی تو مشکل بات ہے ۔ کہیں سے پیغام فراریوں کے لیے آتا ہے اس کو پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے ۔ جب شروع شروع میں آئے تو جناب علاقے کے وڈیرے ہیں کہ پیچھا نہیں چھوڑتے ۔ وفاداری کی قسمیں کھائی جاری ہیں حکومت کی شان میں قصیدے پڑھے جا رہے ہیں اور فراریوں کو گالیاں ۔ ہر ایک یہ سمجھے گا کہ ان سے زیادہ وفادار کوئی نہیں ۔ خیر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ سب ہی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے ۔ کافی سے زیادہ ہمدرد بھی تھے اور ہیں اور سب لوگوں پر الزام دھرنا بھی بے جا ہوگا ۔ ذرا غور کیجیے ۔ پہلے بھی حکومت آئی اور واپس گئی ۔ وفاداروں کے ساتھ کیا ہوا وہ انہیں سے پوچھیے ۔ حکومت کے جانے کے بعد بیویاں چھینی گئیں ۔ مال ضبط ہوا جب ماتھا رگڑا تو چیزیں واپس ملیں ۔ دوسرے یہ بھی ہے کہ ہر ایک کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے ۔ جب تک مکمل حفاظت نہ ہو تو کیسے ایسی سوسائٹی میں لوگ وڈیرہ شاہی نظام کے خلاف آواز اٹھائیں گے ۔ کچھ تو رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ۔ مجبور ہیں تو کیا کہیں ۔ اب خیر سب گہرے دوست ہیں ۔ اس وقت کیا ہوا تھا ۔ مجبور تھے کیا کرتے ۔

اب "فراری" تو خیر فراری ہوئے مطلب اور مفہوم ظاہر ہے ۔ فراری وڈیرے اپنے اپنے علاقوں میں تخریبی

کارروائیوں کے ذمہ دار۔ اُدھر "فراریوں" سے خبر ملی اور اِدھر کارروائی کو عمل میں لائے۔ رسد یا اسلحہ کی ضرورت ہوئی "فراری" عمل پیکار۔ اگر کوئی "فراری" پکڑا گیا۔ اب "فراری" ہیں کہ چکر لگا رہے ہیں خدا اور رسول کی قسمیں کھائی جا رہی ہیں اور آپ کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ یہ بے گناہ ہے۔

کسی قسم کی بھی جنگ ہو خبر کا صحیح اور تیزی سے پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک انگریز جنرل کی کتاب نظر سے گزری۔ موصوف اس علاقے میں نوکری کر چکے ہیں۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب وہ سبی میں مقیم تھے اور اور انگریز فوج کا ایک دستہ کوہلو کی جانب گیا ہوا تھا۔ مری قبائل کے ذریعہ خبر موصول ہوئی کہ آج صبح انگریز فوج کو شکست ہوئی ہے۔ چار افسر اور پچاس جوان مارے گئے۔ صاحب بہادر اُچھل پڑے کہ یہ کیسے درست ہو سکتا ہے۔ جہاں جنگ ہوئی ہے وہاں سے سبی تک دو دن کا راستہ ہے۔ اتنی جلدی خبر کیسے پہنچی یقین نہیں آیا۔ لکھتے ہیں کہ "دو دن بعد فوجی ذرائع سے خبر پہنچی۔ دونوں کی معلومات ایک جیسی تھیں" اب کیجئے بات۔ یہ تقریباً سو سال پرانا واقعہ ہے۔ خبر رسانی کا ان کا یہ طریقہ صدیوں پرانا ہے قصہ پڑھ کر ہمیں بھی تعجب ہوا کہ لکھنے والا مبالغہ آرائی کر رہا ہے۔ کتابیں اور بھی پڑھیں۔ جب دوستی مری بھائیوں سے زیادہ ہوئی اور ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا عام ہوا تو عقدہ کھلا۔

مری قبائل میں خبر پھیلانا ایک رواج ہے اور بچپن ہی سے ہر ایک کو اس کی تربیت دی جاتی ہے۔ جب کبھی بھی کوئی راستے میں ملتا ہے یا سفر کر کے آتا ہے علیک سلیک کے بعد پہلا سوال ہوتا ہے کہ "حال دے" آنے والا پورا "حال" دیتا ہے۔ جب آنے والا اپنی روداد ختم کر لیتا ہے تو دوسرے سے یہی سوال کرتا ہے۔ "تائیں حال دے"۔ وہ بھی اسی طرح حال بیان کرتا ہے۔ اس طرح آناً فاناً خبر مشہور ہو جاتی ہے۔ حال دیتے وقت کوئی اہم بات نظر انداز نہیں کی جاتی ہے۔ سننے والے کو اگر کہیں وضاحت طلب ہو یا بیان تشنہ رہ جائے تو وضاحت بھی طلب کر لی جاتی ہے۔ حال دینا ایک ایسا رواج ہے کہ اگر اسے پورا نہ کیا جائے تو دشمن کے جاسوس کا لیبل لگ جاتا ہے اور جاسوس کی سزا تو آپ کو معلوم ہے یعنی سر قلم۔ "حال" میں بیویوں یا کسی عورت رشتہ دار کا ذکر نہیں ہوتا یہ حوالہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہم تو اپنے بے تکلفی کے باعث اپنے مری دوستوں سے ملتے ہی پوچھنے لگے کیسے بیگم صاحبہ اور بچے خیریت سے ہیں۔ ہمارے دوست ہنستے مگر بُرا نہ مانتے۔ ایک روز

JALALI BOOKS

ایک دوست کہنے لگے "شاہ صاحب ہم تو آپ کی عادت سے واقف ہیں۔ ویسے بھی آپ سید ہو مگر ہمارے ہاں بیوی اور بچوں کا حال نہیں پوچھا جاتا" "بھئی آخر کیوں۔ یہاں کی تمام عورتیں ہماری مائیں بہنیں یا بیٹیاں ہیں۔ ہم تو معلوم کریں گے۔" "آپ کی مرضی ویسے آپ سے اتفاق ہے بس رواج نہیں۔ ہمارے ہاں عورت کی اہمیت ہی نہیں۔"

حال عموماً ایک خاص ترتیب سے دیا جاتا ہے۔ اس میں تھوڑا بہت ردوبدل بھی ہوسکتا ہے حال لینے اور دینے کی ترتیب عموماً یوں ہوتی ہے۔

ا۔ کہاں سے آئے ہو۔ کہاں جا رہے ہو۔ کس غرض سے جا رہے ہو؟

ب: راستے میں کس کس سے ملاقات ہوئی انھوں نے کیا کہا اور تم نے کیا کہا؟

ج: حکومت کی کارروائی۔

د: قومی باتیں یعنی آپس کے جھگڑے یا تصفیہ۔

ر: عام چیزوں کے بھاؤ۔

م: فصل اور مال

ذ: بارش اور گھاس

وڈیرہ علی گل جب نظربند ہوئے تو ان کے گھر والے وادی گریزنی میں واپس آ گئے فرار ہونے سے پہلے وہ یہیں رہتے تھے۔ وہاں میں کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ ان کے صاحبزادے بہار خان جن کی عمر تقریباً سات آٹھ سال ہوگی۔ ملے۔ ضد کرنے لگے کہ باپ سے ملا دو۔ جلدی جلدی تیار ہو کر جیپ میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ماشاءاللہ بہت ہی ذہین ہے اللہ کرے کچھ پڑھ لکھ جائے۔ کوحلو پہنچ کر ان کی خواہش پوری کردی۔ سلام دعا کے بعد وہ ہی بات یعنی "حال دے" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے ٹیپ ریکارڈر لگا دیا ہو۔ بچے نے بولنا شروع کیا۔ آپ بھی سن لیں۔ گھر میں سب خیریت ہے۔ جانور ٹھیک ہیں سوائے دو بھیڑوں کے۔ اونٹ جو گم ہوگئے تھے مل گئے ہیں۔ راشن ٹھیک مل رہا ہے۔ مگر سلیمان نے ز‌مینیں دیتے وقت بے ایمانی کی تھی اس وجہ سے چائے بناتے ہوئے کچھ تکلیف ہوتی ہے۔ دونوں مائیں ہیں آجکل

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

صلح ہے۔ پڑوس میں سیدا کا حلقہ بھی پہنچ گیا ہے۔ باقی ٹنگیانی بھی واپس آرہے ہیں۔ شاہ نواز کے گھروالے شام تک پہنچ جائیں گے۔ شاہ صاحب تقریباً دوپہر کو ہمارے گھر پہنچے۔ اس کے ساتھ دو اور فوجی گاڑیاں تھیں۔ ہر ایک گاڑی میں دس دس آدمی تھے' سب کے پاس ہتھیار تھے۔

شاہ صاحب بغیر ہتھیار کے تھا۔ گھر سے دور ہتھیار والے نیچے اُترے۔ انہیں اس نے گاڑی میں واپس بٹھا دیا۔ پھر اکیلا گھر آیا۔ سب کی خیریت پوچھی۔ میں نے اس کے ساتھ آنے کی ضد کی اور وہ مجھے ساتھ لے آیا۔ واپسی میں یہ "لوہارکی تک" رکا۔ وہاں فوجی کیمپ ہے۔ اس جگہ کچھ لوگ وردی میں تھے۔ باقی شلوار قمیض میں۔ کیمپ میں ہم نے چائے پی اور کھانا کھایا۔ راستے میں "کباوانگا" پر فوجی پکٹ تھی۔ پنچے چار آدمی تھے۔ جن کے پاس ہتھیار تھے۔ انہوں نے صاحب کو سلام کیا اور ہم سب کو پانی پلایا۔ راستے میں ایک مرد اور عورت جارہے تھے جو کہ پوادی تھے۔ شاہ صاحب نے ان کی خیریت پوچھی۔ عورت بیمار تھی۔ انہیں بھی گاڑی میں بٹھا لیا۔ پوادی خیر محمد نام بتاتا تھا۔ اس کا حلقہ نہاڑ کے پاس ہے۔ پوادی بھی پہنچ گئے ہیں انہیں بھی راشن ٹھیک مل رہا ہے۔ شانگ میں ان کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ صرف کچھ بھیڑیں کم ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے باپ سے ملنے کوہلو جارہا ہوں۔ کوہلو پہنچ کر صاحب نے انہیں ڈاکٹر کے سپرد کر دیا۔ گریزنی میں ابھی گھاس کم ہے۔ بارش کافی عرصے سے نہیں ہوئی"۔ یہ تو میں نے مختصر کر کے لکھا ہے' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچہ سبق سنا رہا ہے اور حافظہ ہے کہ بھٹکنے کا نام نہیں لیتا۔ جب بچہ حال ختم کر چکا تو باپ سے کہنے لگا۔ "تائیں حال دے"۔ اس "حالہ" کے رواج سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہاں خبر کتنی تیزی سے اور صحیح طور پر آناً فاناً پھیل جاتی ہے اور پھر پورا علاقہ ہوشیار اور خبردار۔

اب ذرا ان کی بہادری کے معیار پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ بہادری کا "معیار" یہ لفظ تو خود ان کا ہے۔ اگر اس کی جگہ بہادری کا "رواج" رکھا جائے۔ تب بھی غیر مناسب نہیں ہوگا۔ چلیے معیار ہی رہنے دیتے ہیں۔ سجتا بھی خوب ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ کچھ RULES OF HONOUR ہی ہو سکتا ہے۔ اس رواج اور معیار کے سب پابند ہیں۔ اس کا ذکر یہاں اس وجہ سے مناسب سمجھا کہ جب جنگ کی بات ہو رہی ہے تو معیار کی بھی بات ہو جائے۔ یہ رواج بھی صدیوں سے چلا آرہا ہے جو درج ذیل ہے:

JALALI BOOKS

؛ خون کا بدلہ خون ۔ اس میں کوئی رعایت نہیں ۔ پکا اسلامی قانون ۔ صحیح بھی ہے ۔ کیسے انکار ہو سکتا ہے ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انصاف ہو ۔ اندرون قبیلہ تو انصاف کافی حد تک ہوتا ہے لیکن اگر خون کا جھگڑا کسی اور قبیلے کے ساتھ ہے اور قاتل کی نشاندہی نہ ہو سکے تو فریق مخالف کا جو بھی فرد ہتھے چڑھ گیا ۔ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ مطلب یہ کہ ایک کے بدلے ایک اور دس کے بدلے دس ۔ خون کا بدلہ تو ٹھیک ہے مگر یہ بات دل کو نہیں لگی کہ جو سامنے آئے اڑا دو ۔ اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے ۔ بدلہ ہمیشہ واجب الادا ہے ۔ دشمن کی تلاش میں دس دن گزر جائیں ۔ فیصلہ بھی ہو جاتا ہے اگر "شریعت" یا "قرآن" ہو جائے ۔ "شریعت" یا "قرآن" کرنے سے یہ مطلب ہے کہ جرگہ کیا اور جو بھی جرگے نے فیصلہ دیا ۔ اس کی پابندی کے لیے فریقین قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے ہیں کہ وہ فیصلہ کے پابند رہیں گے ۔

ب : اگر کسی کو امان دی گئی تو چاہے جان ہی جائے آن قائم رکھی جاتی ہے ۔ یہ بہادری کی نشانی ہے امان ہر ایک کو دی جا سکتی ہے ۔ بشرطیکہ آدمی یا عورت سیاہ کار نہ ہو ۔

ج : امان صرف جان ہی کی نہیں بلکہ مال کی بھی ہوتی ہے ۔ مجال ہے کہ امانت کو کوئی اور ہاتھ تو لگا لے ہمارے ہمارے ایک پکے مری دوست ہیں ایک روز بکریوں کی افزائش کا ذکر کرنے لگے تو ہم نے تذکرۃً کہا کہ شکر گڑھ کی بکریاں قدآور اور خوبصورت ہوتی ہیں ۔ سوچ کر بولے کہ اگر ایک جوڑا مل جائے تو ہم کوشش کریں گے کہ اچھی نسل نکالیں اس میں کوئی شک نہیں ۔ بھیڑ اور بکری کو یہ لوگ بڑی محبت سے پالتے ہیں اور ان کی نسل کی افزائش میں کافی حد تک ماہر ہیں ۔ میری بچی کو جانور پالنے کا بڑا شوق ہے سیالکوٹ سے بکری کے دو بچے اپنے ساتھ لائی تھی ہم نے بچی کو بتایا تو اس نے بصد خوشی بکری کے بچے بھیج دیئے ۔ وہ ہم نے اپنے دوست کے حوالے کر دیے ۔ دوست یہ سمجھے کہ یہ امانت ہیں ایک روز ایک عورت اور اس کے دو بچے شام کو ہمارے پاس آ موجود ہوئے ۔ دہائیں اور زار و قطار آنسو کیا ہوا ۔ بکری کا بچہ گم ہو گیا ہے اور وہ عورت کے خاوند کی سپردگی میں تھا تو جواب نوٹس دے دیا گیا کہ اگر صبح تک بچہ نہ ملا تو خاوند کی خیر نہیں ۔ بھاگے دوست کے پاس "بھائی ظلم مت

کرو" "یہ ظلم تو نہیں یہ ہمارا رواج ہے۔ امانت کیسے گم ہو سکتی ہے" "بابا امانت کدھر تھی تمہیں تحفہ دیا تھا" تب جاکر معاملہ رفع دفع ہوا۔ ویسے بکری کا بچہ دو دن بعد مل بھی گیا۔

د : جنگ چاہے کتنی ہی شدید ہو، دشمنی چاہے کتنی سنگین۔ عورت، بچے اور ہندو کو کچھ نہیں کہا جاتا۔ عورت بچے کی بات تو سمجھ میں آگئی۔ ہندو یہاں کافی آباد ہیں اور ہمیشہ سے ہیں۔ دوکانداری اور کاروبار کرتے ہیں۔ مریوں کے نزدیک یہ گھٹیا لوگوں کا پیشہ ہوتا ہے لڑاکا لوگ کب اس لغویات میں پڑتے ہیں۔ تو پھر کم درجے کے آدمی پر ہاتھ اٹھانا بھی تو بہادری نہیں۔ بات بھی درست۔

ر : حریف کے گھر سے اگر کوئی عورت دوہائی دیتی ہوئی آجائے تو اس کا قصور معاف کر دیا جاتا ہے لیکن یاد رہے جھگڑے کا تعلق سیاہ کاری سے نہ ہو۔ یہ تو عوام کی بات ہوئی۔ مگر آج کل کے وڈیرے یا یوں کہہ لیجیے جو زبردستی کے وڈیرے بن گئے ہیں اور خیر سے بیرونی سفر بھی کر آئے ہیں وہ ان رسومات کے اتنے پابند نہیں۔ اس قسم کی ایک ہستی ہیں ان کا قصہ ہر ایک مری کو معلوم ہے۔ اگر آپ کہیں تو کتنی ہی شہادتیں مہیا کی جا سکتی ہیں کیونکہ یہاں کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہتی۔ "حالہ" ایکدم چلتا ہے۔ ذکر "اپ اسٹارٹ" وڈیرے کا ہے۔ جس کا تعارف ہم نے پہلے کرایا ہے۔ وڈیرے زبردستی کے بن گئے ہیں۔ پیسہ تھا باہر گئے اور زور دکھایا۔ ان کا جھگڑا ایک مہوند کے وڈیرے سے ہو گیا۔ یہ غریب۔ جب پہلی مرتبہ ۱۹۱۴ء میں حکومت آئی تو سرکار کا وفادار بن گیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ حکومت آکر جا بھی سکتی ہے۔ جب "ون" کی واپسی ہوئی تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ مری رواج کے مطابق کلام مجید اور اپنی بیوی کے ساتھ حاضری دی اور معافی چاہی۔ جواب ملا "خدا کو میں نہیں مانتا بندوق میرا خدا ہے اور گولی میرا قانون"۔ اس "اپ اسٹارٹ" وڈیرے کو جانے دیجیے عام آدمی کی بات کرتے ہیں تو بھی یہ رواج قائم ہے۔

م : جنگ کے دوران مندرجہ ذیل پر ہاتھ نہیں اٹھایا جاتا

۱ : اگر مجرم کسی زیارت کی حدود میں داخل ہو جائے۔ یہ بندش صرف حدود کی حد تک ہے۔

۲ : اگر حریف منہ میں گھاس رکھ کر آجائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہار مان لی گئی ہے۔ اکثر منہ میں مٹی بھر کر بھی سامنے آموجود ہوتے ہیں کہ قصور معاف کر دو۔

۳ : معافی مانگنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ پگڑی بجائے سر پر پہننے کے گلے میں بھی لپیٹ لی جاتی ہے ۔

۴ : عام اور سادہ طریقہ ہار ماننے کا یہ ہے کہ سامنے زمین پر ہتھیار پھینک دیے جاتے ہیں ۔

۵ : آج کل کے ماڈرن طریقے کے مطابق سفید جھنڈا کھڑا کر دیا جاتا ہے ۔ جھنڈا اگر نہ ملا تو کوئی بھی سفید کپڑا اونچی جگہ کھڑے ہو کر زور زور سے ہلا دیا جاتا ہے ۔

۶ : اگر کوئی عورت ، سید ، ہندو یا کوئی بھی شخص سر پر کلام پاک رکھ کر بیچ بچاؤ کے لئے درمیان میں آجائے تو جنگ چاہے کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو ایک دم بند کر دی جاتی ہے ۔

۷ : زانی کی سزا ہمیشہ موت ہوتی ہے بشرطیکہ یہ حرکت ہم پلّہ فرقے کے ساتھ کی گئی ہو بات دل کو نہیں لگی ۔ جرم تو پھر جرم ہے ۔ وڈیرہ کی طرح غریب بھی تو انسان ہوتا ہے ۔ بس رواج ہے ۔

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

جنگی تدابیر
KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

" خَلق "

KUTUBKHANA JALALI BOOKS JALALI

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS

جنگی تدابیر

جنگی رواج کا جائزہ تو آپ نے پڑھ لیا۔ اب اسی پس منظر میں ان کی جنگی تدابیر کی بھی وضاحت کرتے ہیں۔ ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان حالات اور ماحول میں اس سے بہتر تدابیر نہیں ہو سکتیں۔ ایسا ہو بھی کیوں نہ۔ یہ آج کی بات تو نہیں صدیوں کا ورثہ ہے۔ رہونڈ کو ہلو سے تقریباً پچاس میل پر واقع ہے اور یہ جگہ مری علاقے کے وسط میں ہے۔ یہ ذکر اُس وقت کا ہے۔ جب کوہلو میوند سڑک بن رہی تھی مگر فوجی گاڑیں آجا سکتی تھیں۔ علاقہ غیر محفوظ ضرور تھا۔ اس سڑک پر اکثر حادثات رونما ہوتے ہیں۔ میں شام کو میوند ٹہلنے کے لئے نکلا۔ یہ کچھ عادت سی ہے کہ اگر ورزش نہ کی جائے تو طبیعت مضمحل ہو جاتی ہے۔ شام کو ذرا چہل قدمی کر لی۔ لوگوں سے مل لیا۔ اس طرح نیند بھی اچھی آتی ہے۔ مجھے اکیلا دیکھ کر ایک مری دوست بھی ساتھ ہو لیے کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں پھر یکدم خاموش۔ چہل قدمی جاری رہی۔ سوچ کر بولے "آپ کو پتہ ہے کہ شیر کتنا بہادر جانور ہے۔ جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے۔ جب سوتا ہے تو ایک کان زمین پر رکھکر"۔ بڑا غور کیا کہ اس جملے کا موضوع گفتگو سے کیا تعلق۔ اچانک یہ بات ان کے ذہن میں کیوں آئی؟ دوست یہ جملہ کہہ کر پھر خاموش ہو گئے۔ ہمارا تجسس بڑھا۔ بھائی میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" کہنے لگے کہ "شیر زمین پر ایک

کان اس لیے رکھکر سوتا ہے کہ اگر کوئی دشمن قریب آتا ہو تو اسے آہٹ پہنچ جائے۔ یہ بہادری نہیں کہ اکیلا آدمی اس ماحول میں اس طرح گھومتا پھرے۔ آپ کے کندھوں پر بڑی ذمہ داری ہے۔ احتیاط ہمیشہ لازمی ہے۔ دشمن اس وقت وار کرے گا جب کہ قطعاً آپ کو اُس کی اُمید نہ ہوگی۔ بات سولہ آنے کھری تھی "جناب آپ جو ہمارے ساتھ ہیں" میں نے فوراً جواب دیا " ہم تو آپ کو اکیلا دیکھ کر آ گئے۔ آپ نے کون سا ہمیں بلایا تھا۔" صفائی کرتے نہ بن پڑی۔ ہمارا اکیلا ٹہلنا کوئی بہادری کی بنا پر نہ تھا۔ بس خیال ہی نہیں آیا۔ بہادری اور ہمت۔ من آنم کہ من دانم۔ اللہ پاک پردہ رکھے۔ آمین ثم آمین۔ اس چھوٹے سے قصے میں مری جنگی تدابیر کا فلسفہ مضمر ہے۔ بلکہ کافی حد تک فنِ سپاہ گری کی کامیابی اسی راز میں پنہاں ہے۔ کافی سوچنے کا مقام ہے۔ جب بھی کوئی یہاں کارروائی کرتا ہے تو یہ قصہ ہم اسے ضرور سناتے ہیں۔

جنگ لڑنے کے اصول ہوتے ہیں جنہیں انگریزی میں PRINCIPLES OF WAR کہا جاتا ہے۔ دنیا کی تمام افواج کے اپنے اپنے اصول ہیں۔ ویسے سارے ہی مشترک ہیں بس اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے یار لوگوں نے کچھ گھٹا دیئے کچھ بڑھا دیے۔ لفظ تبدیل کیے۔ مفہوم ایک ہی رہا۔ ان اصولوں کی بات چھوڑیئے بات یہاں کی کیجئے یہاں کے ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے اپنے اصولوں کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ یہ اصول کچھ اس طرح ہیں:

: لڑائی جہاں تک ممکن ہو اپنے علاقے سے باہر ہونی چاہیے۔ مطلب یہ کہ اگر گھات لگانی ہو یا چھاپہ مارنا ہو تو اپنے علاقے سے ہٹ کر دوسرے قبیلے کے علاقے میں کیا جائے۔ ان کی زیادہ تر وارداتیں اپنے علاقے سے ہٹ کر ہی ہوتی ہیں۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ان کا اپنا ایک پرانا رواج ہے۔ جس کا ہر ایک سختی سے پابند ہے۔ اگر کسی علاقے میں کوئی واردات ہو جائے تو جس کا گھر نزدیک ہوتا ہے یا واردات کرنے والوں کے جہاں کہیں بھی سُراغ کے نشان ملتے ہیں وہاں کے لوگوں کو پکڑ لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یا تو تم چور ہو یا چور کو پکڑ کر دو۔ ان کے اکثر و بیشتر آپس کے جھگڑے اسی اصول پر طے ہوتے ہیں۔ جب سراغ رسانی کی بات شروع ہوئی گئی ہے۔ تو ذرا اس کی وضاحت کر دی جائے۔ روایت کے مطابق ہر ایک اس کام میں ماہر نہیں ہو سکتا۔ یہ تو خداداد

چیز ہے' اس کے ایک مانے ہوئے ماہر ہمارے بڑے جگری دوست ہیں۔ ان کا نام میر ہزار خاں کنگرانی ہے۔ یہ اپنے فرقے کے وڈیرے بھی ہیں ماشاءاللہ سات بیویاں بھی ہیں۔ ان کا تعلق سراغرسانی سے نہیں ہے۔ ہزار خان کا کہنا ہے کہ جب تک میرا دل نہ کہے میں یہ کام نہیں کرتا۔ کریں بھی کیوں؟ یہ ان کا پیشہ نہیں ہے۔ بلکہ مشغلہ ہے۔ یہ قدموں کے نشان دیکھکر سال بھر پرانی بات کا بھی سراغ لگا سکتے ہیں۔ ان کا ایک واقعہ ہے کہ کوہلو کے اسسٹنٹ کمشنر کہیں کام سے گئے تو انہوں نے جنگل میں کیمپ لگایا۔ ساتھ میں میر ہزار خان بھی تھے۔ ہزار خان نے زمین پر کچھ دیکھا اور کہنے لگے "آپ ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں" تھوڑی دیر بعد ایک چاندی کا پیالہ لیے واپس آگئے۔ پتا چلا کہ سال بھر پہلے مال چرائی کے سلسلے میں یہاں کیمپ لگایا تھا۔ اس وقت ان کا چاندی کا مکھن رکھنے کا پیالہ گم ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس وقت گیدڑ کے پیر کے نشان دیکھے۔ اور کھوج لگاتے لگاتے پیالہ لے آئے۔ ان کے اور بھی واقعات مشہور ہیں۔ جہاں ایسے لوگ ہوں وہاں حریف کا پیچھا کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ جناب یہ تو قدموں کے نشان دیکھکر یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ آدمی کا حلیہ کیا ہے اور کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ ذکر پہلے جنگی اصولوں کا ہو رہا تھا کہ جنگ جہاں تک ممکن ہو اپنے علاقے میں نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی ایک وجہ بیان کر دی گئی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر اپنے علاقے میں جنگ ہو تو زیادہ نقصان بھی اپنا ہی ہوتا ہے۔ گناہ گار اور بے گناہ دونوں ہی پھنستے ہیں اور پھر مال علیحدہ برباد ہوتا ہے۔ تیسری اہم بات یہ کہ جارحانہ کارروائی باہر ہی ہو تاکہ لڑائی اپنے علاقے میں نہ پھیل سکے۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ جارحانہ کارروائی ہی سے تسلی بخش دفاع حاصل ہو سکتا ہے یعنی (OFFENCE IS THE BEST DEFENCE) لڑائی لڑو تو دوسرے ملک میں' یہ تو امیر تیمور کا بھی زریں اصول تھا۔ لیکن اگر اپنے علاقے میں لڑائی پہنچ جائے تو مجبوری ہے۔

ب : ہوشیار اور مضبوط دشمن پر ہاتھ ڈالنا بے وقوفی کی دلیل ہے۔ بات بھی درست ہے۔ مضبوط اور ہوشیار دشمن پر ہاتھ ڈالنا دیوار سے سر ٹکرانے کے مترادف ہے۔ اس اصول کے درپردہ ناگہانیت یعنی (SURP RISE) پر زور دیا گیا ہے۔ دشمن بے شک مضبوط بھی ہو۔ اگر وہ چوکنا نہیں ہے تو اس پر ہاتھ ڈالنے

میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ناگہانیت (SURPRISE) تو ہر ایک قوم کا مانا ہوا جنگی اصول ہے۔ اس اصول کے اطلاق میں اہم بات تو یہ ہے کہ کسی اور قبیلے کے علاقے میں آپ چوکنے نہیں ہوتے۔ آپ کو فکر تو صرف مری علاقے کی ہے۔ یہ ناگہانیت جگہ کی ہوئی۔ اس طرح وقت کا بھی تعین ہوتا ہے۔ روزانہ آپ ایک کام خاص وقت پر کرتے ہیں۔ جو کہ نہیں کرنا چاہیے مگر ہوتا ہے۔ جیسے گاڑیاں سڑک پر حفاظت مہیا کرنے والے دستوں کو صبح لے جاتی ہیں اور شام ہونے سے پہلے کیمپ میں واپس لاتی ہیں اب ہفتوں کوئی واردات نہیں ہوگی۔ لوگ احتیاط سے غافل اور اسی دن واردات۔ جگہ اور وقت کی وضاحت ہوگئی۔ اب ناگہانیت کا اطلاق طریقے کے بارے میں ملاحظہ کیجیے۔ ہر واردات کا طریقہ جُدا اور انداز نرالا۔ سابقہ طریقہ کو بہت کم ہی دہرایا جاتا ہے۔

ج : کارروائی پوری تیاری سے کی جائے۔ اس وقت تک دشمن پر ہاتھ نہ ڈالا جائے جب تک سو فیصدی کامیابی کا یقین نہ ہو۔ یہ ان کا سب سے سُنہرا اصول ہے۔ بات بڑی صبر آزما ہے اسی لیے یہ بہت صابر بھی ہیں۔ دنوں بلکہ ہفتوں تک تاک میں بیٹھے انتظار کرتے ہیں۔ اس وقت تک شکار پر ہاتھ نہیں ڈالا جاتا جب تک کامیابی کا کامل یقین نہ ہو۔ آپس کے لڑائی جھگڑوں میں بھی یہ اصول ہمیشہ مدِ نظر رہتا ہے۔ ایک مری دوست اپنے ایک حریف کا قصہ سنانے لگے۔ اسے ختم کرنے کے لیے انہیں سال بھر تک کوشش کرنی پڑی۔ کبھی حریف زیادہ نفری کے ساتھ نظر آیا۔ کبھی وقت کی غفلت ہوگئی۔ کبھی حالات سازگار نہیں۔ آخر میں ایسا پھنسا کر دنیا حیران رہ گئی۔ مری "حالہ" کے باوجود مہینوں پتہ نہ چلا کہ واردات کس نے کی تھی۔

د : کارروائی تیزی سے ہونی چاہیے اور جائے واردات سے جلدی غائب ہونا ضروری ہے کہ جب بھی یہ اپنے ہدف پر فائر کھولتے ہیں تو سارے اکٹھا والی VOLLEY کی شکل میں۔ فائر بہت ہی تند اور تیز ہوتا ہے۔ عموماً جائے واردات سے تھوڑی دور گھوڑے ہوتے ہیں۔ فائر کی تیزی آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جاتی ہے۔ پھر اپنے گھوڑوں پر سوار اور غائب اب ہر ایک کے پاس تو گھوڑے ہوتے نہیں۔ اگر لوگ پیدل ہوئے تو کارروائی کی اور تیزی سے کھسکنے کی کوشش کی۔ علاقہ دشوار گزار

چُنا جاتا ہے تاکہ آسانی سے پیچھا نہ کیا جاسکے۔ اگر پیچھا کرنے والوں نے پکڑ لیا تو ہتھیار چھپانے کے بعد قراری بن گئے۔

ل: اونچائی کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے اور ہر وقت ہوشیار رہنا چاہیے چونکہ علاقہ زیادہ پہاڑی ہے اس لیے یہ لوگ چھپ کر نہیں بیٹھتے۔ ورنہ اِن آدمیوں کا نظر آنا ناممکن ہے۔ اس طرح اپنے آپ کو چھپانے ہیں کہ آپ نے اُن کے سر پر بھی پہنچ جائیں تب بھی اُن کا پتہ چلانا مشکل ہے ان کے پاس دوربین اور رائفل کا ہونا ضروری ہے۔ یہ لوگ علاقے میں دیکھ بھال رکھتے ہیں۔ اسی طرح علاقے پر نظر رکھنا ضروری امر ہے۔ اب ہر ایک سے ہی تو تعلقات استوار نہیں ہوتے پاس پڑوس والوں سے ویسے بھی جھگڑے لگے رہتے ہیں۔ اب کسی اجنبی کو آتے دیکھا تو باقی آدمیوں کو شیشہ مار کر پگڑی ہلا کر یا دھواں پیدا کر کے ہوشیار کر دیا۔ انہوں نے اپنی مقررہ جگہیں سنبھال لیں اور یہ سب جنگ کے لیے تیار۔ یہ تو دفاعی پہلو ہوا۔ اِس طرح دیکھ بھال قائم رکھکر جارحانہ کاروائی بھی کی جاتی ہے۔ اپنے حریف کی نقل و حرکت کو نظر میں رکھا۔ جب موقع دیکھا منصوبہ بنایا اور بول دیا دھاوا۔ یہاں کے ماحول اور طریقے کو دیکھتے ہوئے، اس طرح 'دیدبانی' کا رواج بیحد ضروری ہے۔ ہر ایک کے پاس اپنی بھیڑ بکریاں ہوتی ہیں۔ ان کی حفاظت بھی لازمی ہے۔ پھر چراگاہوں پر اکثر جھگڑے رہتے ہیں۔ بھیڑ بکریاں چراگاہ میں چھوڑیں اور اونچی جگہ پر دوربین لے کر بیٹھ گئے نظر، مال اور اپنے بیوی بچوں پر۔ پھر آئے کون آتا ہے۔ چاہے امن ہو یا جنگ جہاں پر بھی یہ لوگ ہوں گے اونچائی پر دیدبان کا ہونا ضروری ہے اور باقاعدہ مورچہ بنا ہوگا۔ مشکیزہ، روٹی اور رائفل سے لیس یہ رواج تو ہمیشہ سے قائم ہے اور رہے گا۔ جنگ کے علاوہ اپنی حفاظت بھی ضروری ہے۔

م: مناسب کارروائی عمل میں لانے کے لیے صحیح خبر کا مہیا کرنا ضروری ہے۔ خبر فراہم کرنے کے طریقوں کا تو کئی جگہ ذکر ہو چکا ہے۔ مگر یہاں ذرا تھوڑی سی وضاحت ہو جائے۔ ایک طریقہ تو "حال" کا رواج ہے، جو آپ پڑھ چکے ہیں۔ ہر ایک دیدبان کے پاس شیشہ، پگڑی، لائٹر اور دوربین کا ہونا

ضروری ہے۔ اگر دھوپ ہو تو شیشہ ہلا کر مختلف اشارے کیے جاتے ہیں۔ اس شیشے کی چمک میلوں سے نظر آتی ہے اگر فاصلہ زیادہ نہ ہو اور دھوپ بھی کم ہو تو پگڑی کو مختلف انداز میں ہلا کر پیغام دیا جاتا ہے جہاں یہ دونوں چیزیں کام نہ کر سکیں۔ مثلاً بیچ میں کوئی پہاڑی سلسلہ آجائے تو لائٹر سے آگ جلائی اور مختلف انداز میں دھواں پیدا کر دیا جو میلوں سے نظر آتا ہے۔ یہاں کا لائٹر بھی خوب چیز ہے۔ پٹرول گیس کی کوئی ضرورت نہیں اور پھر سب سے بڑی بات ہر ایک فنی خرابیوں سے مبرا، گتھی میں دو پتھر ہوتے ہیں اور ایک لوہے کا ٹکڑا جسے چکماک بھی کہتے ہیں پتھر کو لوہے پر رگڑا، چنگاری پیدا ہوئی۔ چنگاری کے قریب "پیش" کا گولا ہوتا ہے جو فوراً آگ پکڑ لیتا ہے "پیش" جسے اکثر "مزری" بھی کہا جاتا ہے ایک قسم کا پام کا درخت ہوتا ہے۔ جس کی چٹائیاں بنی جاتی ہیں "پیش" کا ذکر وضاحت سے کہیں اور کریں گے یہاں یہ ذکر کافی ہے کہ اس کے پتوں سے بیش بہا چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ آج کل غیر ملکیوں میں اس کی رنگین چٹائیاں بڑی مقبول ہیں۔ یہاں تو یہ پودا خوب ہوتا ہے مگر کون اس سے فائدہ اٹھائے۔

ن : حریف کے خلاف اگر کارروائی کی جائے تو قبیلوں کو مل کر مدد کرنی چاہیئے۔ اس اصول کا گہرا تعلق رواج سے ہے اگر ایک قبیلہ کارروائی کرے تو جلب نشاندہی فوراً ہو جاتی ہے اور پھر خون بہا دینا ضروری ہوتا ہے۔ اگر نہ دیا گیا تو پھر قبائلی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ ایک کے بدلے ایک اور دس کے بدلے دس اگر حریف طاقتور ہوا پھر ریٹ بھی بڑھ جاتا ہے یعنی ایک کے بدلے دو یا تین بھی ہو سکتے ہیں۔

آج سے پندرہ سال پہلے مری علاقے کا انتظام چلانے کے لیے ایک کونسل آف ایلڈرس (COUNCIL OF ELDERS) یعنی بزرگوں کی مجلس بنائی گئی تھی۔ اس مجلس کے نو رکن تھے اور سارے اپنے قبیلوں کے بڑے۔ ان کے سربراہ دوداخان جو کہ موروثی سردار کے چچا تھے، مقرر کیے گئے۔ جب ۱۹۶۴ء میں تین اور اراکین سمیت یہ کہان سے سبی جا رہے تھے تو راستے میں گھات لگا کر قتل کر دیے گئے۔ اس واقعہ کا حوالہ ہم نے پہلے بھی دیا ہے۔ اس کارروائی میں ایک ہی قبیلے کے لوگ نہیں تھے بلکہ یہ مشترکہ کارروائی تھی۔ بلوچی "حال" کے تحت سب کو معلوم ہے کہ کون کون اس میں شامل تھا اس کے بعد قبیلوں کی آپس میں لڑائی نہیں

ہوئی اور نہ ہی خون بہا کا سوال ۔ یہی حال دورِ حاضر میں ہوا ۔ جو جزدی قبیلے تخریبی کارروائیوں سے علیحدہ بھی رہنا چاہتے تھے وہ ایسا نہ کر سکے ۔ قبائلی رواج کے تحت سب کا شامل ہونا ضروری اگر کسی نے انکار کیا تو خیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے چاروناچار "قراری" اور "فراری" برابر کے شریک جان بوجھ کر نہیں بلکہ رواج کے تحت "اس طرح مشترکہ کارروائی سے مالِ غنیمت کی تقسیم پر بھی آسانی ہوتی ہے اگر خدانخواستہ کوئی کارروائی کرنے والا پکڑا بھی جائے تو باقی ماندہ مال کا ملنا مشکل ۔ جب حالات خراب تھے تو بارکھان کے علاقے سے تخریب کار ڈیڑھ سو بھیڑیں لے گئے آخر ان لوگوں نے بھی تو رہنا تھا کھانے پینے کا بندوبست بھی ضروری تھا ۔ بارکھان میں کھتران رہتے ہیں اور یہ مال بھی انہیں کا تھا ۔ بھیڑیں لے جانے والے میں سے ایک جزدی قبیلے کا سراغ ملا یعنی وہ "زنگ" تھے ۔ مال کھتران کے ایک وڈیرے کا تھا ۔ لہٰذا وڈیرے نے زنگ کے وڈیرے سے بات کی زنگوں نے کہا ہمارے حصے میں تو بیس بھیڑیں آئی ہیں تو تم وہ لے جا سکتے ہو ۔ ٹھنگیانیوں اور مندانیوں سے وصول کرو ۔ ان سے رابطہ کیسے قائم ہو ۔ وہ تو آج یہاں کل وہاں ۔ اگر زیادہ عرصہ گزر جائے تو چوری کا مال کون اپنے پاس رکھتا ہے ۔ بیچ کر صاف کیا باقی مال نہیں مل سکا ۔ یہی حال تخریبی کارروائیوں کا ہوتا رہا ہے ۔

یہ تو ہو گئے اصول اب ذرا تدبیر پر بھی نظر ڈالتے ہیں ۔ ہمارے ایک دوست بہت ہی عزیز دوست ہیں پہلے وہ زمانے کے مانے ہوئے فراری تھے ۔ یہ لوگ دوست بنانے میں بڑی احتیاط کرتے ہیں اور پھر جب کسی سے دوستی کرتے ہیں تو نبھاتے ہیں ۔ ایک دفعہ دوستی ہو گئی تو پھر کوئی پردہ نہیں رہتا ہم نے ان سے استدعا کی کہ کتابیں آپ لوگوں کے متعلق بہت پڑھی ہیں ۔ ۔ ۔ اور پھر مقابلے بھی اکثر ہوئے ہیں ۔ ہم ٹھہرے پیشہ ور سپاہی کچھ تجسس سا ہے ۔ ذرا ہمیں پر ہمیں بتائیں کہ آپ گھات کیسے لگاتے ہیں ۔ مسکرائے کہ جانے دیں ان قصوں کو ۔ یہ باتیں تو آئی گئی ہو گئیں ۔ اب ذکر کریں ترقی کے منصوبوں پر ۔ یہ کام تو ہو رہے ہیں ۔ ہم سے جو کچھ بن پڑتا ہے کر رہے ہیں ۔ سگریٹ کا ایک کش لگایا اور سوچ کر بولے ۔ آپ نے جو کتابوں میں پڑھا ہے ٹھیک ہے مگر اب ذرا سا فرق ہو گیا ہے ۔ ہم لوگوں کے تربیت کے کیمپ ۱۹۶۲ء میں لگے تھے ۔ باہر سے بھی سکھانے والے آئے تھے ۔ اب یہ معلوم نہیں کون تھے ایک سے تو ہم نے بھی تربیت لی ہے "اب ذرا ہمارے کان کھڑے ہوئے

کان کھڑے ہونے والی بات بھی تھی۔ کیونکہ یہ افواہیں ہم نے پہلے بھی سُنی تھیں کہ جناب کیمپ لگے اور تربیت ہوئی۔ سب سے پہلے کیمپ تدر کی پہاڑی پر لگا جو کہ مہوند سے بالکل قریب ہے یہ ہی وہ جگہ ہے جہاں سے انگریز نیل نکالتا تھا۔ جب یہ کیمپ کھلا اس زمانے میں یہاں آنا جانا آسان نہ تھا۔ صرف پیدل یا گھوڑوں ہی پر آمد و رفت ہو سکتی تھی۔ اس کارروائی میں اَپ اسٹارٹ قسم کے وڈیرے پیش پیش تھے۔ روایتی لوگ بھلا کب اس کو پسند کرتے۔ طاقت کا توازن ذرا بگڑتا نظر آیا طاقت کے توازن کی بات بین الاقوامی سطح پر ہی نہیں ہوتی بلکہ بین القبائلی معاملوں میں یہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ خاص طور پر اس قسم کی سوسائٹی میں۔ سامان آیا مشیر آئے اور تربیت شروع ہوئی۔ یہ حالات دیکھ کر کچھ روایتی وڈیروں نے سازش کی اور سامان میں آگ لگوا دی۔ زبردست دھماکے ہوئے دھماکے شہروں ہی میں نہیں بلکہ یہاں بھی ہوئے تھے۔ ویسے یہ شہروں میں ہونے سے پہلے ہوئے تھے بات بڑھی اور پھر آپس میں لعن طعن۔ جن پر شک ہوا قتل کی سازشیں اور کچھ کیفرِ کردار تک پہنچایا بھی گیا یکجہتی بگڑتی نظر آتی تو آپس میں صلح صفائی کی کوشش بھی کی گئی مگر تھوڑا بہت رخنہ پڑا۔ کیمپ کو سونڈ تھل کے پہاڑ پر منتقل کر دیا گیا۔ آپس میں لڑائی جھگڑے کہاں نہیں ہوتے مگر قبائلی روایات کچھ ایسی ہوتی ہیں جن کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے یہ باتیں جلد ہی رفع دفع ہو جاتی ہیں بشرطیکہ انہیں ہوا نہ دی جائے۔

اب ذرا ذکر مشیر یا انسٹرکٹر کا ہو جائے، ان میں سے ایک جو پیش پیش تھے۔ مغربی نژاد کے پستہ قد، گٹھا ہوا کسرتی بدن، منہ پر ہلکے ہلکے چیچک کے داغ کہنے والے کہتے ہیں کہ گرمیوں میں ہمیشہ ننگ دھڑنگ رہتے تھے۔ صرف نیکر کے قسم کی ایک چیز زیبِ تن ہوتی تھی۔ اکیلے ایک جھگی میں رہتے تھے داڑھی بڑھی ہوئی۔ انہیں صفائی کا کوئی خاص خیال نہ تھا۔ مغربی انداز پر تربیت شروع کی کہ کس طرح بغیر رسد کے گزارہ کیا جا سکتا ہے۔ یعنی کبھی سانپ پکڑ لائے، اسے کھانے کا نسخہ بیان کیا۔ کبھی گیدڑ پکڑ کر پیٹ کی آگ بجھانے کی ترکیبیں بتائیں۔ یہ باتیں مسلمانوں کو کب پسند آسکتی تھیں۔ اَپ اسٹارٹ قسم کے وڈیرے ساتھ ہوتے جو کہ ان کی زبان سمجھتے۔ کام ختم ہونے کے بعد دونوں جھگی میں اور شراب کا دور۔ لوگوں کو یہ بات پسند نہ آئی۔ یہ کیا واہیات حرکت ہے حرام کھاؤ اور حرام پیو۔ معاملہ بگڑتا دیکھ کر

اس کو چھوڑا اور شروع ہوا ۔ تدبیروں کا سکھلانا ۔

جانے دیجیے اِن باتوں کو ہم تو سیدھے سادھے پاکستانی ہیں ہمارا ایمان اور جان ہی پاکستان ہے اپنے اندر جب کمزوری ہو تو باہر والے فائدہ اٹھاتے ہی ہیں ۔ جیسی دوستی اب ہے ۔ اگر پہلے ہوتی تو یہ نوبت کیوں آتی ۔ جو ہُوا سو ہُوا ۔ آئندہ کا خیال ضروری ہے آپ ہی ایک پاکستان کے ٹھیکیدار کہاں سے آ گئے سب ہی محب وطن ہیں ۔ کس کو اپنے وطن سے پیار نہیں ہوتا ۔ ہوتا تو ہے مگر اپنے اپنے نظریئے کا تجزیہ صحیح حالات دیکھکر ہی کیا جا سکتا ہے ۔ لیجئے ہم علیحدہ ہو گئے جو ہم نے دیکھا ' اپنی آنکھ سے پڑھا اور کانوں سے سُنا بیان کر دیا اور کرتے جا رہے ہیں ۔ آپ کی مرضی جو آپ نتیجہ اخذ کریں لیکن خدارا پاکستان کی سلامتی اور فلاح کو سامنے رکھیئے ۔ آپ کو ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کا واسطہ ۔ ایک صدمہ تو سہہ چکے ہیں اب دوسرے کی سکت نہیں ۔ " میں " کو ذرا ایک طرف کر دیں بے شک تھوڑی دیر کے لیے ۔ اس سے اچھی کیا بات ہے ۔ اگر " میں " کی جگہ پاکستان لے لے ۔

ذکر تدبیروں کا ہو رہا تھا اور ہمارے مری دوست کا ۔ ہم انہیں منزئی لے گئے یہ جگہ دُکی سے تقریباً تیس میل پر واقع ہے ۔ لورالائی کوہلو کی سڑک ادھر ہی سے گزرتی ہے ۔ منزئی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے ۔ یہاں پر آبادی تمام " لونی " پٹھانوں کی ہے اور یہ انہیں کا علاقہ ہے مری علاقے کی حد یہاں سے کافی دور ہیں مگر جہاں بھی چراگاہ ہو ۔ انہوں نے تو اپنا مال چرانا ہے ۔ پھر پڑوسی قبائل اسی میں اپنی خیر سمجھتے ہیں کہ ان سے تعلقات خوشگوار رہیں ۔ اس خیر اندیشی میں ڈر کے ساتھ ساتھ معاشی حالات کو بھی دخل ہے ۔ مری اپنا مال اور اون انہی لونیوں کو فروخت کرتے ہیں اور پھر اس کے بدلے ضروریاتِ زندگی بھی انہی سے حاصل کرتے ہیں ۔ لونی پٹھان کافی کھاتے پیتے لوگ ہیں زمینیں ہیں ' باغات ہیں بسیں اور ٹرک بھی چلتے ہیں ۔ جب پیسہ ہو تو لازمی یکجہتی میں بھی فرق پڑتا ہے ۔ ویسے اُن کے اپنے سردار بھی ہیں مگر سردار برائے نام ۔ تعلیم والی بات ہوئی نا ۔ ہر ایک معاشی تگ و دو میں مصروف ۔ پھر ہے بھی SETTLED AREA یعنی یہاں پولیس اور حکومت کا بھی دخل ہے ۔ آپس میں لڑائیاں ہوئیں مقدمے درج کرایا اور تفتیش شروع ۔ پھر سردار کی بات کون مانتا ہے ۔ اگر مری قبیلے سے جھگڑا ہو تو کون سُنتا

ہے۔ حکومت اور پولیس بھی مجبور۔ ابھی تو نہیں لیکن آج کل کے حالات سے پہلے ضرور تھی۔ خود لڑنا ذرا
مشکل۔ گھر بار چھوڑ کر کون پہاڑوں میں ان کا پیچھا کرے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ جیسے بگٹی مری قبائل
کے ساتھ صلح و آشتی قائم ہے۔ تو وہ رہتی ہے۔ ویسے لونیوں، زرقونوں اور آس پاس کے قبائل کو
کافی گلہ ہے کہ ان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ ان کی زمینیں اور چراگاہیں ان سے جاتی رہیں "شمالگ"
کے علاقے کا مقدمہ ابھی تک چل رہا ہے۔ خود تو کچھ کرنا مشکل اور حکومت ابھی تک بے بس۔ لڑائیاں
بھی ہوئیں مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔

منزئی سے کوئی تین چار میل پہلے سڑک کے کنارے پہاڑیاں شروع ہوتی ہیں۔ علاقہ خاصہ غیر آباد
ہے ہم نے اپنے دوست سے کہا کہ اب بتائیں کہ یہاں پر پچھلی گرمیوں میں جو آپ لوگوں نے ہماری گاڑیوں
پر گھات لگائی تھی۔ اس کی کارروائی کس طرح کی گئی تھی۔ اس حادثے میں ہمارے پانچ جوان شہید ہوئے
اور اتنے ہی زخمی آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ ایسے حادثے کے بعد دوستی کا یہ عالم تو جناب بھائی کو اگر بھائی
سمجھتے ہوئے ساتھ ملانا ہے تو اس کی خامیوں کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ اور جائز تکلیفوں کا بھی تدارک لازمی
ہے۔ پھر سب سے بڑی بات آپ میں بھی تو خامیاں ہوں گی۔ ان کو بھی ٹٹولیے۔ دوستی کے سلسلے میں قربانیاں
دینے کے لئے بھی تیار رہیے۔ لڑائی اور جبر سے تو وحشت اور غارتگری جنم لیتی ہے۔ محبت سے قربت قائم ہوتی
ہے اور اخوت پیدا ہوتی ہے۔ یہ راستہ دشوار گزار ضرور ہے مگر نیک نیتی سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ محبت ہی
سے لوگ خدا کو بھی پا لیتے ہیں۔ محبت ہی معراج ہے۔ پھر فلسفے میں پھنس گئے۔ قصہ سناؤ اور بات ختم
کرو۔ دل کو لگی ہو تو بات کیسے مختصر ہو سکتی ہے۔

اس پہلے کہ ہم اپنے دوست کی روئیداد بیان کریں آپ ہماری بھی سن لیں۔ جب دن خراب تھے تو
ہماری گاڑی ہفتے میں دو دن لورالائی سے کوہلو آتی تھیں۔ گاڑیاں کانوائے کی صورت میں ہوتی تھیں کانوائے
سے مراد یہ کہ گاڑیاں اکٹھی سفر کرتی تھیں۔ ان پر راشن ہوتا تھا۔ فوجی اور اکثر اوقات عام آدمی بھی سفر
کرتے تھے۔ گاڑیوں کے آگے اور پیچھے محافظ دستے کا ہونا لازمی تھا۔ دستے میں تعداد تیس چالیس ہوتی
ہوگی۔ اب اگر کانوائے میں تیس گاڑیاں ہوں تو یہ ایک میل سے زیادہ فاصلے تک پھیل جاتی تھیں لورالائی

سے کوھلو تک کا سفر تقریباً ایک سو میل سے زیادہ بنتا ہے۔ اگر پورا راستہ مکمل طور پر محفوظ کرنا ہو تو جناب پھیلایئے آدمیوں کو سو میل سے اوپر تک کتنی فوج لگے گی۔ اب مری علاقے میں یا اس تک پہنچنے کے لیے بھی ایک سڑک تو نہ تھی بلکہ ماشاءاللہ کافی سڑکیں بن چکی ہیں۔ ان دنوں یہ ہی کیا جاسکتا تھا کہ صرف اہم مقامات پر دستے تعینات کیے جائیں اور چوکیاں قائم ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس علاقے میں یہ خیال وگمان ہی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہاں حادثہ درپیش آسکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ علاقہ بھی مریوں کا نہیں SETTLED AREA ہے۔ اس کی ذمہ داری یہاں کے سردار اور لیوی کی ہے۔ جن کے تعلقات پہلے ہی مری قبائل سے کوئی استوار نہیں۔ بہرحال پھر بھی احتیاط کی گئی۔ حفاظتی دستہ ساتھ تھا۔ چوکیاں بھی تھیں مگر دور۔ نفری دیکھتے ہوئے یہی کچھ کیا جاسکتا تھا۔

ہمارے دوست جائے واردات کو دیکھکر مسکرائے اور کہنے لگے۔ "مغرب کی جانب سے آپ سہالو کا پہاڑ دیکھتے ہیں۔ یہ پہاڑ جائے واردات سے پندرہ میل دور ہے لیکن اگر موسم صاف ہو اور دوربین اچھی ہو تو اس سڑک پر حرکت سہالو سے نظر آتی ہے۔ ہم نے وہاں چڑھکر خود آزمایا ہے۔ ہم لوگ اس علاقے کے رہنے والے ہیں۔ مال چرائی اس علاقے میں بھی کرتے ہیں۔ چرائی کے لئے ہم کٹ منڈائی جو کہ بستی کے پاس ہے، وہاں سے شروع ہوکر کے سہالو سے ہوتے ہوئے شملانگ جانکلتے ہیں" انہوں نے ایسے بیان کیا کہ جیسے یہ سارا فاصلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تقریباً دو سو میل کا سفر ہوگا۔ بات سہالو اور شملانگ کی تھی شملانگ لسڑئی سے مشرق کی جانب تقریباً بتیس میل پر بڑی چراگاہ ہے۔" ہمارے آدمی کافی عرصہ تک ان گاڑیوں کی حرکت کو دیکھتے رہے پہلے اس حرکت کا جائزہ سہالو سے کیا گیا۔ پھر قریب آکر ہمارے دیدبان بیٹھے اِن لوگوں پر آپ کو شک کیسے ہوتا۔ اِن کے ساتھ بھیڑ بکریاں ہوتی تھیں اور نظر بھی نہتے آتے تھے۔ ہمیں پتہ لگا کہ آگے اور سب سے پیچھے والی گاڑی پر گارڈ ہوتی ہے اور باقی گاڑیوں پر سامان اور کچھ آدمی جو سفر کررہے ہوتے ہیں اب آپ مشرق کی جانب نظر ڈالیں تو تمام پہاڑ ہیں اور یہ سلسلہ کافی دور تک چلا جاتا ہے اور مغرب کی جانب میدان۔ آخر میں یہ طے پایا کہ یہ جگہ گھات کے لیے موزوں ہوگی۔ ہم سہالو سے چلے اور یہاں سے پانچ میل مشرق کی طرف پہاڑیوں پر قیام کیا۔" ہم جب کبھی ایسی واردات کرتے ہیں تو یہ ایک اکیلا

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

قبیلہ نہیں کرنا۔ ہمارے ساتھ تیس اور جزوی قبائل کے آدمی تھے۔ تیس ہمارے اپنے اور بیس بیس دوسرے قبیلوں کے۔ چلنے سے پہلے ہم وڈیروں نے اپنی کانفرنس کی کہ کس طرح کام کرنا ہے پھر اپنے کمانڈر مقرر کیے ہم اپنی کمین گاہ میں تین دن پہلے پہنچ گئے تھے۔ اپنے دیدبان اسی دن سے پاس کی پہاڑیوں میں بٹھا دیئے تاکہ گاڑیوں کی حرکت کو غور سے دیکھا جا سکے۔ پھر ہم تینوں کمانڈروں نے متفقہ طور پر یہ جگہ کارروائی کے لئے چنی۔

اب آپ اگر مشرق کی طرف دیکھیں۔ تو ان پہاڑیوں کے تین سلسلے ہیں۔ ایک تو بالکل سڑک کے ساتھ ساتھ ہے اس پر ہم نے اپنی پہلی ٹولی تعینات کی کہ وہ قریب سے فائر کھولے اور اگر کوئی ہتھیار چھین سکتے ہیں یا کوئی لوٹ کا مال ہاتھ آئے تو جلدی سے اٹھا سکیں۔ دوسرا پہاڑیوں کا سلسلہ بالکل قریب ہے اور نسبتاً اونچا ہے دوسری ٹولی اس پر بٹھائی۔ ان کا کام اگلی والی ٹولی کو فائر سے مدد دینا تھا یعنی جب اگلی والی ٹولی لوٹ مار کرے تو پیچھے والے اتی اور دستوں پر فائر جاری رکھیں تاکہ ان کی کارروائی میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو۔ پھر آپ دیکھ رہے ہیں کہ تیسرا پہاڑیوں کا سلسلہ بہت ہی اونچا اور قدرے دور بھی ہے یہاں پر ہماری تیسری ٹولی تھی۔ ان کا کام یہ تھا کہ جب آگے والی ٹولیاں کام ختم کر چکیں تو ان کی پیشقدمی کے لئے مدد دیں۔ یہ آخری ٹولی سب سے آخر میں اپنی جگہ چھوڑتی ہے۔ تاکہ آپ لوگ پیچھا نہ کر سکیں۔"

"جب ہم نے علاقہ چن لیا اور اپنی تجویز بنالی تو پھر دو رات پہلے آ کر ہم نے پہاڑوں پر مورچے بنائے یہ چھوٹے مورچے اس طرح بنائے جاتے ہیں کہ ظاہر نہ ہو کہ پہاڑیوں میں کوئی ردوبدل کی گئی ہے۔ مورچوں کے سامنے سوراخ چھوڑ دیئے جاتے ہیں تاکہ رائفل کا استعمال بآسانی کیا جا سکے مورچے بنانے سے پہلے ہی دیدبان کی جگہ مقرر کی جاتی ہے۔ یہ دیدبان جائے واردات کے دونوں جانب ہوتے ہیں اور میلوں تک علاقہ دیکھ سکتے ہیں۔"

ہمارے دوست نے اشارہ کرتے ہوئے دیدبان کی جگہ بتائی وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ میلوں سے کسی بھی قسم کی حرکت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ خاص طور سے اگر دوربین پاس ہو۔ پھر یہاں کی سڑکوں پر جب گاڑیاں چلتی ہیں تو گرد کے بادل دور سے اٹھتے نظر آتے ہیں۔

"ہم نے یہ طے کیا کہ آپ کی آگے والی گاڑیوں کو ہدف بنایا جائے گا تاکہ آپ کے حفاظتی دستے مناسب

کارروائی نہ کرسکیں۔ جب حفاظتی دستے گاڑیوں سے اترنے کی کوشش کریں تو پھر بھی فائر کھولا جاسکے۔ جب پہلی دفعہ فائر کھولا جاتا ہے تو پہلے بیس منٹ تک افراتفری ہوتی ہے، یہ وقت ہمارے لئے بہت کافی ہوتا ہے کہ ہم اپنا کام کرکے علاقے سے نکل سکیں، دوسرے دن ہم نے اپنے مورچے سنبھالے۔ یہ کام ہم اندھیرے میں ہی کرتے ہیں تاکہ اندھیرے میں تیاری کرکے ہم دن میں چھپے بیٹھے رہیں۔ یہ دن ہمارا ضائع گیا کیونکہ اس دن کوئی گاڑی نہ آئی۔

تیسرے دن دس بجے ہمارے درمیان نے شیشے سے اشارہ کرکے بتایا کہ تقریباً بیس گاڑیاں آرہی ہیں ہم لوگ تیار ہوکر بیٹھ گئے۔ جب ہدف سامنے آیا تو ہم نے چار گاڑیاں گزرنے دیں۔ اگلی گاڑی میں ملیشیا کے جوان تھے بیچ والی گاڑیوں میں سامان، ان گاڑیوں میں بھی کچھ جوان تھے۔ پہلے ہماری اگلی والی ٹولی کے کمانڈر نے دو گولیاں چلائیں۔ یہ اکٹھا فائر کھولنے کا اشارہ ہوتا ہے اس طرح دو تین منٹ تک تند و تیز فائر جاری رہا۔ پھر اگلی والی ٹولی نے اپنا کام دکھایا۔ اس دن جب فائر کھلا تو آپ کی گاڑیوں میں تیل کے ڈرم تھے اس طرح دو گاڑیوں میں آگ لگ گئی۔ باقی آدمیوں نے اترنے کی کوشش کی تو وہ بھی ہمارے فائر کی زد میں آئے۔ اس گھات میں ایک خامی تھی۔ وہ یہ کہ سڑک کا مغربی علاقہ میدانی ہے۔ پچھلی والی گاڑیاں ادھر بچ کر نکل گئیں۔ "ہمارے آدمیوں نے بھی آپ کے فائر کا جواب دیا ہوگا"۔ "جواب تو دیا مگر ہمارے مورچوں پر کیا اثر ہوسکتا ہے اور پھر ہم اونچائی پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ جب تک آپ کے آدمی گاڑیوں سے اتریں اور ہم پر وار کریں۔ ہمارا کام ختم ہوچکا ہوتا ہے۔ نقصان ہمارا بھی ہوتا ہے مگر اتنا نہیں دراصل آپ لوگ اس طرح لڑائی کے لئے تیار نہیں ہوتے اور گاڑیوں میں بیٹھے ہوتے ہیں وہ بھی چلتی ہوئی گاڑیاں مگر ہم لوگ تو ہر طرح تیار ہوتے ہیں اور آپ کا انتظار ہوتا ہے۔ جب اچانک وار ہوجائے تو سنبھلتے سنبھلتے بھی دیر لگتی ہے۔ آپ کے آدمیوں نے ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش کی۔ ہماری پہلی دو ٹولیاں تو آرام سے نکل گئیں۔ کیونکہ تیسری اور اونچی والی پہاڑی کی ٹولی فائر کرتی رہی اور آپ کے آدمیوں کو اس نے اُن کے قریب آنے سے باز رکھا۔ اب آخری ٹولی تک پیچھا کرنے والوں کو پہنچتے پہنچتے کافی دیر لگی کیونکہ فائر کے دوران اونچائی چڑھنا کوئی آسان کام نہیں۔ آپ خود دیکھیں کہ اگر ایک آدمی بھی اس اونچائی پر بیٹھا ہو تو کیسے اوروں کو اوپر آنے دیگا۔ آخری ٹولی کے لئے پیچھے گھوڑے بندھے ہوئے تھے وہ

گھوڑوں پر سوار ہو کر تیزی سے نکل گئے۔ واردات کے بعد تینوں ٹولیوں نے مختلف راہ اختیار کی اور دوسرے دن شملا ہنگ میں اکٹھے ہوئے۔"

"یار ایک بات بتاؤ جن لوگوں پر تم نے فائر کیا انہیں تم ذاتی طور پر جانتے تھے' ان سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟"

"نہیں صاحب کیا کریں۔ بس جہالت"

"بھائی ایسی کیا جہالت ہوئی۔ کبھی تم نے سوچا کہ جس کو تم نے شہید کیا ان کے بھی بیوی بچے ہوں گے آخر وہ بھی تو انسان تھے۔ وہ بھی پاکستان کے رہنے والے اور مسلمان تھے۔"

"کیا کہیں شاہ صاحب۔ ان باتوں کو مت یاد دلاؤ۔ آپ لوگ ہم سے بہتر مسلمان ہو۔ یہ بات نہ ہوتی تو ہم لوگ کیسے ابھی زندہ ہوتے۔ ہمارے اپنے بلوچی رواج کے تحت ہمیں گولی ماردینی چاہیے۔ گولی مارنا تو درکنار ہم آزاد پھر رہے ہیں۔ بس جہالت۔ دعا کرو کہ اللہ ہمارے گناہوں کو معاف کردے۔"

آپ نے دیکھا ایک کارروائی کا نمونہ یہ واقعات کئی مرتبہ دہرائے گئے ہیں کبھی انجینئروں کے ساتھ سڑک یا پل بناتے وقت یہ حادثات پیش آئے تو کبھی نہتے بے بس اہلکاروں پر برسوں کی تربیت اور وڈیرہ شاہی نے تو رنگ لانا تھا اور سب سے زیادہ ہماری اپنی پرانی بے راہ روی۔ انگریز جو یہ طرز چھوڑ گیا اس کی غلامی۔ غلامی بھی ٹھیک سے نہ ہو سکی۔ زبان سے بھائی کہا مگر اسے گلے نہ لگایا۔

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

KUTUB KHANA
JALALI
حرکیت

پہاڑی کے دامن میں کچھ لوگ ان کیمپوں میں رہتے ہیں
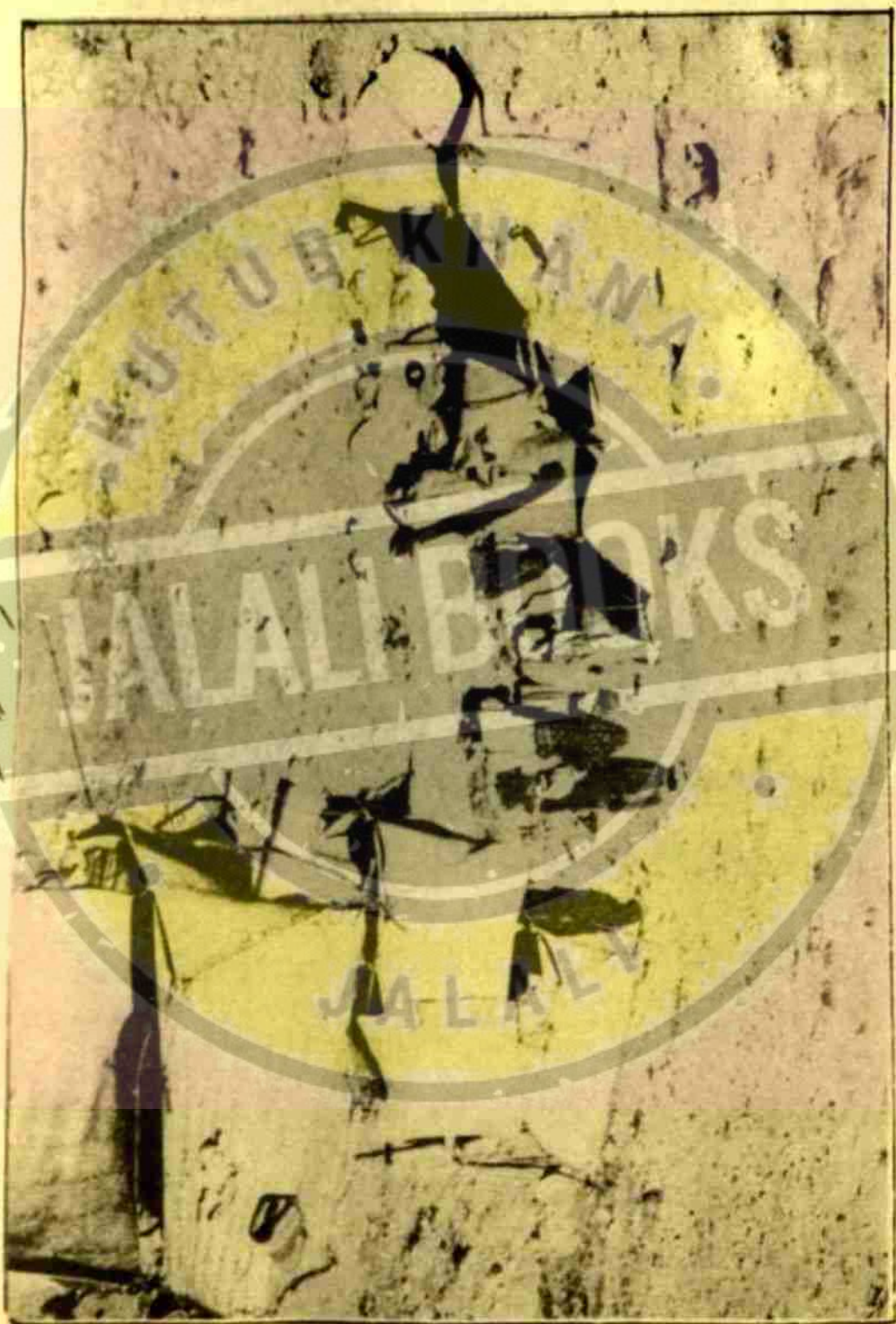
حرکیت

مری قبائل کی کارروائی کرنے کا آپ کو کچھ اندازہ تو ہو گیا ہو گا۔ اِن صلاحیتوں کی تھوڑی وضاحت اور کردی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی لازوری ہے کہ اپنی دشواریاں کسی حد تک بیان کردی جائیں جب تک فنِ سپاہ گری قائم ہے "حرکیت" (MOBILITT) ایک ایسی فوجی اصطلاح ہے جو بہت عام ہے اور اکثر استعمال ہوتی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اب پتہ نہیں کہاں تک اُردو میں "حرکیت" صحیح طور پر موبلٹی کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال یہ ترجمہ میں نے فوجی لغت سے لیا ہے جس میں تکنیکی اصطلاحوں کے ترجمے دیئے ہوئے ہیں۔ "حرکیت" موبلٹی کا ترجمہ دل کو لگا نہیں مگر چلیے اردو کی تو خوبی یہی ہے کہ ایک لفظ اگر رائج ہو گیا تو زبان میں سمو جاتا ہے۔

حرکیت سے مراد ہر حالت میں تیز رفتاری برقرار رکھنے سے ہے۔ اس اصطلاح کو عموماً مقابلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جنگِ عظیم دوم کے دوران شمالی افریقہ کے صحرا میں جرمن فوج کی حرکیت انگریزی فوج سے کہیں زیادہ بہتر تھی۔ یعنی وہ جہاں اور جب چاہتے فرنگی فوج کے مقابلے میں وقت اور فاصلے کے حساب سے پہلے پہنچ سکتے تھے۔ حرکیت کا انحصار زیادہ تر فوجی ساز و سامان کی ساخت پر

بھی ہوتا ہے۔ جرمنوں کی گاڑیاں اور ٹینک بناوٹ کے لحاظ سے صحرا میں تیزی سے چل سکتے تھے۔ پھر ان کی فوج کی تنظیم بھی بہتر تھی۔ یہ تنظیم موقع اور محل کے لحاظ سے ترتیب دی گئی تھی۔ حرکیت کا تعلق ہمیشہ گاڑیوں سے نہیں ہوتا۔ بعض حالات ایسے ہوتے ہیں۔ جہاں سڑک موجود نہیں ہوتی۔ فوج کو تو بہرحال حرکت کرنی ہے بغیر حرکت کے لڑائی جیتی نہیں جا سکتی۔ حرکت کرتے وقت ساز و سامان ہتھیار ایمونیشن اور رسد بھی ساتھ ہونا ضروری ہے۔ اب دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کتنا سامان آپ اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں اگر اور کوئی چارہ نہیں تو ان سب چیزوں کو خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ اگر خود اٹھائیں تو کتنا سامان اٹھا سکتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ کتنی دور چل سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آج کل یہ کام مشکل نہیں رہا۔ ہیلی کاپٹر منگائیں۔ جہاں مرضی ہے جائیں اور مع ساز و سامان کے جا کر اتر جائیں۔ اگر غریب ملک ہے تو کیا کرے۔ ہیلی کاپٹر ویسے خاصی مہنگی چیز ہوتی ہے۔ ہیلی کاپٹر کی اپنی خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ چلیے مانے لیتے ہیں۔ لیکن عزت کا کیا کیا کیجیے۔ کام تو بہرحال کرنا ہوتا ہے فوج ہی کیا جو ان مشکلات سے رک جائے۔

ذکر تو بلوچستان کا ہو رہا ہے کسی جنگ کا نہیں۔ جنگ کی بات ہوتی تو اور باتوں کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا۔ اس ضمن میں مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ دروغ برگردنِ راوی۔ یہ شروع شروع کی بات ہے کسی جگہ تخریب کاروں نے گھات لگا کر کچھ نقصان کر دیا۔ یہ جگہ کوئٹہ سے کافی دور تھی، دوستوں کو اکٹھا کیا گیا۔ منصوبہ بنایا گیا کہ پہاڑی علاقہ چھانا جائے اور تخریب کاروں کو پکڑا جائے۔ گرمی کا زمانہ تھا، اس علاقے میں پانی نایاب اور پھر اونچی اونچی پہاڑیوں کو دن میں عبور کرنا ذرا مشکل کام ہوتا ہے۔ ایک پہاڑ سے گزر کر جب دوسرے پہاڑ پر پہنچے تو زبانیں باہر آ گئیں۔ پانی۔ اب پانی کہاں، جو پانی ساتھ تھا ذرا دیر میں ختم ہو گیا۔ بغیر پانی کے آگے جانا محال اور پانی علاقے میں ناپید۔ سب کو واپس بلا لیا گیا۔

اب آخر اس علاقے میں جہاں پانی میلوں تک ناپید۔ دشوار گزار جگہیں، اونچی اونچی کھڑی چٹانیں۔ آخر لوگ رہتے تو ہیں، چلتے پھرتے بھی ہیں۔ بھیڑیں بھی پالتے ہیں۔ جہاں تھوڑی بہت زمین مل گئی فصل بھی اگا لیتے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات موقع مل گیا تو حریف سے دو دو ہاتھ بھی کر لیتے ہیں۔ یہ آج سے نہیں، صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اس قسم کے واقعات ہمارے ہی ساتھ نہیں بلکہ انگریزوں کے ساتھ تو ایسے حادثات اکثر ہوئے ہیں۔

JALALI BOOKS

فوج "کہان" کے محاصرے کے لئے چلی، چلتے چلتے پانی ختم ہوگیا۔ اب آگے جاتے ہیں تو کوئی پتہ نہیں پانی ملے گا بھی یا نہیں ؛ پیچھے آتے ہیں تو فاصلہ بہت زیادہ آگے چلے تو بقول شخصے مری پڑ گئے۔ آدھی فوج ختم ہوگئی۔ چار و ناچار پیچھے آنے کی ٹھانی۔ واپس ہوئے تو راستہ کٹا ہوا پایا۔ مشکل سے کچھ لوگ بچ سکے۔ یہ ہمارے یا فرنگیوں ہی کے ساتھ نہیں اوروں کے ساتھ بھی ہوا ہے یعنی مغلوں اور ترکوں کے ساتھ بھی یا جو اور قومیں آتی رہیں۔ بھائی یہ اگر تاریخ میں ہوا ہے تو بار بار کیوں ہوا۔ لوگوں نے تاریخ نہیں پڑھی مگر ایک بات یاد رکھیں تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ "تاریخ سے کوئی سیکھنے کی کوشش نہیں کرتا" چلیئے جانے دیں ان باتوں کو خود ٹھوکر کھا کر ہی آدمی سنبھلتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب آپ روم جائیں تو ایسا ہی کیجے جیسا رومی کرتے ہیں۔ یعنی جیسا دیس ویسا بھیس، جہاں تک مری قبائل کی حرکت کا تعلق ہے۔ سب سے اہم چیز ان کا گدھا ہوتا ہے جسے پنجابی میں کھوتا کہتے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجے کہ میدانی علاقے میں جہاں سڑکیں نہ ہوں، جیپ آرام سے جا سکتی ہے بس وہی حالت یہاں گدھے کی ان پہاڑوں میں ہے۔ اول تو ان لوگوں کی ضروریاتِ زندگی بہت کم ہیں یا نہ ہونے کے برابر ہیں پورے گھر کا سامان دو گدھوں پر آجاتا ہے۔ جہاں پڑاؤ کرنا منظور ہوا گدھوں کو روکا۔ چٹائیوں سے جھگی نصب کی اگر سردی ہوئی تو اونی چادروں کے خیمے بنائے، چکی اتاری، اناج پیسا۔ آگ جلا کر روٹی پکائی۔ جسے "کاک" کہتے ہیں۔ یعنی آٹا گوندھ کر گول پتھر پر لپیٹا اور آگ میں ڈالدیا۔ اس روٹی کی تعریف یہ ہے کہ ہفتوں خراب نہیں ہوتی۔ چائے کے سب شوقین ہیں۔ چائے کے ساتھ روٹی کھائی اور اللہ اللہ خیر صلا۔ بھیڑیں چونکہ ساتھ ہوتی ہیں۔ انہیں کا دودھ مکھن یا پنیر مل ہی جاتا ہے۔ اگر کوئی مہمان آگیا تو خاطر لازمی ہے۔ مہمان نوازی کے بڑے پختہ رواج ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ مہمان تین دن سے زیادہ خود نہیں رہتا اگر اسے رہنا کبھی پڑے تو اپنا بندوبست کرتا ہے یا دوسرے کی جھگی میں چلا جاتا ہے۔ مہمان کے لئے "سجی" بنانا ضروری ہوتا ہے۔ سجی یہ سمجھ لیں کہ بھیڑ کے بچے کا "روسٹ" ویسے یہ روسٹ سے کہیں زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔ بھیڑ کی کھال اُتاری اس کی ٹانگیں اور دھڑ علیٰحدہ علیٰحدہ کرلیا۔ ان اعضاء کو لکڑی لگا کر کھڑا کر دیا۔ چاروں طرف دھیمی دھیمی آنچ جلادی۔ جب پانی خشک ہوگیا تو سجی تیار۔ اگر زیادہ عیاشی کی ضرورت ہو تو گوشت پر ہلکا ہلکا نمک لگا دیا۔ کیا بات ہے سجی کی۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ جتنا مرضی کھائیں پیٹ خراب نہیں ہوتا۔ ہاں مہمان نوازی کے رواج کے تحت یہ

ضروری ہے کہ ہر سات آدمیوں کے لئے ایک دنبہ ہونا چاہیئے۔ اگر حساب میں ایک آدمی بھی بڑھ جائے تو دوسرا دنبہ ذبح کرنا ضروری ہوتا ہے۔

جہاں یہ لوگ پڑاؤ کرتے ہیں وہاں پانی کا ہونا ضروری ہے' اس کے بعد علاقے میں جانور چرائے۔ یہ پڑاؤ اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ علاقے میں گھاس موجود ہے۔ پڑاؤ سے دس پندرہ میل اِدھر اُدھر گھومنا معمولی بات ہے جب بھی چلنے کی ٹھانی تو منٹوں میں گھر کا سامان گدھوں پر لادا اور چلدیے۔

دوسری اہم چیز ان کے گھوڑے ہیں جن کا حرکیت سے براہ راست تعلق ہے گھوڑے تو ہر ایک کے پاس ہوتے نہیں۔ یہ تو امیر آدمی یعنی وڈیرہ ہی رکھ سکتا ہے اور ہر ایک وڈیرہ عموماً اپنی استعداد کے مطابق گھوڑے تعداد میں زیادہ ہی رکھتا ہے۔ یہ ایک طرح ان کی امارت کی علامت سمجھ لیں۔ پڑاؤ کے ارد گرد یعنی تیس چالیس میل چھاپہ مارنا ہو یا دوسرے قبیلے کے لئے گھات لگانی ہو یا مویشی اٹھانے ہوں تو گھوڑے اکٹھے کئے جائے واردات کا بخوبی جائزہ لیا منصوبہ ٹھوک بجا کر بنایا گیا اور پھر آرام سے دو تین دن تک ہدف کو نگاہ میں رکھا کہ منصوبے میں کوئی خامی نہ رہ جائے۔ پھر واردات کے دن جائے وقوع سے دو تین میل ہٹ کر سب اکٹھے ہوئے گھوڑوں کو وہیں چھوڑا۔ واردات کی۔ پھر گھوڑوں پر سوار اور حرکیت قائم۔ پکڑے اب جو پکڑنا چاہتا ہے گھوڑے خبر رسانی یا ایک جگہ سے دوسری جگہ ملاپ رکھنے کے لئے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ ویسے اگر جلدی ہو دشمن کی آمد کی خبر پورے علاقے میں دینی ہو تو اونچی جگہ پر آگ جلا کر دھواں پیدا کیا جاتا ہے۔ دھوئیں سے مختلف اشارے بھی بنائے جاتے ہیں۔ یا پھر شیشہ مار کر "شیشہ مارنا" ایک خاص محاورہ ہے۔ اس کا ذکر کہیں اور کیا جائے گا۔ یہاں اس سے مراد دھوپ میں شیشہ ہلا کر خبریں فراہم کرنے سے ہے۔ اس شیشے کی چمک میلوں تک جاتی ہے۔ مختلف انداز میں اسے ہلا کر بات چیت بھی کی جاسکتی ہے۔ جنگِ عظیم دوم سے پہلے یہ طریقہ فوج میں بھی رائج تھا جسے "ہیلیو" کہا جاتا تھا۔

تیسری اہم چیز جو حرکیت کو یہاں برقرار رکھتی ہے وہ ان لوگوں کا مشکیزہ ہے۔ مشکیزہ بھیڑ یا بکری کی کھال کو سکھا کر بنایا جاتا ہے جس علاقے میں پانی کی قلت ہو ہر فرد اس کو ساتھ رکھتا ہے۔ اس کا وزن نہ ہونے کے برابر اور پانی بھی ٹھنڈا۔ بس سمجھ لیں گرمیوں میں برف کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر دور دراز کا سفر ہے

اور موسم بھی گرم تو دن میں پانی ایک ہی دفعہ پیا جاتا ہے۔ چلتے چلتے اگر شدت پیاس لگے تو بڑے سلیقے اور اہتمام سے ہونٹوں کو ہلکا ہلکا گیلا کر لیا جاتا ہے۔ سچ بات بھی یہ ہے کہ اگر گرمی میں سفر کے دوران پانی ایک دو گھونٹ زیادہ پی لیا جائے تو پیاس کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ جتنا پانی پئیں اتنی ہی آرام کی خواہش، بہتر یہی ہے کہ کم پانی پینے کی عادت ڈالی جائے۔

فوج میں امن کے دوران حرکیت قائم رکھنے پر بڑا زور ہوتا ہے، اکثر مقالے لکھے جاتے ہیں اور پتہ نہیں کتنے لکھے جا چکے ہیں۔ آئے دن مظاہرے بھی دکھائے جاتے ہیں۔ کوئی نئی بات اکثر کم ہی ہوتی ہے مثلاً" جہاں گاڑیاں نہ جا سکتی ہوں۔ وہاں خچر استعمال کئے جائیں۔ یہ تو پرانی بات ہے جب ہی تو ضرورت ہے کہ یاد دہانی کرائی جائے۔ لوگ بھول بھی تو جاتے ہیں۔ خچر پر سامان لادنے اور اتارنے کی مشق ضروری ہے، ہر ایک خچر پر ایک سو بیس پاؤنڈ سے زیادہ وزن نہیں ہونا چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔ اب جب خچر کی بات شروع ہوئی گئی ہے تو ایک مسئلہ آپ بھی سُن لیں اور اسے حل کرنے کی کوشش کریں، ایک دفعہ کورس کے دوران ہمارے ایک استاد خچر پر سامان لادنے اور اتارنے کا طریقہ بیان کر رہے تھے۔ ہمارے ایک دوست نے استاد سے سوال کیا "جناب کبھی آپ یہ کہتے ہیں کہ خچر بھاگ جاتی ہے اور کبھی خچر دولتی مارتا ہے۔ یہ بتائیں کہ خچر مونث ہے یا مذکر" استاد کچھ سوچ میں پڑ گئے جھنجھلاتے ہوئے بولے "صاحب یہ کلاس خچر پر سامان لادنے اور اتارنے کے بارے میں ہے۔ اردو کا سبق نہیں چل رہا ہے۔ یہ سوال کسی مولوی صاحب سے کیجئے گا" ہم نے بہت سے لوگوں سے یہی پوچھا مگر مسئلہ ابھی تک اپنی جگہ قائم ہے۔ ہاں تو بات فوجی خچر کی ہو رہی تھی۔ انگریز بھی پہاڑی علاقے میں حرکیت قائم رکھنے کے لئے خچر ہی استعمال کرتا تھا۔ فوجی خچر کے ساتھ بڑی علتیں ہوتی تھیں ایک تو اس کی خاص غذا کا ساتھ ہونا ضروری ہے پانی بھی ماشاءاللہ ڈٹ کر پیتا ہے۔ اب اگر آپ چار خچر ساتھ لے جا رہے ہیں اور سفر چوبیس گھنٹے کا ہے تو دو خچر اپنی غذا اور پانی اٹھائیں گے باقی دو پر آپ اپنا سامان لے جا سکتے ہیں یہی حساب آپ وزن کے بارے میں لگاتے جائیں، ان کی دیکھ بھال کی مصیبت علیحدہ۔ اب مالش کا وقت ہے اب پانی کی ضرورت ہے۔ اب اگر خچر بیمار ہو تو ڈاکٹر کو بھی دکھانا لازمی ہے پھر جہاں شام ہوئی تو یہ شور مچاتے ہیں کہ الامان الحفیظ۔ "خر خر، فر فر" دور سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں فوج آئی ہوئی ہے ویسے

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

ان کی آواز بند بھی کی جا سکتی ہے۔ وہ صرف ان کا ڈاکٹر ہی کرتا ہے، اس کے لئے بھی وقت چاہئیے، بے زبان جاندار ہے کیوں ظلم کرتے ہو۔ مگر ایسا کیا جاتا ہے۔ ایسے پہاڑی علاقوں میں ہر جگہ ان کا جانا بھی مشکل پھر نکیلے پتھروں پر ان کے کھر ستیاناس ہو جاتے ہیں۔ حرکیت مظاہرے اور مثالوں تک تو قائم ہے۔ جب میدان سامنے آیا تو سستی گم۔ ہاں انگریز انہیں ضرور استعمال کرتا تھا۔ مگر راستوں پر وہ دن میں پندرہ میل سے زیادہ نہیں چلتا تھا۔ پندرہ میل کے بعد پڑاؤ اور پھر آرام آرام سے کام ہوتا ہے۔ لیکن آج کل تو آرام ذرا مشکل ہے، ہر ایک چیز کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ جنگ عظیم دوم کا واقعہ یاد آ گیا آپ بھی سن لیں۔ جب برما روڈ دن کی کارروائی سے کام نہیں بنتا۔ کام بنے گا کچھ سات دن باہر رہ کر۔ مختلف اطراف سے پیچھا کرنے سے یعنی بالکل قبائلیوں کی طرح کارروائی ضروری ہے۔

گاڑیوں اور خچروں کو اس حد پر خیرباد کہا جہاں تک ان کی پہنچ تھی۔ اب گاڑیوں اور خچروں کے مقابلے میں گدھوں کی خوبیوں کو دیکھئے۔ گدھا اور خوبی، یہ سن کر عام طور پر لوگوں کو ہنسی آجاتی ہے مگر اس جانور میں بے حد خوبیاں ہیں خاص طور پر ان حالات میں۔ پتہ نہیں کہ رائے عامہ اس کے خلاف کیوں ہے۔ رائے عامہ کی ایک ہی رہی۔ مثل مشہور ہے کہ وقت پڑے گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔ لے آئیے اس کے مخالفین کو یہاں پر اب اس کے آگے کہنا شائستگی کی حدود سے تجاوز ہوگا۔ ویسے مثل بیان کرکے شائستگی پہلے ہی کون سی باقی رہ گئی ہے۔ خیر ذکر ہو رہا تھا گدھے کی خوبیوں کا۔ پہلی بات تو یہ کہ جہاں تک وزن اٹھانے کا تعلق ہے، یہ خچر کے بالکل ہم پلہ ہے۔ حالانکہ خچر سے جسامت میں کہیں چھوٹا ہوتا ہے۔ پھر اسے کسی خاص چارے کی بھی ضرورت نہیں۔ جب منزل ختم ہوا سے کھلا چھوڑ دیں گھاس پھوس سے پیٹ بھر لیتا ہے۔ پھر مزے کی بات آپ سے دور نہیں جاتا۔ خچر یا گھوڑے کو چھوڑ کر دیکھیں۔ دوبارہ پکڑنا مشکل ہوگا۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ اسے یہاں کے راستے معلوم ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ یہ اسی علاقے کا ہو، اس پر سامان لاد دیں اور آگے چل دیں۔ آرام سے آگے آگے چلتا ہے۔ راس پکڑ کر آگے آگے چلنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے گدھے کے لئے کوئی راس ہوتی بھی نہیں۔ اگر غلط راستے پر ہو جائے تو ہانک کر سیدھے راستے پر ڈال دیں۔ جب اسے پیاس لگتی ہے اور بھوکا ہوتا ہے۔ تب ضرور یہ اپنے مخصوص انداز میں شور مچاتا ہے۔ فوج میں اس کا استعمال چونکہ

نیا نیا تھا۔ یار لوگوں نے زیادہ لاد دیا' یا پھر مار پٹائی شروع کر دی کیونکہ گدھے کے ساتھ پٹائی کا لفظ لازم ملزوم ہے۔ کام نہیں چلا مگر جب اس کی خوبیوں کا اندازہ ہوا تو انس بھی بڑھا اور کام بھی چلا۔ ہر ایک دستے نے اپنے گدھے سنبھالے۔ سات دن کا کھانا پانی اور سامان لادا اور چلدیئے جدھر حکم ملا۔ جہاں پانی ملا پانی پیا اور پھر کمی کو پورا کر لیا۔ وقت پر تازہ کھانا کھایا۔ نہ ایمرجنسی راشن کی مصیبت، نہ میٹھی روٹی کا جھنجھٹ' میٹھی روٹی فوج میں عام چیز ہے۔ ویسے نہایت ہی بکواس چیز ہے۔ امن کے دوران اس کی بڑی ترغیب دی جاتی ہے۔ جہاں کئی دن باہر رہنا ہو۔ کہا جاتا ہے میٹھی روٹی یا ایمرجنسی راشن ساتھ رکھ لو۔ وزن بھی نئی نئی بنی تو لوگ اس پر گاڑیاں بڑی تیزی سے چلاتے تھے اور پھر جنگ بھی اپنے شباب پر تھی۔ ظاہر ہے کہ حادثات بھی زیادہ ہی ہوتے تھے۔ انگریز جنرل کو غصہ آیا۔ تیز رفتاری کو روکنے کے لئے خود گشت کرنا شروع کیا۔ راستے میں ایک امریکن کارپورل جو عہدے میں اپنے نائیک کے برابر ہوتا ہے' جیپ کو پچاس میل کی رفتار سے چلا آرہا تھا' سامنے آیا۔ اس سڑک پر پندرہ میل فی گھنٹہ سے زیادہ تیز چلانے کا حکم نہ تھا جنرل نے اسے روکا۔ مکالمہ نیچے درج ہے۔

جنرل: اس سڑک پر حدِ رفتار کا تمہیں علم ہے؟

کارپورل: میرے فرشتوں کو بھی نہیں پتہ کہ حدِ رفتار کیا ہوتی ہے۔

جنرل: اس سڑک پر پندرہ میل فی گھنٹہ سے تیز چلانے کا حکم نہیں۔

کارپورل: (ذرا مایوس ہو کر اور کچھ جھنجھلاتے ہوئے) "جو آپ کہتے ہیں' ٹھیک ہی ہوگا' مگر یاد رکھیں کہ لڑائی کبھی بھی پندرہ میل فی گھنٹہ کے حساب سے نہیں جیتی جا سکتی۔"

ہاں تو بات حرکیت کی تھی کہ فرنگی بیشک ایک دن میں پندرہ میل مع خچروں کے چلتا ہو مگر یہاں اگر قبائلیوں سے مقابلہ کرنا ہے تو جناب کم سے کم تیس میل روزانہ چلنا ضروری ہے اور پھر اسی طرح کم سے کم سات دن باہر گزارنے بھی ضروری ہیں۔ ورنہ بات نہیں بنتی۔ مقابلہ پھر مقابلہ ہے اور وہ بھی حرکیت کا۔

شروع میں جب یہاں پہنچے تو نہ زمین کا پتہ اور نہ حالات کا۔ کتابیں تو علاقے کے بارے میں بہت پڑھی تھیں مگر کتابوں سے ہی اگر سب کچھ سیکھ لیا جاتا تو پھر عمل پر زور دینے کی کیا ضرورت۔ ہاں یہ صحیح

JALALI BOOKS

ہے کہ عمل میں آسانی ہو جاتی ہے۔ حرکت میں برکت تو جناب گشت اور اقدامی کارروائیاں شروع ہو گئیں اقدامی کارروائی سے مراد بڑے پیمانے پر علاقے کو چھاننا۔ اب جہاں تک گاڑیاں جا سکتی تھیں تو کارروائی کچھ مشکل نہ تھی۔ اس سے آگے جانے کے لئے سامان خود اٹھا کر چلیے۔ زیادہ سے زیادہ ایک دن میں پندرہ میل۔ کھانا اور پانی ختم تو پھر واپس۔ اول تو وہ انتہا درجے کا بے وقوف ہوگا جو واردات کر کے سڑک کے کنارے بیٹھے۔ یار لوگوں نے اپنی کارروائی کی اور دور پڑاؤ کی طرف نکل گئے۔ کیجئے انہیں تلاش، پڑاؤ تک پہنچنے کے لئے "حرکیت" چاہیے۔ وہ بھی مدمقابل سے تیز۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بغیر تیز رفتاری اور پھر ایک دو کم اور پیٹ بھی بھر جانا ہے۔ یہ چیزیں خراب نہیں ہوتیں پکنک کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر جہاں تیس میل روزانہ چلنا ہو اور وہ بھی کئی دن تک وہاں میٹھی روٹی سے کام نہیں بنتا۔

جب اپنے آپ کو ان خطوط پر آراستہ کر لیا تو پھر نہ کھانے کی فکر نہ پانی کی کمیابی کا ڈر۔ پہاڑ ہیں تو ہوا کریں۔ پانی ناپید کوئی فکر نہیں۔ چلنے کا مقابلہ ہے تو یہی سہی۔ ہمارے مری دوست اکثر ہم سے کہا کرتے ہیں کہ آپ لوگ بالکل "مری" بن گئے۔ کیا حرج ہے اگر اپنے بھائیوں سے نہیں سیکھیں گے تو کن سے سیکھیں گے۔ آخر آپ لوگوں کا صدیوں کا تجربہ ہے۔ ان صدیوں میں نہ زمین بدلی اور نہ ہی حالات اگر سڑکیں ہوتیں اور حالات موجودہ صدی کے ہوتے تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔"
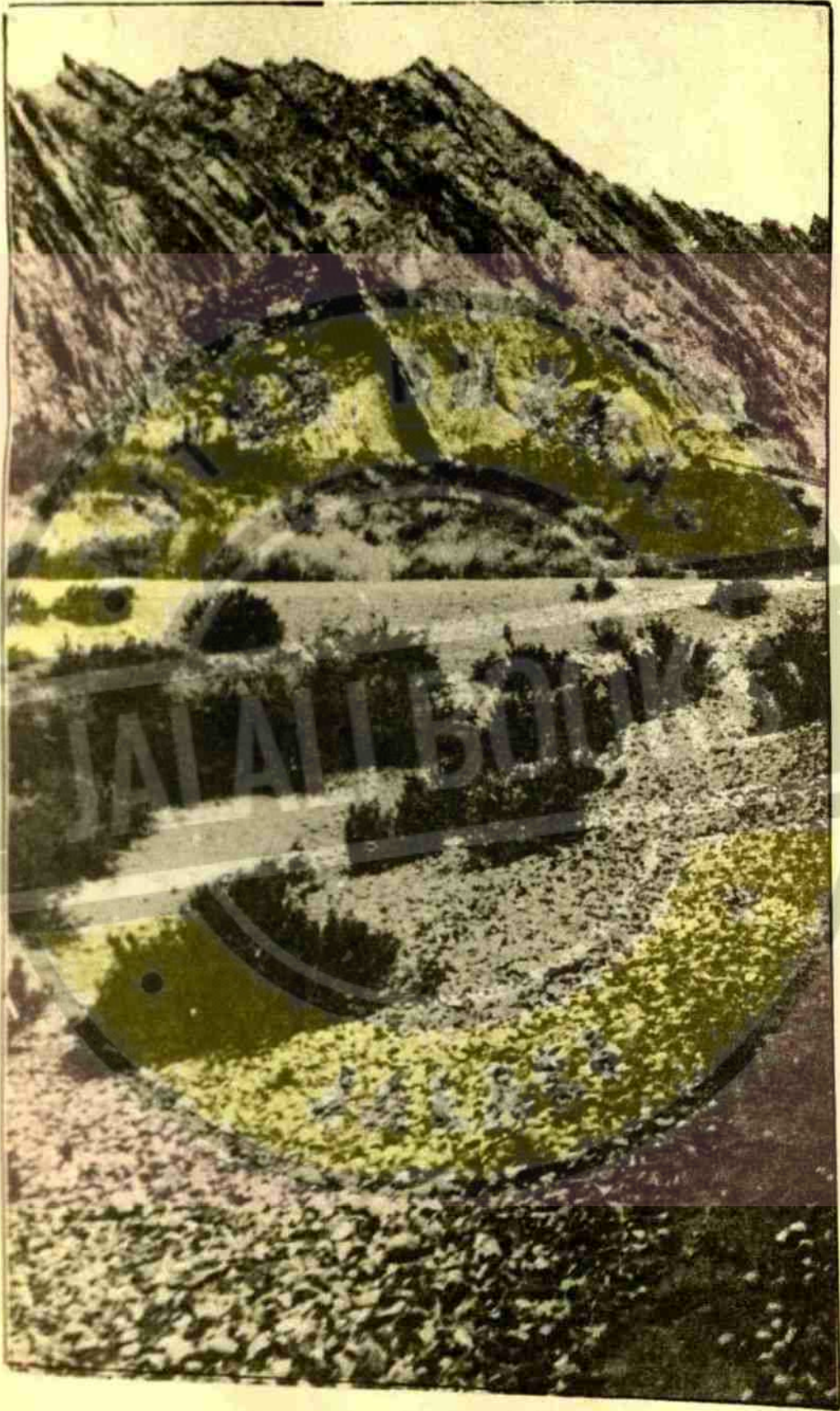
گشت اور جدّت

ان پہاڑوں کے دامن میں ان کا "حلق" ہے

گشت اور جدّت

جب ہم نے اپنی حرکیت درست کرلی اور اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی تو ہمارے دوستوں نے آگے بھی سوچنا شروع کیا۔ جب حالات اور خلفشار اپنی نوعیت کے ہوں یعنی نہ تو حالات پُرامن اور نہ ہی گڑبڑ جنگ سے مناسبت رکھتی ہو تو پھر ان سے نمٹنے کے لئے طریقے بھی نئے ہونا ضروری ہیں۔ نئے طریقوں کو بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں۔ خاص طور سے فوجی ذہن جنگی اعتبار سے ایک خاص انداز میں ڈھلا ہوتا ہے۔ ایسا تو ہوہی جاتا ہے۔ گلے کی کوئی بات نہیں۔

ایک روز ہمیں کھانے پر گئے ہوئے تھے ایک کپتان صاحب ہمارے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ نوعمر ہم سے کافی لمبے اپنے کام میں کافی مستعد اور ماہر۔ انہوں نے بھی مری علاقے میں آکر داڑھی رکھ لی۔ زبان بھی اچھی خاصی بولتے ہیں۔ اگر شلوار قمیض میں ہوں تو بالکل مری نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی بات جس کے کہنے کے لئے بے تاب ہیں۔ پہلے تو علاقے کے حالات پر تبصرہ کرتے رہے۔ انہیں کچھ باتیں پسند نہ تھیں۔ آخر اس طرح گشت کرنے سے کیا فائدہ دس پندرہ میل ہم گھوم کر آجاتے ہیں۔ ملتا ملاتا کچھ نہیں۔ ناخن ہی ٹوٹتے ہیں۔ ناخن اگر ٹوٹتے ہیں تو انہیں کاٹیے۔ کس نے کہا ہے کہ بڑھا کر رکھیں۔ نہیں! یہ تو انہوں نے محاورتاً کہا

تھا آپ سمجھے نہیں تو پھر کیا کیا جائے۔! دراصل بات یہ ہے کہ موجودہ حالات میں یہ تمیز کرنا کہ فلاں دوست ہے یا تخریب کار بہت ہی مشکل ہے۔ اس کی پہچان تو گولی چلنے پر ہی ہوتی ہے۔ یا پھر آدمی بغیر اجازت کے ہتھیار لے جا رہا ہو۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے۔ ہر ایک کو وردی دور سے نظر آتی ہے۔ اب گشت پر باہر نکلے۔ دور سے ہر ایک کو پتہ ہے۔ ہم واپس آ گئے۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ گشت واپس چلا گیا ہے اور علاقہ صاف ہے۔ جو مرضی آئے کرو۔ تخریب کار ہمارے قریب آتے ہیں۔ واردات کرتے ہیں اور پھر بھی پہچان مشکل۔ ہم جہاں بھی جاتے ہیں، ہمیں چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ کچھ غیر یقینی سی محسوس ہوتی ہے۔ بات تو ٹھیک ہے علاقہ تو غیر محفوظ ہی رہے گا۔ جب تک تخریب کاروں کو گرفتار نہیں کر لیا جاتا۔ ان لوگوں کا صفایا کرتے کرتے بھی وقت لگے گا۔ یہی کوشش جاری بھی رکھنی پڑے گی۔ یہ تو دور رس کام ہے۔ مگر فی الحال ضرورت اس بات کی ہے کہ جو غیر یقینی ماحول ہم محسوس کرتے ہیں وہ ہی تخریب کاروں کے لیے پیدا کر دیا جائے اور انہیں ہر ایک علاقہ غیر محفوظ نظر آئے تو ان کی کارروائی میں بہت حد تک کمی ہو جائے گی تخریب کار ہم سے دور اپنی کمین گاہیں چنتے ہیں اور وہ آرام سے گھومتے پھرتے ہیں۔ اگر گشت اس علاقے میں گیا تو لوگ انہیں فوراً بتا دیتے ہیں اور وہ بھی ہتھیار چھپا کر اوروں کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ پھر آپ بتایئے اس گشت سے کیا فائدہ۔ فائدہ تو یہ ہے کہ لوگوں کو پتہ ہو کہ ہم یہاں آتے ہیں۔ یہ ابھی ابھی آپ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ بات برابر ہو گئی۔ تخریب کاروں کی کارروائی میں کیا فرق پڑا۔ جب تک آپ موجود ہیں شاید کوئی کچھ نہ کرے۔ بعد میں تو اپنی حکومت ہے۔

"اچھا تو آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔"

"فی الحال تو میں کچھ نہیں کہنا چاہتا صرف عرض ہے کہ آپ مجھے چالیس آدمی دے دیں اور بیس دن تک مجھے اکیلا چھوڑ دیں جیسے میری مرضی آئے انہیں تربیت دوں۔ جب تربیت کا کام مکمل ہو جائے تو آپ آ کر دیکھیں اگر میری رائے سے اتفاق کرتے ہیں تو پھر مجھے کام کرنے کی اجازت دے دیں۔" کپتان غریب مجھ سے بات کر رہا تھا مگر اور لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے۔ بحث ہے کہ جاری ہے۔ مگر وہ کب ہار مانتا تھا جو کچھ کہہ رہا تھا اُسے مکمل یقین تھا کہ ٹھیک ہے۔ چلو مان لیا۔ اس کی نوکری تھوڑی ہے۔ مگر جذبہ تو

ہے۔ اور پھر یقین بڑی بات ہے۔ جذبہ اور یقین ہو تو کامیابی اور کامرانی قدم چومتی ہے۔ چلو مانے دیتے ہیں۔ تمہاری تمام شرائط منظور۔ لوگ مذاق اُڑاتے ہیں تو اُڑانے دو۔ ہر ایک جدّت کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔

اکیسویں دن کپتان صاحب وعدے کے مطابق تشریف لائے کہ چلیے میرے ساتھ اور تربیت کا معائنہ کر لیں۔ جیپ خود چلا رہے تھے۔ راستہ کچھ نظر نہیں آتا تھا مگر جیپ ہے کہ جا رہی ہے۔ کبھی پتھروں پر دھکے کھاتی ہے تو کبھی نالے کی ریت میں دھنسی جاتی ہے۔ پانچ میل چلے ہوں گے کہ شکلیں بدل گئیں۔ گرد سے اٹے ہوئے۔ آنکھیں لال ہو کر خاک کی منہ پر جمنے لگیں۔ ہڈی پسلی کا جو حال تھا بیان کرنا مشکل ہے۔ کتنی دور اور جانا ہے بس کوئی دو ایک میل اور۔ دھنی رام کا قصہ آیا۔ دل ہی دل میں ہنس لئے۔ قصہ آپ بھی سن لیں۔ یہ ۱۹۶۵ء کی لڑائی کا ذکر ہے۔ میں اس وقت کمپنی کمانڈر تھا۔ میری کمپنی آگے آگے تھی۔ رات بھر ہم لوگ چلتے رہے صبح ہوئی تو کوئی پتہ نہیں ہم لوگ کہاں پہنچ چکے ہیں۔ اتفاق سے دو آدمی بھاگتے ہوئے نظر آئے ایک کو یار لوگوں نے دھر لیا اور گھسیٹنا شروع کیا۔ یہ ہی کوئی ادھیڑ عمر کا تھا۔ سفید دھوتی اور کالا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ بھاگ کر منع کیا ایسا نہ کرو۔ نام دھنی رام بتاتا تھا۔ جب ہم منع کرنے لگے کہ اسے مت گھسیٹو تو واہ رے حاضر جوابی۔ کچھ پنجابی کچھ اردو میں کہنے لگا "ٹھیک ہے اب تہاڈے قابو آ گئے۔ جو مرضی آئے کر لو"۔ تو جناب جیپ پر ہماری یہ حالت تھی۔ جیپ ایک نالے کے کنارے جا کر رکی۔ تھوڑی دور جب پہاڑی پر پیدل چڑھ کر پہنچے تو نیچے کچھ جھگیاں نظر آئیں۔ عورتیں سفید حلبی نما جبہ پہنے ہوئے۔ سر پر چادر۔ چادر کے اوپر کٹورا رکھا ہوا۔ کسی کے ماتھے پر گٹھڑی پھنسی ہوئی اور گٹھڑی کمر پر جھولتی ہوئی یہ چھوٹے بچوں کو اٹھانے کا مخصوص انداز ہوتا ہے۔ کوئی مشکیزہ اٹھائے پانی لا رہی ہے۔ جھگیاں پہاڑ کے دامن میں اس طرح نصب ہیں کہ جب تک آپ سر پر نہ پہنچ جائیں کچھ نظر نہیں آتا۔ جھگیوں کے ایک طرف آگ جل رہی تھی۔ پتھر کا توا رکھا ہوا اور روٹیاں بن رہی ہیں ایک طرف چکی پڑی ہوئی۔ گدھے ارد گرد چر رہے ہیں۔ کچھ مرغیاں بھی ہیں۔ کبھی جھگیوں کے باہر جاتی ہیں اور کبھی اندر جاتی ہیں۔ رنگین کپڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے دور دو مرد بھیڑیں چرا رہے ہیں۔ سر پر پگڑی لمبی لمبی داڑھیاں اور پتہ کرنا مشکل ہو گیا کہ یہاں آدمی شکار کی تلاش میں بیٹھے ہیں۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ قبائلی عورتیں اپنے

بُل پڑی ہوئی۔ جہاں جھگیاں نصب تھیں ادھر سے کئی راستے گزرتے تھے۔ قریب میں پانی بھی موجود تھا۔

کپتان صاحب نے اشارہ کیا تو پہاڑیوں کے اوپر سے پگڑیاں اٹھنی شروع ہوئیں معلوم ہوتا تھا کہ ہم لوگ شر پسندوں کی گھات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ پگڑی والے رائفلوں سے مسلح چہرے پر داڑھی اور پگڑی سے نکلتے ہوئے لمبے بال۔ کپتان صاحب نے پھر اشارہ کیا تو دور چوٹی پر سے دو آدمیوں نے سر نکالا یہ چوٹی پر بیٹھے آدمی دیدبان ہیں جن کے پاس دوربینیں ہیں یہ ہر آتے جاتے پر نظر رکھتے ہیں۔ اگر کوئی مشکوک آدمی گھات کی طرف آتا ہو تو اشارے سے گھات کو چوکنا کر دیتے ہیں۔ اگلے اشارے پر یہ سب لوگ غائب ہو گئے روزمرہ کے کام میں مصروف ہیں آخری اشارے پر دیکھتے دیکھتے سب سے سامان گدھوں پر لادا اور چلدیے دیکھنے والا کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ سپاہی جا رہے ہیں یا قبائلی۔

اس سارے مظاہرے کے پس پشت کپتان صاحب کا فلسفہ یہ ہے کہ چونکہ یہاں علاقہ بہت وسیع ہے۔ آپ کتنے ہی دستے لے آئیں ہر جگہ موجود ہونا مشکل ہے۔ ایسے علاقے رہ جاتے ہیں جہاں تخریب کار اپنی مرضی سے گھومتے پھرتے ہیں اور جب موقع ملا اپنی کارروائی کی اور غائب۔ اس کارروائی کو روکنے کا ایک طریقہ گشت ہے۔ گشت کی خامیاں تو انہوں نے پہلے ہی بیان کر دی تھیں۔ اب اگر اس قسم کے دستے جن کا انہوں نے مظاہرہ دکھایا۔ ایسے علاقے میں تعینات کر دیئے جائیں۔ جہاں تخریب کار اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں اور جس جگہ سے وہ تخریب کاری کے لیے آتے جاتے ہیں تو ان کے لیے وہ ہی حالات پیدا کر دیے جائیں گے جو کہ ہمارے لئے ہیں۔ انہیں یہ نہیں پتہ کہ کون سا علاقہ محفوظ اور کون سا غیر محفوظ ہے کوشش یہی ہو کہ فائر کھولے بغیر تخریب کاروں کو گرفتار کیا جائے۔ آخر کو اپنے ہی بھائی ہیں۔ اس طرح گھات لگانے سے یہ مقصد بھی حل ہو جائے گا۔ بات دل کو لگی۔

اس قسم کے دستے جن کا مظاہرہ کپتان صاحب نے دکھایا تھا چنے اور علاقے میں پھیلا دیئے گئے اور نہایت کامیاب رہے۔ اس سے یہ تو ہوا کہ تخریب کاروں نے نزدیک آنا ترک کر دیا اور پھر ان میں گھبراہٹ بھی ہوئی جو کہ لازمی امر تھا۔ خبریں بھی بہت اہم ملیں۔ جن کی بنا پر بڑی اقدامی کارروائیاں کامیاب ہوئیں۔ مگر حالات اس تیزی سے بدلے کہ انہیں ترک کرنا پڑا مگر اس میں شک نہیں کہ جدت کا اپنا مقام قائم ہے۔

ایک دِن اور ایک صدی

جہان بی اور سیوی اپنے والد کے ساتھ

ایک دِن اور ایک صدی

مری قبائل کا رہن سہن :

یہاں کے حالات کا صحیح تجزیہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ رائج شدہ معاشرے اور رہن سہن پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ پہلے معاشرے کو لے لیتے ہیں۔ اس کا تجزیہ اگلے باب میں (عمرانی) نقطۂ نگاہ سے کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مگر یہ خیال رکھیے کہ یہ ہماری ذاتی رائے ہے کسی ماہر عمرانیات کی نہیں۔

مری قبائلیوں کی اکثریت بغیر گھروں کے رہتی ہے اور ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ تناسب نوّے فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ آرام سے رہنا کسے بُرا لگتا ہے۔ جب بھی ہم باہر جاتے ان کی جھگیوں کو دیکھتے۔ سوال ہمارے ذہن میں اٹھتے اور کرید بڑھتی کہ ہمارے بھائی اگر اس طرح جھگیوں میں رہتے ہیں تو اُن کا طرزِ زندگی کس نوعیت کا ہوگا۔

ان کا اس طرح جھگیوں میں رہنے کا طرز زندگی صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ ہم نے ان کی جھگیوں کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ اپنے بھائیوں سے بھی استفسار کیا۔ جب بھی موقع ملتا ان کے ساتھ جھگیوں میں بیٹھ کر گھنٹوں باتیں ہوتیں اور تجسس کی سیری کرتے اس دوران ہم نے اپنے نوٹس NOTES بھی تیار کیے

کہ کبھی وقت ملا تو آرام سے اس کا تجزیہ کریں گے۔ اس معاملے میں اپنی کم علمی کا بھی خاصہ احساس ہوا چلیئے کوئی بات نہیں کبھی کسی پڑھے لکھے کو اس کا خیال آیا تو شاید اس سے بہتر تجزیہ کر ڈالے۔ تاہم ایک بات واضح کرنا ضروری ہے کہ جو کچھ بھی بیان کر رہے ہیں اس میں مبالغے کو کوئی دخل نہیں۔

ہمارے مری بھائی جہاں بھی جھگیاں نصب کرتے ہیں چاہے امن ہو یا جنگ ان جھگیوں کا پتہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ماسوائے اس کے کہ آپ اچانک سر پر پہنچ جائیں۔ یہ جھگیاں عموماً ایسی جگہ لگائی جاتی ہیں جہاں سے ان کا پتہ چلانا مشکل ہو۔ قریب گہرے نالے ہوں گے۔ بڑے بڑے پتھر اور آس پاس اونچے پہاڑ۔ اگر کچھ درخت ہوں تو اور بھی اچھا ہے۔ جب جھگیاں لکڑی اور چٹائی سے نصب کی جاتی ہیں تو خیال یہ رہتا ہے کہ وہ زمین کی قدرتی حالات سے اس طرح مل جائیں کہ گھروں کا کوئی پتہ نہ چل سکے فوجی اصطلاح میں اسے تلبیس یا کیمو فلیج (CAMOUFLAGE) کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ پاوندوں کو دیکھیں تو وہ بھی کیمپ لگاتے ہیں مگر خیموں میں رہتے ہیں جن کی چھت کالے رنگ کے کمبل کی ہوتی ہے جنہیں میلوں سے پہچانا جا سکتا ہے مری بھائیوں کی جھگیاں جہاں بھی نصب ہوں ان کی خاص تعداد نہیں ہوتی۔ کہیں پانچ کہیں چھ۔ کہیں آدھے چکر کی شکل میں بکھری ہوئی۔ ان پانچ چھ جھگیوں کے گروپ میں ایک خاندان ہوتا ہے۔ ایسے جھگیوں کے پانچ چھ گروپ ایک بڑے خاندان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جنہیں "حلق" کہتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے یہ رہنے والے ایک ہی جزوی قبیلے کے ہوتے ہیں۔ یہ اکٹھا رہنے کا طریقہ آپس میں اتنا رچا ہوتا ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی یہ بیٹھتے ہیں ان کی "گروپ بندی" ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

ہمارے مری دوست اکثر ہمارے پاس آتے کہ فلاں جگہ سڑک بنوا دیں یا فلاں جگہ پانی کا بندوبست نہیں وغیرہ وغیرہ تو ہم اکثر ان کے ساتھ خود چلے جاتے۔ ایک دن خیال آیا کہ ان کے کیمپ میں پورا دن گزارا جائے اور کیمپ کی تفصیل اپنی آنکھوں سے دیکھی جائے۔ ایک روز ہمارے ایک دوست چند کوئلے کی بوریاں لے کر آن موجود ہوئے کہنے لگے "یہ دیکھئے پتھر کے کوئلے کا نمونہ ہے جو کہ ہمارے علاقے میں موجود ہے آپ کو تو معلوم ہے آج کل یہ کوئلہ سونے کے بھاؤ بکتا ہے۔ ڈگی میں لوگ اسے چھ سو روپے ٹن کے حساب سے بیچتے

ہیں“۔ ہم نے کوئلے کو دیکھا واقعی بہت عمدہ تھا۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اس بارے میں ان کی کیا مدد کی جاسکتی ہے کہ خود ہی بولے ”اگر آپ اس علاقے میں سڑک بنوادیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ بالا ڈکے تک تو سڑک ہے اس سے دس میل آگے اس سڑک کو اور بڑھانا ہوگا۔“

”چلیے ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں علاقہ بھی دیکھ لیں گے۔“

”ارے آپ کہاں جائیں گے۔ پیدل چلنا پڑے گا۔“

”جناب! ہم پیدل چلنے کے عادی ہیں ایسی بھی کیا بات ہے۔“

”یہ تو ہمیں پتہ ہے لیکن بلاوجہ آپ کو تکلیف ہوگی۔“

ہم نے انہیں سمجھایا کہ بغیر تکلیف کے کام بھی نہیں ہوگا۔ ہمارے جانے سے اس کام میں بڑی آسانی ہوجائے گی اور وقت کی بھی بچت ہوگی۔ ہمارے دوست فوراً تیار ہوگئے۔ بتانے لگے کہ ان کا کیمپ بھی اسی جگہ کے قریب ہے اور مال مویشیوں کی چرائی کے لیے ان کے فرقے کے لوگ وہیں موجود ہیں۔ اگلے دن ہم اپنے دوست کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ گاڑیاں بالا ڈکے ہی میں چھوڑیں۔ گھوڑوں کا بندوبست ہمارے دوست نے کرہی لیا تھا کہ ہمیں پیدل کیوں تکلیف دی جائے۔ جب گھوڑے پر سوار ہوئے تو ہمارے دوست کہنے لگے کہ ”آج آپ ہمارے مہمان ہیں۔ واپسی تو پھر دیر سے ہوگی“۔

”چلیے آپ کی مہمانی سر آنکھوں پر۔ ہمیں اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ جب ہم آپ کے مہمان ہیں تو آپ کے ساتھ اکیلے ہی چلتے ہیں“۔

اپنے ساتھیوں کو واپس کیا اور پہاڑی کا راستہ لیا۔ گھوڑے کی سواری ویسے اپنی عمر میں کم ہی کی ہے مگر یہ گھوڑے کچھ اس طرح چلتے ہیں کہ کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی۔ سب سے آگے گھوڑوں پر دو مری تھے بیچ میں ہم اور ہمارے دوست اس طرح پیچھے بھی تین سوار۔ مطلب یہ کہ چلنے کا پکا فوجی طریقہ۔ راستے میں ہمارے دوست بتاتے رہے کہ کہاں سے سڑک شروع کی جاسکتی ہے۔ دراصل یہ ان کا پیدل جانے کا راستہ تھا۔ قریب دوپہر ہم اس جگہ پہنچے جہاں کوئلے کی کان موجود تھی۔ برسات میں ایک نالے نے اپنا رُخ بدلا تھا اس سے منسلک پہاڑی کٹ گئی تھی اور کوئلہ اوپر آگیا تھا۔ یہ کوئلے کی تہ دور تک نظر آتی تھی جب ہم جگہ

دیکھ چکے تو ہمارے دوست نے کہا کہ قریب میں نمک بھی موجود ہے۔ تجسس تو تھا ادھر بھی چلنے کے لیے تیار ہوگئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک چشمے کے قریب پہنچے وہاں نمک کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ آس پاس کی زمین نمک کی فراوانی سے سفید ہوگئی تھی۔ چشمے کا پانی چکھا تو نمکین۔ ہمارے دوست نے بتایا کہ "اس چشمے کا پانی سکھا کر ہم لوگ نمک بناتے ہیں۔ کوہلو میں تو آپ کو معلوم ہے کہ نمک کی قیمت دو روپے سیر ہے"

چشمے کا پانی رِس رِس کر بہہ رہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نمک کی کان قریب ہی ہوگی۔ ہمارے دوست کہنے لگے کہ "اگر یہاں سڑک بن جائے تو کوئلے اور نمک دونوں کا کاروبار ہوسکتا ہے"۔

دیر کافی ہوچکی تھی اب ہم لوگ واپس لوٹے۔ ایک نالے کے موڑ پر ہم سے آگے جو دو آدمی گھوڑوں پر سوار تھے اتر گئے اور آہستہ آہستہ گہرے نالے کی طرف چلنے لگے۔ ہم نے ان کے گھوڑوں سے نیچے اترنے کی وجہ پوچھی تو جواب ملا "ہمارا حلق" قریب ہے۔ یہ ہم لوگوں کا طریقہ ہوتا ہے کہ "حلق" سے تقریباً "سو گز" پہلے آنے والا اتر جاتا ہے اور آہستہ آہستہ آگے آتا ہے تاکہ آدمی کی پہچان ہوسکے"۔

ہم اپنے دوست سے مخاطب ہوئے کہ "اب ہم وہی کریں گے جو آپ کا رواج ہے"

نالے کے کنارے ایک پگڈنڈی تھی جو ایک چھوٹی سی پہاڑی پر سے گزرتی تھی۔ جیسے ہی ہم نے پہاڑی کو عبور کیا سامنے ایک گہرا نالا آیا اور اس کے ساتھ اونچا پہاڑ۔ پہاڑ کے دامن میں چھوٹے چھوٹے گردلوں میں جھگیاں نصب تھیں۔ وہاں کچھ لوگ پہلے سے موجود تھے۔ یہ ہمیں ایک چھوٹی سی کھلی ہوئی جگہ پر لے گئے سب کافی تھک چکے تھے۔ اس لیے اتر کر کمبلوں پر بیٹھ گئے جو کہ وہاں پہلے سے بچھے ہوئے تھے۔ ہم نے پوچھا کہ "پہلے آپ ہمیں یہ بتائیں کہ یہ جگہ جہاں ہم بیٹھے ہیں کیا یہ پہلے سے مقرر کی گئی تھی؟"

"جب ایک نیا آدمی حلق کی طرف آتا ہے تو کچھ لوگ اس کا استقبال کرتے ہیں اور اسے ادھر لے آتے ہیں جہاں آپ بیٹھے ہیں۔ یہ چھوٹا سا کھلا علاقہ "آوناک" کہلاتا ہے۔

تھوڑی دیر میں کچھ اور لوگ اکٹھے ہوگئے۔ ہمارے میزبان نے ہم سے معذرت چاہی اور کہنے لگے کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنا "حال" کا رواج مکمل کرلیں۔

ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ انہوں نے "حال" بیان کرنا شروع کیا۔ اس رواج کا ذکر ہم پہلے کرچکے

ہیں۔ جب وہ "حال" بیان کر چکے تو کیمپ کے ایک بزرگ نے جواباً "حال" بیان کیا۔ ہمارے دوست نے بتایا کہ ہر ایک کیمپ کا ایک لیڈر ہوتا ہے۔ یہ عزت اور مرتبے کے لحاظ سے سب سے بڑا ہوتا ہے جسے "حلق واجا" کہتے ہیں۔ اگر حلق واجا کسی کام سے باہر جاتا ہے تو دوسرا عزت دار آدمی اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ تو یہ بزرگ ہمارے دوست کی غیر موجودگی میں "حلق واجا" کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ اگر کوئی اجنبی یہاں پہنچ جائے تو اس سے کوئی اور سوال نہیں کر سکتا۔ تاوقتیکہ "حلق واجا" صاحب نہ پہنچ جائیں۔ سوال جواب تو صرف "حال" سے ہوتا ہے۔ اجنبی کو کبھی بھی نہیں بتایا جاتا کہ "حلق" میں کون کون موجود ہے۔ غیر عورتوں کے بارے میں کچھ بتانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

جھگیاں تین گروپوں میں نصب تھیں۔ ہمارے میزبان نے بتانا شروع کیا کہ ہر ایک گروپ اور جھگی کی اپنی حدود ہوتی ہے۔ برابر والے کا احترام کرتے ہیں۔ اس طرح سے ایک قسم کا پردہ سا قائم رہتا ہے۔ جسے انگریزی میں پرائیویسی (PRIVACY) کہتے ہیں۔ باہر سے آنے والا مہمان "آدتاک" میں ہی قیام کرتا ہے۔ ہاں اگر اسے کوئی شخص جانتا ہو اور ساتھ اپنی جھگی میں لے جانا چاہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ شام کو مرد علیحدہ "حلق واجا" کے ساتھ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور عام بات چیت ہوتی ہے۔ یہ اکٹھا ہونا کوئی تقریب کی طرح نہیں ہوتا بس یوں ہی آرام کرنے کے لیے اور گپ لگانے کے لیے۔ اس طرح عورتیں "حلق واجا" صاحب کی بیگم صاحبہ جنہیں "گوری" کہتے ہیں کے حلقے میں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔

صبح اور شام کے وقت کیمپ میں کافی گہما گہمی ہوتی ہے۔ یعنی جانور چرائی کے لیے نکلتے ہیں یا واپس آتے ہیں اس کے علاوہ اور کام بھی ہوتے ہیں۔ جیسے پانی لانا۔ لکڑی کاٹنا۔ پھر کسی "حلق" کے آدمی کو باہر جانا ہوتا ہے تو یا کسی کو واپسی کا انتظار ہوتا ہے "حلق واجا" صاحب ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر جو کہ کیمپ کے عموماً وسط میں ہوتی ہے۔ ان کاموں کو دیکھتے ہیں اور احکام صادر کرتے ہیں۔

ان جھگیوں کے آس پاس تقریباً ہر ایک جھگی کا علیحدہ اپنا علاقہ ہوتا ہے جہاں عورت اپنے گھر کا کھانا پکاتی ہے کوئی بھی مرد دوسرے کے علاقے میں نہیں جاتا۔ بچے آپس میں ضرور کھیلتے رہتے ہیں لیکن رات کو اپنے خاندان ہی کی جھگیوں میں سوتے ہیں۔ انہیں بھی ایک دوسرے کے علاقے میں سونے کی اجازت نہیں ہوتی۔

"آپ کے پورے حلقے کا ایک ہی "اوتاک" ہوتا ہے۔"

نہیں اگر آپ جھگیوں کو غور سے دیکھیں تو ہر ایک نے تھوڑی سی زمین چھوڑی ہوئی ہے وہ ان کا اپنا نجی "اوتاک" ہے یہ مہمانوں کے لیے وقف ہے۔ عورتیں جہاں کھانا پکاتی ہیں یہ سب سے اہم جگہ ہوتی ہے۔ اس جگہ سوائے گھر کی مالکہ بچوں اور عورتوں کے کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ چولہا جھگی کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

ہمارے دوست کی والدہ اور بیوی ہمیں بہت اچھی طرح جانتی تھیں کیونکہ جب یہ حراست میں تھے تو ہم اکثر ان لوگوں کی خیریت معلوم کرنے کے لیے وہاں جاتے تھے۔ ایک دفعہ ان کی والدہ نے اپنے بیٹے سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو ہم انہیں اپنے ساتھ ملانے بھی لائے تھے اور ان کے بچے کو علاج کی خاطر اپنے پاس بھی رکھا تھا۔ ان کی والدہ کو ہماری آمد کا پتہ چلا تو ٹہلتی ہوئی "اوتاک" میں آگئیں۔ یہ ہی کوئی ساٹھ سال عمر ہوگی۔ میرا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگایا۔ ہم اکثر انہیں اس حرکت پر ٹوکتے تو برا مانتیں۔ پھر کہنا ہی چھوڑ دیا۔ ان سے استفسار کیا کیا کہ آپ کا پوتا کہاں ہے جسے ہم اپنے ساتھ علاج کے لئے لے گئے تھے۔ کہنے لگیں سو رہا ہے، ہم سے رہا نہ گیا، وہ اسے لانے کے لئے واپس جانے لگیں۔ "اسے مت اٹھائیں، بچے کو تکلیف ہوگی ہم آپ کے ساتھ خود چلتے ہیں"۔ باقی سب لوگ وہیں بیٹھے رہے۔ ہم اپنے دوست اور ان کی والدہ کے ہمراہ جھگی کے قریب پہنچے۔ پاس ہی چولہا رکھا ہوا تھا۔ بیگم صاحبہ روٹی بنا رہی تھیں۔ جھگی کے ایک طرف چکی پڑی تھی۔ قریب بوری میں گندم بھری تھی۔ کچھ برتن ایک طرف رکھے تھے۔ دوسری طرف بستر لگا ہوا تھا اور بچہ آرام سے سو رہا تھا۔ میرے پاس بچے کے لئے کچھ کھلونے بھی تھے۔ منع کرنے کے باوجود دادی نے بچے کو اٹھا دیا۔ صاحبزادہ کھلونے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر ساتھ ہو گیا۔ جھگی کے ایک کونے میں ایک بکس بھی رکھا ہوا تھا اس میں کپڑے اور قیمتی اشیاء جیسے زیور وغیرہ رکھا جاتا ہے۔ کچھ مٹکے بھی لٹکے ہوئے تھے ان میں سے کچھ پانی کے لئے ہوتے ہیں باقی میں مکھن وغیرہ رکھ لیا جاتا ہے۔ کچھ ڈبوں میں نمک، چینی اور چائے رکھی جاتی ہے۔ باہر اون کی بنی ہوئی بوریاں اور رسیاں پڑی تھیں۔ یہ گدھے پر سامان لادنے کے کام آتے ہیں۔ جھگیوں سے تھوڑی دور جانوروں کے لئے جگہ تھی۔ سردیوں میں یہ جگہ بڑی جھگی کی شکل میں بنائی جاتی ہے۔ رات کو جانوروں کی حفاظت کے لیے مرد جانوروں کے پاس ہی سوتے ہیں۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ہم نے اپنے میزبان سے

JALALI BOOKS

پوچھا کہ آپ لوگ کب تک اس جگہ مقیم رہیں گے ۔ اس سے پہلے تو ہم آپ سے "مٹھی کھوئی" کے پاس ملے تھے۔
ہمارے دوست نے بڑی وضاحت سے بیان کیا کہ کیمپ منتقل کرنے کے لئے کئی باتوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے' دراصل
یہاں پر لوگوں کے تین ہی پیشے ہوتے ہیں ۔ جانور پالنا' کھیتی باڑی کرنا یا پھر کسی جگہ محنت مزدوری مل گئی تو
روزی کمالی ۔ جہاں تک زمین کا تعلق' وہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ نجی زمین تو صرف وڈیروں یا سرداروں کی ہے' باقی
زمینیں قومی ملکیت ہیں۔ وڈیروں کی زمین تو آباد ہے' پیسے بھی انہیں کے پاس ہیں۔ قومی ملکیت کی زمینیں جزوی قبیلوں
میں بٹی ہوئی ہیں۔ تھوڑی بہت آباد ہیں تو اس میں صرف ایک ہی فصل لگتی ہے۔ جب فصل کا زمانہ آتا ہے تو لوگ
اپنے کیمپ ادھر لے آتے ہیں فصل لگائی پھر نئی چراگاہ اور روزی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ جو لوگ
وڈیروں یا سرداروں کی زمین پر کام کرتے ہیں وہ کسی حد تک ایک جگہ رہتے ہیں یا کام کے وقت آجاتے ہیں' اب
جانور پالنے کے پیشے کو لیجئے۔ جانور زیادہ تر وڈیروں کے ہوتے ہیں یا پھر خاندانوں کی ملکیت۔ خاندانوں میں
ان کا آپس میں بٹوارا بھی ہوتا رہتا ہے ۔ لیکن مال چرائی کے لئے زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں ہوتی باقی لوگوں
کو بھی روزگار کی ضرورت ہوتی ہے' اس لئے عموماً کیمپ ایسی جگہ چنا جاتا ہے' جہاں روزگار کے اور مواقع بھی ہیں
فی الحال تو مواقع یہی ہوتے ہیں کہ کسی اور کی زمینوں پر کام کرنا شروع کر دیا۔ سردیوں میں زیادہ تر لوگ سندھ
یا آس پاس کے علاقے میں چلے جاتے ہیں۔ ایک تو جانور سردیوں سے بچ جاتے ہیں دوسرے پیسے کمانے کے مواقع
بھی اچھے ہوتے ہیں۔ جب سے سڑکیں بننی شروع ہوئی ہیں ۔ آبادی کا زیادہ تر طبقہ ان پر کام کرنے لگا ہے جب
کبھی کیمپ منتقل کیا جاتا ہے تو ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے ورنہ لوگ منتشر ہونا شروع ہو جاتے
ہیں۔ اب "حلق واجا" کی صلاحیت اور خوبی اسی میں ہے کہ کس طرح وہ سب کو اکٹھا رکھتا ہے۔ "حلق واجا" اپنے
اپنے قبیلوں کے وڈیروں کو جواب دہ ہوتے ہیں۔ زیادہ تر وڈیرے سال میں کچھ عرصہ اپنے حلقوں کے ساتھ گزارتے
ہیں کیونکہ اپنے جانوروں کو خود بھی دیکھنا ہوتا ہے ۔ پھر اپنی زمینوں کے لئے بھی آدمیوں (مزدوروں) کی
ضرورت ہوتی ہے ۔ ایک طرح سے وڈیروں کی قوت یا جزوی قبیلے کی طاقت اس پر منحصر ہوتی ہے کہ حلقے
کس طرح اکٹھے ہو کر رہتے ہیں اور یگانگت قائم رہتی ہے' اس طرح عام آدمی کو بھی فائدہ ہوتا ہے اور اسے اپنی جان'
مال اور خاندان کی بھی حفاظت مہیا ہوتی ہے ۔ اس قسم کے ماحول میں حفاظت مہیا ہونے کا اور کوئی طریقہ

بھی نہیں۔ اب ہمارے دوست نے بتانا شروع کیا کہ "حلق" کے لوگ زیادہ تر اکیلے ہی کام کرتے ہیں اکٹھا کام تو اس وقت ہوتا ہے جبکہ بھیڑیوں کی اون اُتاری جاتی ہو یا پھر جانور گم ہو جائیں یا کوئی باہر والا کیمپ کی حفاظت پر ہاتھ ڈالے۔

عورتیں اکثر ایکدوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں جیسے کہ پانی لانا ہو لکڑیاں کاٹ کر لانی ہوں یا "پیش" کے پتے اکٹھے کرنے ہوں جس کی چٹائیاں۔ رسیاں اور چپل بنے جاتے ہیں۔ کھانا وغیرہ تو خیر وہ اکیلے ہی بناتی ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر کپڑے بنانے ہیں ایکدوسرے کی بھی مدد کرتی ہیں۔

جانور چرانے کے لئے عموماً زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آٹھ نو دس آدمی اس کام کو بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔ بچے اور بوڑھے بھی یہ کام کرتے ہیں۔ ایسے علاقے میں جہاں لڑائی جھگڑے کا ڈر ہو تو پھر حفاظت کے لئے مال چرائی کے سلسلے میں زیادہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ صبح سے چلے جاتے ہیں اور شام کو واپس آتے ہیں۔

ہمارے میزبان بتانے لگے کہ آج کل ہم لوگ اپنے قبیلے کی مشترکہ زمینوں کے قریب ہیں اور موسم بھی فصل لگانے کا ہے تو کافی آدمی کھیتی باڑی میں مصروف ہیں۔ جب ایک دفعہ فصل لگ جاتی ہے تو پھر نئی چراگاہ کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ فصل کاٹنے کے وقت پھر لوگ واپس آجاتے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اگر بارش نہ ہوئی اور گھاس کی کمی رہی تو پھر ہم جہاں کہیں بھی ہوں۔ کچھ آدمی فصل لگانے یا کاٹنے کے لئے قومی زمین پر ضرور آتے ہیں۔ اب جو لوگ اس طرح کام کرنے کے لئے آتے ہیں ان کے ساتھ بیوی اور بہنیں بھی ہوتی ہیں تاکہ ان کا کھانا وغیرہ پکا سکیں۔ عموماً حلقے کے لوگ باہر ہی رہتے ہیں کیونکہ دنیا کے اور کام بھی ہیں۔ سودا سلف لانا ہوتا ہے۔ نئی چراگاہوں کی تلاش بھی ضروری ہے۔ وڈیرے سے ملاپ بھی رکھنا ہوتا ہے' ان کے بارے میں بھی "حال" دینا ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی لازمی ہے کہ اور قبیلوں کا بھی پتہ رکھا جائے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ کیمپ میں بہت کم آدمی موجود ہوتے ہیں"۔

"اب آپ کو تو خود معلوم ہے کہ ہمارے یہاں بڑی عزت ہے۔ خدا کا فضل ہے کہ کچھ خود رو جڑی بوٹیاں یہاں ملتی ہیں جنہیں ہماری عورتیں اکٹھا کر کے لاتی ہیں اور ان کی سبزی بناتی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم کی

خودرَو پیاز بھی ہے۔ اِس کے بارے میں ایک قصہ مشہور ہے۔" ایسے قصے سننے کے تو ہم بہت شوقین ہیں ہم ذرا اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ہمارے دوست کہنے لگے کہ" ایک غریب عورت کسی وڈیرے کے گھر کام کرتی تھی۔ عورت کے کئی بچے تھے جب وہ آٹا گوندھتی تو جان کر ہاتھ بھرے رکھتی۔ اِن ہاتھوں پر جو آٹا رہ جاتا ہے اسے دھو کر اپنے بچوں کے لئے روٹی بناتی۔ ایک روز وڈیرا اس کی اس حرکت پر ناراض ہوا۔ عورت کو غصہ آیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو زور سے جھٹکا دیتے ہوئے دعا مانگی کہ خداوند تعالیٰ تو ہی کچھ بندوبست کر تاکہ میرے بچوں کا پیٹ بھر سکے اور وہ آرام سے سو سکیں۔ جب عورت نے اس طرح دعا مانگی اور ہاتھوں کو جھٹکا تو بائیں ہاتھ کا آٹا جہاں گرا وہاں پیاز اُگ آئی اور دائیں ہاتھ کی جھٹکن پر "پیش" اور جنگلی بوٹیاں جیسے تھوہر وغیرہ آگے۔ موسم بہار میں بچے "پیش" کا ساگ کھاتے۔ برسات میں ان کے بیج اور سردیوں کے آخر میں ان کا پھل۔ بہار کے موسم میں پہاڑوں کے دامن میں تھوہر کی کچی ڈنڈیاں عام ملتی ہیں جنہیں وہ کچا کھاتے ہیں اور سردیوں میں وہ انہیں اُبال کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ لیکن پیاز ہر موسم میں ملتی ہے جسے وہ بے حد پسند کرتے ہیں"۔

کہانی سُنانے کے بعد ہمارے دوست بتانے لگے کہ "کیمپ کے لوگ جب اس طرح آتے جاتے ہوں اور پھر ہمارے کیمپ بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہوں تو کسی آدمی کا پتہ چلانا کہ وہ کس وقت کہاں ہے مشکل ہوتا ہے اس طرح ہم سب کی آبادی کافی پھیلی ہوئی ہوتی ہے لیکن پھر بھی ایک اجتماعی معاشرہ قائم رہتا ہے۔"

اِس قسم کے ایک اجتماعی معاشرے کا ایک اہم پہلو مشترکہ جانوروں کے رکھنے کا رواج اور مشترکہ کھیتی باڑی کرنے کا طریقہ ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عام آدمی کی تو کوئی زمین ہوتی نہیں صرف "قومی" زمین ہے۔ جس میں پورے جزوی قبیلے کا حصہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ایک جزوی قبیلہ بڑے خاندان کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں اجتماعی فائدہ زمین اور جانوروں کے پلنے سے ہوتا ہے۔

مشترکہ جانور رکھنے والے ایک ہی جگہ نہیں رہتے نہ ہی ان کا کھانا ایک جگہ پکتا ہے اور نہ ہی ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ ہر ایک شادی شدہ عورت عموماً اپنا گھر علیحدہ کرتی ہے وہ اپنے گھر کا کھانا خود ہی بناتی ہے، مرد کھانا عورتوں سے علیحدہ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ صرف دعوت یا کسی تقریب کے موقع پر مرد کھانا بنانے میں ہاتھ بٹاتے

ہیں۔ مرد ایک جگہ پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں اور عورتیں علیٰحدہ جگہ اکٹھی ہو کر ایک ساتھ کھانا کھاتی ہیں۔

ایسے معاشرے میں حکم تو وڈیرے ہی کا چلتا ہے۔ یہ عہدہ تو اسے ورثے میں ملتا ہے۔ اسی طرح ایک خاندان میں باپ یا بڑے بیٹے کا حکم مانا جاتا ہے بشرطیکہ ان کے شجرے میں کوئی خرابی نہ ہو۔ اگر خرابی نہ بھی ہو تو طاقت حاصل کرنے کے لئے آپس میں جھگڑے بھی کھڑے ہو جاتے ہیں مثال کے طور پر چراگاہوں میں یا چراگاہوں کے بٹوں میں بعض اوقات یہ خلفشار باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور پھر یہ گروپ ٹوٹنے لگتے ہیں۔ اگر جنگ نہ بھی ہو تو اکثر لوگ حلق یا گروپ سے ایک قسم کی علیٰحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ معاشرہ کوئی نیا تو نہیں ہے جہاں اشتراک کا یہ طریقہ ہو تو پھر اگر کوئی اشتراک سے علیٰحدہ ہونا چاہتا ہے تو اس کی بھی کوئی صورت ہوتی ہوگی۔

ہمارے دوست نے وضاحت سے بتایا کہ "کسی بھی مری کو حق حاصل ہے کہ اپنے جزوی قبیلے کی زمین چاہے چراگاہ یا ویسے ہی پڑی ہوا استعمال کر سکتا ہے۔ یہ حق اسے اپنے والد کے توسط سے پہنچتا ہے لیکن جہاں تک جانوروں کا تعلق ہے۔ وہ اپنے والد کے جانوروں میں سے اپنا حق لے سکتا ہے اس کا تعین ایسے ہوتا ہے کہ اگر ایک باپ کے چار بیٹے ہیں تو وہ جانوروں کے چار حصے کرتا ہے۔ دو حصے وہ اپنے پاس رکھتا ہے اور ایک ایک بیٹوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اگر ایک بیٹا اپنا حصہ لے کر باپ سے علیٰحدہ بھی ہو جائے تب بھی باپ کے مرنے کے بعد اسے باپ کے جانوروں میں سے حصہ ملتا ہے۔"

اب کافی دیر ہو چکی تھی ہم نے اپنے دوستوں سے اجازت چاہی۔ مری رواج کے مطابق جہاں سے وہ ہمیں لے کر آئے تھے وہیں چھوڑ گئے۔ یہاں کے معاشرے کا سرسری جائزہ ہم نے آپ کے سامنے پیش کر دیا اب آئندہ سطور میں اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ویسے ہم آپ کو بتانا بھول گئے کہ مری دوستوں کی تجویز کردہ سڑک ایک ہفتے میں مکمل کر دی گئی تھی۔

JALALI BOOKS

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
عمرانی
JALALI

عمرانی
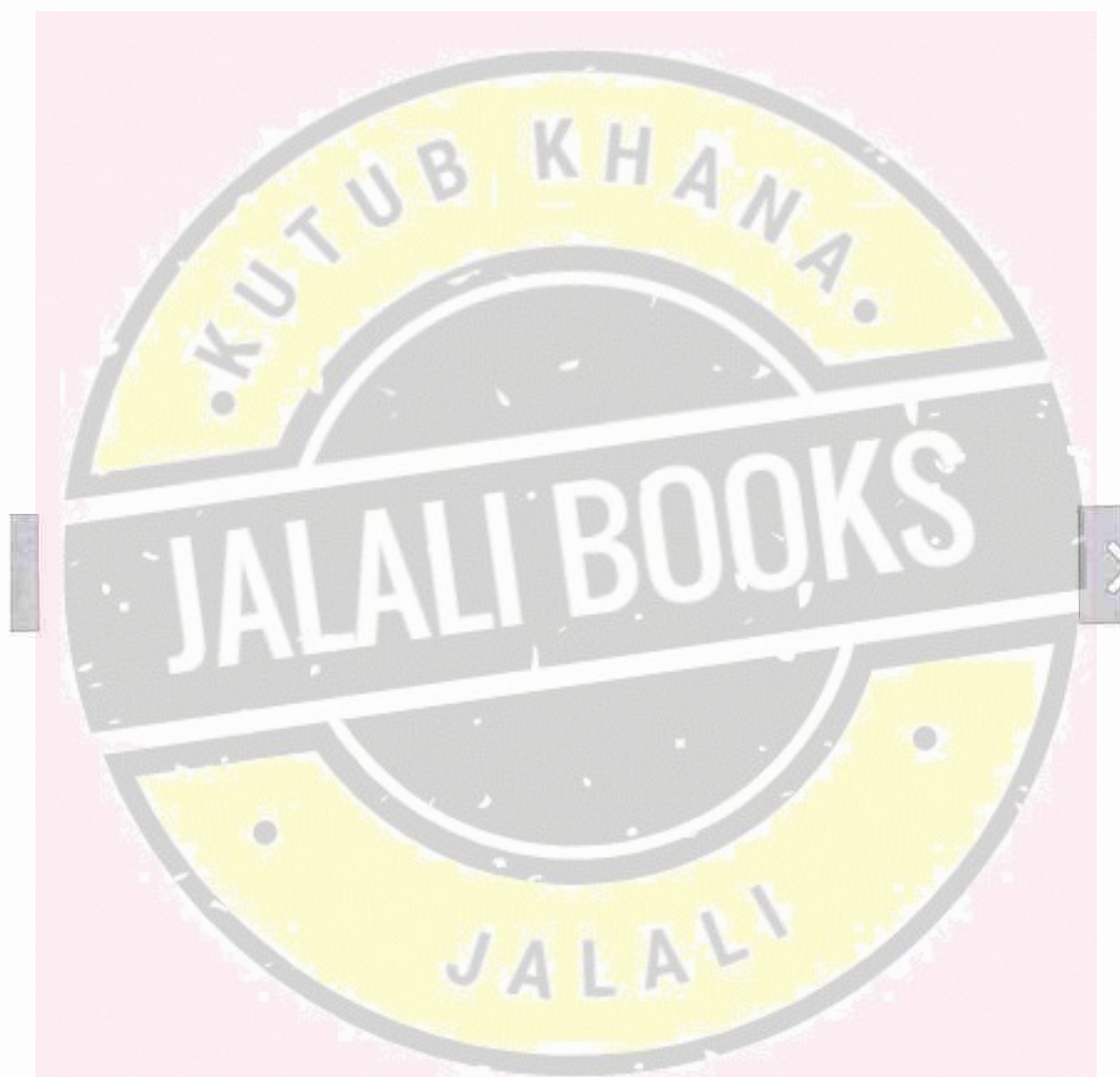
دنیا کا ہر معاشرہ مخصوص انفرادی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ معاشرے کی انفرادی حیثیت، تنازع رہن سہن اخلاقی اور معاشی قدروں اور دیگر امور پر مبنی ہوتی ہے۔ ایک معاشرتی نظام کو برقرار رکھنے یا اس کی صورت تبدیل ہونے میں دو قسم کے دباؤ ہمیشہ سے اثر پذیر ہوتے ہیں؛ ایک مثبت دباؤ ہوتا ہے۔ جسے انگریزی میں "FUSION FORCE" کہتے ہیں۔ یعنی معاشرتی نظام چاہے کیسا بھی ہو مگر کچھ تو امور ایسے ہوتے ہیں جو کہ اس کے برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ باہر کے اثرات چاہے کتنے ہی بہتر کیوں نہ ہوں ان کو معاشرے میں داخل ہونے سے باز رکھتے ہیں۔ مثبت دباؤ کے امور زیادہ تر نفسیاتی، عمرانی، معاشی اور تاریخی ہوتے ہیں اس کے برعکس منفی دباؤ "FUSION FORCE" ہوتا ہے جو کہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت معاشرے میں تبدیلی لانے کا حامل ہوتا ہے۔ نفی سے مراد ہمیشہ کوئی مضر اثر نہیں ہوتا بلکہ یہ نفی کرتا ہے رائج شدہ نظام کی۔ اس طرح مثبت سے مراد ہمیشہ درست اثر ہی نہیں ہے بلکہ یہ رائج شدہ نظام کو برقرار رکھنے کا حامل ہوتا ہے۔

مری معاشرہ پر تو ہم ایک نظر ڈال چکے ہیں، اب اس کا تجزیہ کرتے ہیں کہ آخر یہ نظام اب تک کیوں رائج رہا اور کیا یہ نظام آئندہ برقرار رہ سکے گا؟ اس طرح مثبت اور منفی دباؤ دونوں کا تجزیہ ہو جائے گا پہلے

مثبت دباؤ کی خصوصیات پر نظر دوڑاتے ہیں جو کہ اس معاشرے کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہیں۔

و: علاقے کا جغرافیہ :- یہ علاقہ صدیوں سے الگ تھلگ رہا ہے۔ میدان کم، پہاڑ زیادہ۔ پانی کی کمی اور نباتات اس قسم کی کہ جانوروں کی افزائش آسانی سے ہو سکتی ہے۔ ذرائع آمد و رفت محدود، باہر کی دنیا سے تعلق تقریباً غیر موجود۔

ب: تاریخ : ایک الگ دنیا ہے جو صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ تعلیم کا فقدان۔ حالات اور جغرافیہ نے ساتھ دیا۔ عام پیشہ جانور پالنا یا پھر باہر والے کے ساتھ زور آزمائی۔

ج: نفسیاتی عمل :- جب یہ حالات صدیوں برقرار رہے تو ایک علیحدہ دنیا آباد ہو گئی۔ ذات، خاندان اور مال کا بچاؤ تو فطری تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے یکجہتی اور یگانگت ضروری تھی تو وہ قائم ہو گئی لیکن صرف اپنے قبیلوں تک۔ تعلیم کی کمی۔ جدید تقاضوں سے نا آشنائی۔ ان امور نے آمریت کو جنم دیا۔ آمریت ظالم آمریت تھی۔ جغرافیہ اور تاریخ کو دیکھتے ہوئے توقع بھی یہی تھی۔ باہر والوں پر شک اور آپس میں بھی شک و شبہ۔ آمر نے اگر کمزوری دکھائی تو نئے آمر نے جنم لیا اور حکم چلایا۔ چاہے آپس میں لڑائی ہو مگر باہر والوں کے سامنے سینہ سپر۔ اسی نفسیاتی عمل کا انگریز نے خوب فائدہ اٹھایا اور رائج شدہ نظام کو فروغ دیا اور ایک حد تک بنیاد فراہم کی۔

د: عمرانی عمل :- آمریت کو جب فروغ ہوا تو ایک ہی آمر نہیں تھا۔ تمنداروں اور وڈیروں کی شکل میں بھی آمر ابھرے۔ ادھر آمروں نے اپنے اپنے گروپ اکٹھے کئے۔ اب عام آدمی کو تو حفاظت چاہیے۔ جغرافیائی لحاظ سے آبادی ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتی۔ مال مویشی کا پیٹ بھرنے کے لیے گھومنا پھرنا ضروری ہے، اگروپ جزوی قبیلوں کی شکل میں گھومتے ہیں۔ انفرادی حفاظت گروپوں کی شکل میں حاصل ہوتی ہے اور گروپوں کی حفاظت قبیلے کی شکل میں۔ گھومنے پھرنے اور جانور چرانے کے دوران آپس کے جھگڑے اور باہر والوں سے جھگڑے تو ہر ایک کا سپاہی ہونا ضروری ہے۔ ایسے ماحول میں انصاف اور اتحاد قائم رکھنا آمر ہی کا کام ہے یہ تقاضے خوش اسلوبی سے بھی طے ہو سکتے ہیں اگر حکومت ہو، تعلیم ہو۔ ذرائع آمد و رفت آسان ہوں۔

ذ: ذرائع معاش : اس کا ذکر تو آپ نے پہلے پڑھ لیا۔ زمین اور چراگاہیں قومی ملکیت ہیں۔ ماسوائے سرداروں اور وڈیروں کی زمینوں کے۔ مال چرائی تو پھر اکٹھے ہو کر گروپوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ محنت مزدوری کے ذرائع

محدود، سردار، قبیلے اور وڈیروں کا اثر ان حالات میں یقیناً زیادہ ہوگا۔
اب منفی دباؤ کے امور کا جائزہ لیتے ہیں جس کا اثر یہاں کے رائج شدہ معاشرے پر مرتب ہونا لازمی ہے
ا: **مشترکہ ملکیت** : جیسا آپ نے پہلے پڑھا ہے کہ زمین اور جانور مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں۔ پہلے زمین کی ملکیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ زمین زیادہ تر بنجر پڑی ہے۔ آبادی کے ساتھ ساتھ زمین کا تناسب بھی کم ہوگیا ہے اب زمین کو کون ٹھیک کرے، اس میں حصے دار اتنے ہیں کہ اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ ایک مضبوط گروپ مل کر زمین پر قبضہ کر لیتا ہے۔ جب گروپ کی آبادی بڑھتی ہے تو یکجہتی ٹوٹنی شروع ہو جاتی ہے۔ جانوروں کی مشترکہ ملکیت کا بھی تقریباً یہ ہی عالم ہے جہاں خاندان بڑھا بٹوارے شروع ہوئے جب بٹوارے ہوگئے تو اتحاد پر بھی اثر پڑا۔ اس طرح جب گروپ ٹوٹتے ہیں تو نئے وڈیرے ابھرتے ہیں۔ اور اقتدار کے لئے رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔
ب: **ذرائع معاش** :۔ ذرائع معاش چونکہ محدود ہیں اس لئے لوگ اکثر اپنے علاقے کو چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں یہ منتقلی بھی گروپوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے ہے جو بھی یہاں سے جاتا ہے مشکل ہی سے دوبارہ واپس آتا ہے۔ مگر حال میں اس آبادی کا انخلا کچھ زیادہ ہی ہوگیا ہے کچھ لوگ پڑھ لکھ بھی گئے ہیں مگر وہ یہاں واپس آنے کے لئے تیار نہیں ان کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ پڑھا لکھا آدمی تو جدید نقاضوں کی طرز پر سوچے گا۔ اس سے وڈیروں کے اپنے اثر و رسوخ پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا ان پڑھے لکھے آدمیوں کا یہاں رہنا مشکل ہے جس طبقے کا ذکر میں کر رہا ہوں۔ ان کا تعلق وڈیروں کے خاندان سے نہیں ہے۔ جب سے ترقیاتی کام شروع ہوئے ہیں گروپوں کی یکجہتی میں بھی فرق آیا ہے۔ آج سے دو سال پہلے جو ترقیاتی کام ہوتے تھے تو وڈیروں کو پیسے بانٹ دیئے جاتے تھے اور وہ کام کرانے کی ذمہ داری سنبھالتے تھے کام مشکل سے ہی ہوتا تھا۔ خاندان میں پیسہ بانٹ دیا جاتا تھا۔ مگر اب مزدوری زیادہ تر عام قبائلی کے ہاتھ میں جاتی ہے پہلے لوگ اپنے گروپوں میں ہی رہ کر گزر اوقات کرتے تھے مگر اب بے روزگار جہاں کام ہو رہا ہو آجاتے ہیں اور وہیں رہتے ہیں لیکن یہ سب کچھ عارضی ہے اصل بات کام کا ملنا ہے ورنہ جب بھی مزدوری ختم ہوئی لوگ اپنے اپنے گروپوں میں واپس ہو جاتے ہیں

لیکن ایک بات ضرور ہے کہ دولت پہلے چند کے ہاتھ میں تھی اب بٹنے لگی ہے یہ تو صرف آغاز ہی ہے۔

ج۔ **انتظامیہ** :آج سے دو سال پہلے تک انتظامیہ پرانے طرز پر تھی جو انگریز سے یہاں ورثے میں ملی تھی انتظام سردار اور وڈیرے سنبھالتے تھے مگر حکومت کے توسط سے اس کا مطلب یہ ہوا کہ سردار اور وڈیروں کی طاقت لامحدود اس نظام کا بنیادی ستون ہی گروپ اور اس کا وڈیرہ تھا۔ یہ نظام کم خرچ تو ہے مگر عام آدمی کے لئے سود مند نہیں ۔اس کی وضاحت تو پہلے ہو چکی ہے مگر اب جب نظام کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تو آمریت راہ میں حائل ہے ۔جہاں ایک مدت سے آمریت قائم ہو تو بدلتے بدلتے دیر لگے گی۔

۴۔ **تعلیم** :۔ تعلیم کو جان بوجھ کر روکا گیا۔ تعلیم سے انسان کی دماغی وسعت بڑھتی ہے اس کے سامنے چھوٹے گروپوں کی محدود دنیا نہیں ہوتی۔ پڑھا لکھا آدمی آمریت کو کبھی قبول نہیں کرتا اور وہ بھی وڈیروں کی آمریت۔

۵۔ **ذرائع آمد و رفت** : انسان تعلیم صرف کتابوں یا اسکولوں سے ہی حاصل نہیں کرتا بلکہ سفر اور دوسروں سے مل کر بھی کافی کچھ سیکھتا ہے اب جبکہ ذرائع آمد و رفت قائم ہوئے ہیں تو لوگوں کی نظری اور دماغی وسعت میں بھی فرق پڑا ہے، ہر ایک باہر والا کافر اور ظالم ہی نہیں ہوتا ۔ممکن ہے وہ بہتر انسان ہو میل ملاپ سے بھی انسان کی پہچان ہوتی ہے اور باہمی ربط قائم ہوتا ہے ۔بری معاشرہ کے بارے میں ذاتی تجزیہ آپ کے سامنے ہے، اگر نظام کو بدلنا ہے تو ان تقاضوں کو مد نظر رکھنا ہوگا تاہم یہ حقیقت ہے کہ صدیوں کی آمریت بدلتے بدلتے بھی اپنا وقت لے گی۔

JALALI BOOKS KUTUB KHANA

صنفِ نازک سے سلوک
KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

بھیڑوں کو چراگاہ میں چرا رہے ہیں

صنفِ نازک سے سلوک

مری معاشرے کی ایک ہلکی سی تصویر آپ کے سامنے پیش کی گئی پتہ نہیں کہاں تک ہم اس میں کامیاب ہوئے۔ اب ذرا وضاحت سے کچھ اہم نقوش کو قریب سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے ایک مری دوست ہیں جو ہمیں بہت ہی عزیز ہیں وہ مانے ہوئے خاندانی وڈیرے ہیں ذاتی دوستی کی وجہ ان کا رتبہ نہیں بلکہ ان کی کچھ اپنی خوبیاں ہیں مثلاً انہیں نجی فائدے کی نسبت عوام کی بھلائی زیادہ عزیز ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے لوگوں کی بات کرتے ہیں اپنی ذات کو پسِ پردہ ہی رہنے دیتے ہیں۔ ہر ایک شخص میں خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ہمارے دوست میں بھی ہیں۔ وہ اپنی کسی کمزوری کو خامی نہیں سمجھتے بلکہ اپنے رواج کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہمیں وڈیرہ کون سمجھے اور عزت کیسے ہو۔ ہمارے باپ دادا نے اس سے زیادہ کیا تھا اور یہ تو ہماری عزت کا معیار ہے۔ رواج تو بہر حال ہمیں قائم رکھنا ہے۔ یہ تو آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ مگر ہم اس کی تائید نہیں کرتے مگر آپ کون تائید یا نا تائید کرنے والے۔ ہمارے دوست کی چار بیویاں اور کچھ باندیاں ہیں۔ چار بیویاں تو چلئے شرع کی رُو سے جائز ہوئیں مگر یہ باندیاں کیسی دراصل یہاں پر عورت کی کچھ زیادہ وقعت نہیں اور ہو بھی کیسے۔ جتنا غیر ترقی یافتہ علاقہ۔ اتنی ہی

بے چاری صنفِ نازک مظلوم ۔ جب ہمارے بڑے شہروں میں جہاں تعلیم بھی ہے اور دوسری سہولتیں بھی مہیا ہیں۔ عورتوں کو اب بھی پورے حقوق حاصل نہیں تو صاحب یہ علاقہ تو اب بھی پندرہویں صدی میں ہے ۔

ایک سچا واقعہ بھی اس سلسلے میں سُن لیں ۔ یہ واقعہ شاید ۱۹۶۴ء کا ہے جبکہ حکومت کے خلاف تیاریاں زوروں پر تھیں ۔ ایک "اَپ اسٹارٹ" قسم کے وڈیرے ان کارروائیوں میں پیش پیش تھے ۔ یہ خاندانی وڈیرے تو نہیں تھے مگر زور دکھایا اور زبردستی اپنا عہدہ سنبھال لیا ۔ یہ تو ہونا تھا کیونکہ زور انہیں کا تھا ۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے اب تگڑے وڈیروں سے ٹکر لی اور انہیں نیچا دکھایا اور کیا یہ انہوں نے ہمارے دوست پر بھی ہاتھ ڈالا ۔ ہوا یہ کہ کچھ حالی موالی اکٹھا کئے اور ایک سرغنے کو پیسے دے کر کچھ بھیڑیں زبردستی اٹھوالیں ۔ اگر ایک وڈیرے کی بھیڑیں اس طرح چلی جائیں تو اس کی عزت ختم ۔ دنیا طعنہ دیتی ہے ۔ ہمارے دوست نے بھی دوسرے ہی دن سرغنے کی بیوی اٹھوالی اور کر لیا اسے حرم میں داخل اور پھر اپنے حریف کو پیغام بھیجا کہ اپنے باپ کی اولاد ہو تو لے جاؤ عورت کو واپس ۔ اس واقعہ کو دس سال ہونے کو آئے ۔ سرغنہ اب تک سر پیٹتا ہے کہ دلوا دو میری بیوی مگر کون دلوائے ۔ ہمت ہے تو لے جاؤ ۔ یہی یہاں کا قانون ہے ۔ جانے دیجئے اس قصے کو بس بات سے بات نکل آئی ۔ ہاں اس نکتے میں ایک باریکی ہے وہ یہ کہ یہاں سب کی متفقہ رائے یہ ہے کہ اس طرح ایک عورت کو باندی بنانا جائز ہے ۔ باندیاں بھی جنگوں سے حاصل ہوتی ہیں ۔ ویسے یہ ہماری رائے نہیں ہے ۔ اس پر تو اہلِ علم ہی بحث کر سکتے ہیں ۔

ان شادیوں یا باندیوں پر کیا اعتراض کیا جا سکتا ہے مگر ایک بات ضرور ہے کہ ایک طرف تو یہ بہتات اور دوسری طرف جوان آدمی شادی کو ترستے ہیں ۔ اچھی خاصی عمر کے لوگ کنوارے پھرتے ہیں اور اس فکر میں کوشاں کہ پیسوں کے بغیر کس طرح شادی کریں ۔ آج کل تو کم سے کم بھی "لب" کی رقم چھ ہزار سات ہزار ہے "لب" ایک قسم کا حق مہر ہے جو کہ شادی کے وقت لڑکی کے والدین کو ادا کیا جاتا ہے ۔ بیچاری عورت سارا ہی کام کرتی ہے ۔ بچوں کو پالتی ہے گھر کو سنبھالتی ہے ۔ جس میں کھانا پکانا وغیرہ سب ہی شامل ہے جانوروں کی دیکھ بھال بھی اسی کے سپرد پہاڑیوں سے لکڑیاں کاٹ کر لاتی ہیں، پورے گھر کے لئے میلوں سے پانی بھی

لاتی ہیں اگر مرد کھیتی باڑی کرتا ہو تو اس کی دیکھ بھال بھی اسی کا ذمہ۔ بھائی سارا کام جب عورت کرتی ہے تو مرد۔ مرد کا کام صرف عورت کی حفاظت' لڑائی جھگڑوں میں حصہ لینا۔ ہمارے ایک دوست کہنے لگے کہ ایک طرح سے آپ دیکھیں تو ایک عورت سے کام نہیں چلتا۔ ایک تو چاہیے صرف مرد کے اپنے لئے اور باقی کے لئے کام اتنے ہیں کہ انہیں ویسے ہی فرصت نہیں ملتی۔ جیسے جیسے مال بڑھتا جاتا ہے' اس کی دیکھ بھال کے لئے بھی زیادہ لوگ چاہیں۔ کام میں ترقی ہوئی تو دیکھ بھال کے عملے کو بھی بڑھایا۔ یہی ایک سبب ہے کہ یہاں کم عمری میں شادیاں نہیں ہوتیں۔

یہاں دو رواج عام ہیں' آپ بھی سن لیں۔ پہلا رواج تو یہ ہے کہ عورت چاہے کتنی ہی عمر کی کیوں نہ ہو بے شک اس کی اپنی اولاد بھی ہو اپنے خاوند کے انتقال کے بعد میکے واپس آجاتی ہے۔ اگر وہ شادی کے قابل ہو تو پھر لب لے کر اس کی شادی کی جاتی ہے' دوسرا رواج بھی اتنا ہی تکلیف دہ ہے وہ یہ کہ جب لڑکی کی شادی کی جاتی ہے تو اکثر یہ طے کر لیا جاتا ہے کہ لڑکی کے بطن سے جو پہلی لڑکی ہو گی وہ نانا کی ملکیت لہٰذا نانا صاحب اس نواسی کو واپس لیتے ہیں اور پھر "لب" ان کا حصہ۔

یہ فرسودہ رواج ابھی تک کیوں رائج ہیں۔ تعلیم کی کمی پھر معاشی اور سماجی پسماندگی' اس کی ایک اور وجہ بھی ہے جس کا تعلق علم معاشیات سے ہے آپ کو تعجب تو ضرور ہو گا۔ وہی سپلائی اور ڈیمانڈ کی ہیرا پھیری جس نے دنیا کو ہلا دیا ہے۔ ۱۹۰۰ء کی مردم شماری کے تحت بالغ مری مردوں کی تعداد ۶۴۷۸ تھی جب کہ عورتیں صرف ۵۰۳۷ تھیں یعنی ۱۴۴۱ کا خسارہ۔ یہ خسارہ اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے جب کھاتے پیتے گھرانے کی چار چار بیویاں اور حرم بھی۔

عورت کی شادی کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ مرد ہم پلہ قبیلے سے ہو۔ مرد کو آزادی ہے جہاں شادی کرے۔ مرد کے لئے تو خیر آزادی ہی آزادی ہے۔ غریب عورت ہی ہے جس پر سارے ستم ٹوٹتے ہیں وڈیرے لوگ عموماً ایک شادی قریب کے پٹھان قبیلوں میں کرتے ہیں' شاید ان کا تعلق حسن سے ہو کیونکہ یہ عورتیں نسبتاً خوبصورت ہوتی ہیں۔ آخر کو یہ لوگ پکے گھر بنا کر رہتے ہیں۔ گھومنے پھرتے کم ہی ہیں۔ ہم نے کسی مری عورت کی شادی غیر قبیلے میں نہیں سنی اس بارے میں رواج شاید معاشیات یا معیار کا دخل ہو۔

غریب عورت کا وراثت میں بھی کوئی حصہ نہیں ہوتا لیکن عجیب بات ہے کہ جب انگریز کی حکومت تھی تو اس نے یہ قانون ضرور پاس کیا تھا کہ اسلامی قانون بجنسہٖ یہاں پر بھی نافذ ہونے چاہئیں۔ قانون تو نافذ ہو گیا مگر صرف کاغذ پر، اب اسے عمل میں کون لائے یہ ہمیں انگریز کے گزیٹیئر میں ایک مقدمے کا قصہ پڑھ کر معلوم ہوا۔

ہمارے ایک مری دوست ہیں جو کافی صاحبِ حیثیت ہیں۔ کسی زمانے میں مانے ہوئے فراری تھے ہمیں پتہ چلا کہ ان کی بہن کا انتقال ہو گیا۔ ازراہِ ہمدردی ان سے افسوس ظاہر کیا۔ بڑی زور سے ہنس کر بولے "ارے صاحب جانے دو عورت کے انتقال پر افسوس۔ ہمارے ہاں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے بس جیسے جانور مر گیا۔ وہی بات ہے" ہم تو اظہار ہمدردی کر رہے تھے ہمیں بجد غصہ آیا کہ بہن کا یہ احترام مگر ان رواجوں کا کیا کیجئے؟۔

ان ساری باتوں کے باوجود عورت کو یہاں کی غیرت کے معاملے میں بڑا دخل ہے عورت چاہے کسی بھی قبیلے کی ہو وہ سب کی عزت ہوتی ہے۔ زیادہ تر لڑائیاں اور جھگڑے عورت کی عزت سے ہی تعلق رکھتے ہیں کسی کی عزت کو خاک میں ملانا ہو تب بھی اس بے چاری کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس ضمن میں خودداری کو زیادہ دخل ہے۔ مرد تو پھر مرد ہوا۔ عورت کی حفاظت اس کا اولین فرض ورنہ غیرت کو دھچکا لگتا ہے غیرت آسانی سے نہیں گنوائی جا سکتی۔ اگر غیرت نہ ہو تو یہاں رہنا محال۔ پھر صنفِ نازک پر بھی رعب رکھنا ہے۔ رعب اسی حالت میں برقرار رہتا ہے کہ ہر طرح سے اسے دبا کر رکھا جائے۔ نفسیاتی بھی اور معاشی بھی ہم اپنے ایک دوست سے ملنے گئے وہ اس وقت ایک چراگاہ میں مقیم تھے۔ پہاڑ کے دامن پر جھگیاں نصب تھیں ماشاء اللہ ان کی تین بیویاں تھیں۔ ہر ایک کی جھگی علیحدہ علیحدہ ان کی ذمہ داری کا مال بھی علیحدہ۔ مال سے مراد بھیڑیں بکریاں ہیں۔ ہمارے دوست ہمیں دور سے دیکھ کر بڑے شاہانہ انداز میں ہماری طرف بڑھے عموماً جب وہ ہم سے ملنے آتے تھے تو بڑی انکساری سے کام لیتے تھے ان کے چلنے اور ملنے کا انداز بھی جدا ہوتا تھا مگر آج آہستہ آہستہ جھگیوں پر نظر مارتے ہوئے آگے آئے، ان کا کمر بند نیچے زمین تک لٹکا ہوا۔ ہم سمجھے کہ یہ نادانستہ بات ہو گی۔ قریب آئے تو گلے ملے۔ ہمیں جلدی تھی اس لئے انہیں جیب میں ٹھالیا

کہ آرام سے بات ہو جائے گی پہلے تو ہم نے انہیں مذاقاً ٹوکا کہ جناب آپ کا کمر بند لٹکا ہوا ہے کہیں پیر کے نیچے آگیا تو آپ گر جائیں گے۔ بڑے زور سے ہنسے۔ نہیں صاحب یہ تو ہماری مردانگی کی نشانی ہے اگر ہم اس طرح اپنی عورتوں کے سامنے سے نہ گزریں تو وہ بُرا مانتی ہیں کہ پتہ نہیں کیا بات ہے کہ آج وڈیرہ ڈھیلا ہے۔ ان کا اس طرح چلنا بھی اپنی عورتوں کے روبرو بالکل جائز۔

ایک دفعہ ہم کھانے پر گئے ہمارے ساتھ اور مری دوست بھی تھے۔ کھانے پر عموماً سجی ہوتی ہے سجی کی خوبیاں اور طریقے ہم نے بیان کر دیے۔ یاد دہانی کے لیے بھیڑ کے بچے کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے کر لیے جاتے ہیں اور اسے چاروں طرف آگ جلا کر روسٹ کر لیا جاتا ہے۔ جب سجی آئی تو اس میں پسلیاں بھی تھیں آپ کو تو معلوم ہے کہ پسلیوں میں گوشت برائے نام ہی ہوتا ہے۔ سارے مری دوست قہقہہ لگا کر ہنسے اور میزبان سے یک زبان ہو کر بولے "ارے ہم کوئی عورت ہیں یہ عورت کا حصہ یہاں کیوں بھیجا ہے۔" ہمارے میزبان بہت ہی جھینپے در اصل یہ سخت غلطی ہو گئی تھی۔ اب یہ کہ عورت کا حصہ کھانے میں بھی کم ہی ہوتا ہے۔ یعنی پسلیاں۔

ایک عجیب بات ہے گو غریب لڑکیوں کو بھی بھاری قیمت یا "لب" پر گھر سے رخصت کیا جاتا ہے مگر پھر بھی لڑکی کی پیدائش پر کچھ خوشی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ افسوس کیا جاتا ہے۔ عام آدمی کو تو خوشی ہوتی ہوگی کیونکہ بہت سوں سے ہم نے اس بارے میں استفسار کیا۔ ان کے کچھ ملے جلے تاثرات تھے "اللہ کی دین ہے مالی لحاظ سے فائدہ ضرور ہوتا ہے مگر ان کی حفاظت بڑی ذمہ داری ہوتی" ہاں کھاتے پیتے لوگ تو لڑکیوں کی پیدائش پر ضرور غمگین ہوتے ہیں۔ بلکہ ماں بے چاری پر ایک قسم کا طنز بھی کرتے ہیں۔ ہمارے ایک عزیز دوست ہیں ہفتے میں ایک بار ضرور ملنے آتے ہیں حالانکہ ان کا گھر کوہلو سے بیس میل دور واقع ہے عمر تقریباً ستر سال ہے۔ چھوٹا قد لمبی داڑھی بڑی بڑی مونچھیں، بالوں پر خضاب لگاتے ہیں۔ ان کا قبیلہ کافی لڑاکا مشہور ہے انہوں نے ہمیں تنگ بھی کافی کیا تھا۔ بس یہ سمجھ لیں کہ بہادر ہی بہادر ہیں۔ عقل شاید حصے میں نہیں ملی مگر خلوص بے پناہ اور بات بالکل سیدھی کرتے ہیں۔ چار شادیاں کی تھیں۔ دو کا انتقال ہو گیا۔ دو ہفتے ملنے نہ آئے تو ہمیں بھی فکر ہوئی کسی سے کہلوا بھیجا کہ خدانخواستہ طبیعت ناساز ہے۔ حقیقت بعد میں پتہ چلی کہ ان

JALALI BOOKS

کے گھر لڑکی پیدا ہوئی ہے تو سوگ منا رہے تھے اور بیوی پر لعن طعن کہ ہم اتنی تیاری کر رہے تھے کہ لڑکا پیدا ہو گا تو مہمان بلائیں گے اور اچھا سا نام تجویز کرائیں گے اب میں کیا لوگوں کو منہ دکھاؤں گا۔

سوگ بھی خوب ہے ہمارا ذاتی خیال ہے کہ لڑکیاں تو نعمت ہوتی ہیں۔ جتنی محبت اپنے ماں باپ سے انہیں ہوتی ہے لڑکوں کو شاید ہی ہوتی ہو۔ یہ تو ہمارا اپنا ذاتی تجربہ ہے۔ وڈیرے صاحب غیر معمولی تاخیر کے بعد تشریف لائے کہ صاحب ہمارا دو شادی اور کرنے کا ارادہ ہے۔ قوم کہتی ہے کہ وڈیرہ بغیر چار شادیوں کے جچتا نہیں۔ دو تو مر گئیں ان کی کمی پوری کرنی ہے۔

"بس رہنے دو شادیوں کو تمہارے بچے ویسے ہی کافی بڑے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن رواج کا کیا کریں۔ ہم آج کل بیمار بھی ہیں۔ ذرا ڈاکٹر کو ملنا بھی ہے۔"

"ڈاکٹر کو چلو ہم دکھا دیتے ہیں مگر شادیوں کی کیا مصیبت ہے۔ بار بار پیسہ ضائع کرتے ہیں۔" پیسے کی کیا بات ہے ہمارے پاس ستر اونٹ ہیں دو بیچیں گے اور اچھی سے اچھی عورت ملے گی۔ آپ ہمارے ساتھ جانے کی تکلیف نہ کریں۔ ہم خود ڈاکٹر صاحب کو دکھا دیں گے آپ بس ٹیلیفون کر دیں۔"

وڈیرہ تو ڈاکٹر کو دکھا کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے ہمارے پاس آئے۔ ہم نے انہیں تجسس سے پوچھا کہ ہمارے دوست کوئی زیادہ بیمار تو نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہنس پڑے ہنسی ہے کہ قابو میں نہیں آتی۔ تھوڑی دیر بعد ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولے "بیماری تو کوئی نہیں شادی کی تیاریاں ہیں اب یہ عمر شادی کی ہے۔"

ایک روز کام سے اکتا کر ہم نے سوچا کہ شکار کا پروگرام بنایا جائے۔ اتوار کا دن تھا اور موسم بھی خوشگوار۔ بندوق اٹھائی اور چل دیے ہم کوئی خاص شکاری تو نہیں ہیں مگر کیا کریں کچھ تو تبدیلی ہونی چاہیے۔ جیپ سڑک پر چھوڑی اور پہاڑوں کا راستہ لیا۔ چلتے چلتے ہمارے ایک جاننے والے مل گئے۔ مع اپنے خاندان اور مال کے نئی چراگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ کھڑے ہو کر باتیں ہونے لگیں اور مُصر کہ "ہم آپ کو شکار کھلائیں گے۔ منع کیا مگر بضد ساتھ کوئی ہونا چاہیے۔ چلیے آپ کی خوشی۔ شکار کھیلتے رہے۔ تیتر بغیر کسی کے کب ہاتھ آتے ہیں ایک جگہ سے اڑتے اور پھر غائب ان کا پیچھا کیا۔ اگلے پہاڑ سے اڑے اور پھر اوجھل

جب کافی عرصہ گزر گیا تو ہمیں پیاس لگی تو دوست نے تجویز کیا کہ جدھر ان کا خاندان گیا ہے ادھر چلتے ہیں۔ خاندان اور جانور تو نظروں سے دور ہو چکے تھے۔ اب ہمارے ساتھی سمت رکھکر چلدیے۔ تھوڑی تھوڑی دور پر "مپش" یا "مزری" کے تازہ ٹوٹے ہوئے پتے ملے اور ان پر ایک بڑا سا پتھر رکھا ہوا۔ ہم نے پوچھا کہ یہ پتے اور پتھر کیسے؟ جب ہمارا خاندان ایک جگہ سے منتقل ہوتا ہے اور آدمی پیچھے رہ جائیں تو عورتیں ہی سب کام سنبھالتی ہیں۔ مرد تو خیر ہمیشہ ہی پیچھے رہ جاتے ہیں تاکہ عورتیں جگہ ٹھیک کریں اور جھگیاں لگادیں۔ مرد تو آرام کرنے کے لئے بعد میں آجاتے ہیں۔ یہ پتے اور پتھر ہماری بیویاں رکھتی جاتی ہیں تاکہ ہمیشہ راستے کا پتہ چلتا رہے" کیا ٹھاٹھ ہیں۔ جب سب کام ہو جائیں تو مرد آرام کے لیے موجود، یہ ہوئی خدمت۔

ہم لوگ چلتے رہے نشان دیکھ دیکھ کر ایک جگہ ہمارے دوست کو زمین پر ایک گول چکر کا تازہ نشان نظر آیا اور اس نشان کے ایک سمت میں سیدھی لکیر کھنچی ہوئی تھی' اب انہوں نے لکیر کی سمت چلنا شروع کیا تھوڑی دور چل کر ہم ایک چشمہ پر پہنچ گئے۔

جب ہم پانی پی چکے تو ان سے پوچھا کہ جو نشان آپ نے راستے میں دیکھا تھا اس سے مراد کیا ہے؟ یہ نشان ہماری بیویاں اس وقت بناتی ہیں جب وہ پانی کی تلاش میں ہوں تاکہ ہمیں پتہ رہے کہ وہ کہاں ہیں۔ ہمیں کافی دیر ہو گئی تھی۔ اپنے دوست سے اجازت چاہی۔ وہ ہمارے ساتھ واپس چلنے لگے' لاکھ منع کرنے پر بھی ساتھ نہ چھوڑا "نہیں یہ ہمارا رواج ہے کہ جہاں سے ہم اپنے مہمان کو لاتے ہیں وہیں چھوڑ کر آتے ہیں" چلئے آپ کی مرضی۔

ایک ہمارا اپنا مشاہدہ ہے اس کی وجہ لوگوں سے پوچھنے کی کوشش کی مگر کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا جب حالات ذرا خراب تھے ہم نے اکثر دیکھا کہ مردوں کو پوچھ گچھ کے لئے بلایا جاتا تو بیویوں پر کوئی خاص اثر نہ ہوتا وہ اپنے آرام سے کام کاج میں مصروف رہتیں۔ لیکن اگر کسی کی اولاد کو بلوایا جاتا چاہے بیٹے کی عمر پچیس یا پچاس برس کی کیوں نہ ہو۔ ماں تڑپ اٹھتی۔ ساتھ ساتھ چل کر آتی کہ میرا بیٹا بے گناہ ہے' یہی میرا ایک سہارا ہے' اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی وغیرہ وغیرہ' ماں تو ماں ہوئی مگر بیوی کا شوہر کے بارے میں غمزدہ ہونا تو ہم نے سنا اور نہ ہی دیکھا غم تو ضرور ہوتا ہوگا۔ چلیے یہ تو وہ زمانہ تھا جبکہ حالات ٹھیک نہ تھے مگر یہی

حال ہم نے اپنے اسپتال میں دیکھا۔ بیٹے کی عمر چاہے کچھ بھی ہو مگر ماں بیقرار ہم نے اپنے دوستوں سے رجوع کیا۔ کہنے لگے کیا بتائیں۔ انہیں کام سے ہی فرصت نہیں ہوتی پھر یہاں جب شادیاں طے ہوتی ہیں تو عشق کا عنصر تو ہوتا ہی نہیں اگر ایسا ہو تو گولی نہ چل جائے' میرے خیال میں تھوڑا بہت اس معاملے میں غیرت کو بھی دخل ہوگا۔

صنفِ نازک کو جس روپ میں دیکھئے اس کا اپنا جدا رنگ ہے' مرد اس کی عزت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ماں' بہن' بیوی' ہاں بیوی کے بارے میں کچھ اختلاف رائے ہو سکتا ہے مگر اور رشتے تو اپنی جگہ قائم ہیں' ماں تو پھر ماں ہے' اس کا نعم البدل کہاں۔ ماں کا بھی تو صنفِ نازک سے تعلق ہے' ہسپتال میں ایک عورت اپنے جوان بیٹے کو ساتھ لائیں۔ بیٹا اٹھنے بیٹھنے سے معذور۔ پتہ نہیں کب سے بیمار تھا۔ غریب ٹی۔ بی' ذیابیطس' خون کی کمی اور معلوم نہیں کیا کیا بیماریاں لاحق تھیں۔ ڈاکٹر! مجھے معلوم ہے یہ مشکل سے بچے گا۔ یہ میرا اکلوتا بچہ ہے کچھ تو کرو۔

تقدیر کے آگے کسی کا بس نہیں۔ موت سے دو دن پہلے ماں کو آگاہ کیا کہ اب اسے اگر لیجانا چاہتی ہو تو لیجاؤ۔ "مجھے معلوم ہے لیکن تھوڑی اور کوشش کرلو۔ اب کہاں لیجاؤں۔ یہاں تو آرام سے رہے گا۔ اس نے بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں" بیماری کے دوران پٹی سے لگی بیٹھی رہی۔ کفن دفن کا بندوبست کیا گیا ماں سے پوچھا کہ اگر کوئی رشتہ دار ہو تو بتاؤ اسے بلوالیں "کون رشتہ دار ہے' اپنا جو تھا وہ بھی ختم ہو گیا!"

جب تک قبر تیار ہوتی رہی میت سے چپٹی بیٹھی رہی۔ ساتھ میں ایک پوٹلی اٹھائی ہوئی تھی اس کو بڑا سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ دفن سے فارغ ہو کر ماں سے اظہار ہمدردی کیا۔ پوٹلی کھول کر سامنے رکھدی۔ اس میں کچھ مٹھائی اور چھوارے تھے کہ یہ لوگوں میں بانٹ دو۔ غریب کہاں سے لائی ہوگی "یہ ہمارا دستور ہے" غریب بہت ہی صابر تھی۔ شام کو ٹہلنے نکلا۔ تب بھی قبر سے چپٹی ہوئی تھی' اس کی محبت کو کون سمجھے۔ ماں کا دل تو صرف ماں کے ہی پاس ہوتا ہے۔ کہاں سے ہمت آئے کہ ماں کو سمجھایا جائے کہ ایسا نہ کر' اس سے کیا فائدہ' ماں کے نزدیک تو نفع نقصان کی کوئی اہمیت نہیں ممتا کے آگے عقل اور دلائل ہیچ۔ جہاں ایسی مائیں ہوں وہاں صنفِ نازک کی عزت میں کوتاہی۔ یہ ایک عجیب سی بات ہے' بس رواج ہے۔

اب ذرا تصویر کا ایک اور رُخ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ مری دوست جو سڑک پر کام کرتے رہتے ہیں۔ ہم پر

JALAL BOOKS

بڑے مہربان ہیں۔ جب موڈ میں ہوں تو بڑے مزے لے لے کر قصے سناتے ہیں۔ لڑائیوں کے۔ اپنے رواجوں کے۔ اپنی دوستی، دشمنی کے زیادہ ترغریب کنوارے ہیں۔ دھن یہ کہ جلدی سے چھ سات ہزار روپیہ اکٹھا ہو تو شادی کریں۔" یہ بتاؤ کہ اب تک آپ لوگ بغیر شادی کے کیسے رہتے ہیں۔" یہ سوال ہم نے اس لیے کیا کہ دنیا کے ماہرین نفسیات کی رائے یہ ہے کہ جنس بھی ایک طرح کی ضرورت ہے۔ جیسے بھوک، پیاس وغیرہ۔ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے کہ انسان اتنی عمر بغیر شادی کے پہنچ جائے۔ ایک دو نہیں بلکہ آبادی کی بیشتر تعداد۔ پہلے ہنسے، پھر کچھ شرمائے، ایک نے شرارتاً کہا "شیشہ مارکر" یہ اصطلاح ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔ آپس میں کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ ہر ایک ہنستا ہے اور ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس سے پوچھیں۔ آخر ایک نے ہمت کرلی۔ "آپ کو معلوم ہے کہ آج سے پہلے ہمارے دو ہی کام رہے ہیں۔ جانور چرانا یا لڑائی لڑنا۔ بیشتر وقت جانور چرانے میں گزرتا ہے۔ جانور تو ہم چھوڑ دیتے ہیں اور اونچی جگہ پر بیٹھ کر ان کی نگہبانی کی جاتی ہے، اب بیٹھے بیٹھے کیا کریں۔ ہمارے پاس تو عورت ہے نہیں۔ اوروں کے پاس ایک کی بجائے چار اور پھر باندیاں بھی یہ لوگ بھی کام کو نکلتے ہیں۔ پانی بھرنے لکڑی کاٹنے جانور چرانے۔"

"مگر اس میں شیشہ کی بات کہاں آئی۔"

"آئے گی آپ کو تو معلوم ہے ہمارے سب کے پاس شیشہ ہوتا ہے، آپس میں اشارہ کرنے کے لیے اور جنگ میں یہ ہی طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جنگ کی اور بات ہے۔ امن میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، شیشے کو چپلی کے بیچ میں رکھا جاتا ہے تاکہ شیشے کی چمک دائیں بائیں نہ جائے بلکہ اس کی نوک سے بغیر پھیلے ہوئے نکلے۔ جب اپنی پسند کو دیکھتے ہیں تو شیشہ مار کر چمک اس کے منہ پر ڈالی جاتی ہے۔ اس طرح یہ چمک کسی اور کو نظر نہیں آتی۔

لیکن آپ لوگوں کے یہاں تو اس بات پر گولی ماردی جاتی ہے۔ پھر بھی یہ حرکتیں ہوتی ہیں؟" گولی تو بالکل ٹھیک ہے مگر خطرے کے بغیر زندگی کا مزہ کیا۔ گولی تو اس وقت لگتی ہے جب کام بے وقوفی سے کیا جائے، اب آپ بتائیں کہ زندگی کس طرح گزرے۔ دن رات جانوروں کو دیکھتے ہیں، انسان کیسے صبر کرے۔"

KUTUB KHANA JALALI BOOKS

میرے دو بلوچ دوست

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

آدم اور حوّا

کچھ لوگ پہاڑ کے دامن میں ندی کے کنارے نہا رہے ہیں

آدم اور حوّا

KUTUB KHANA JALALI BOOKS
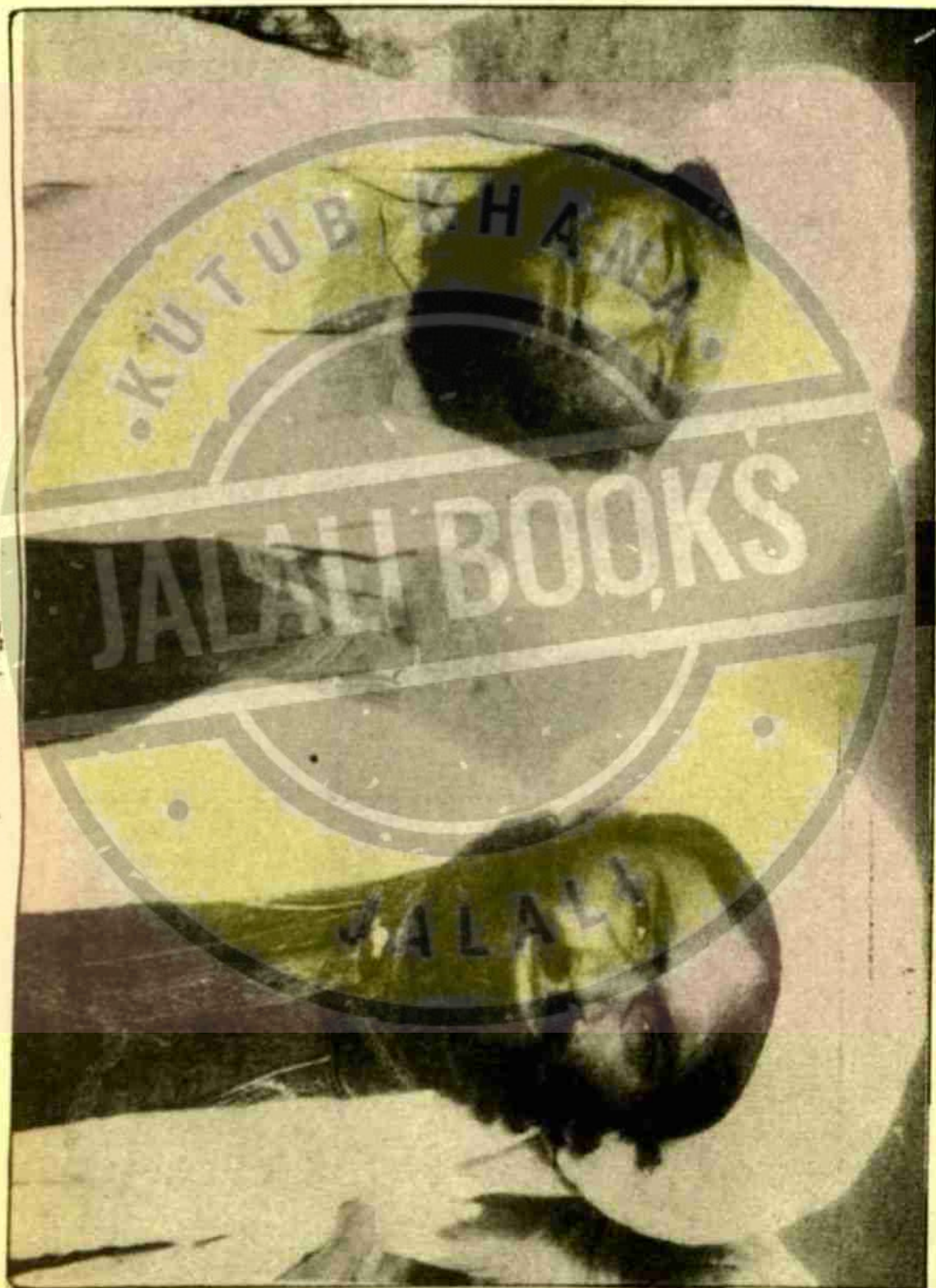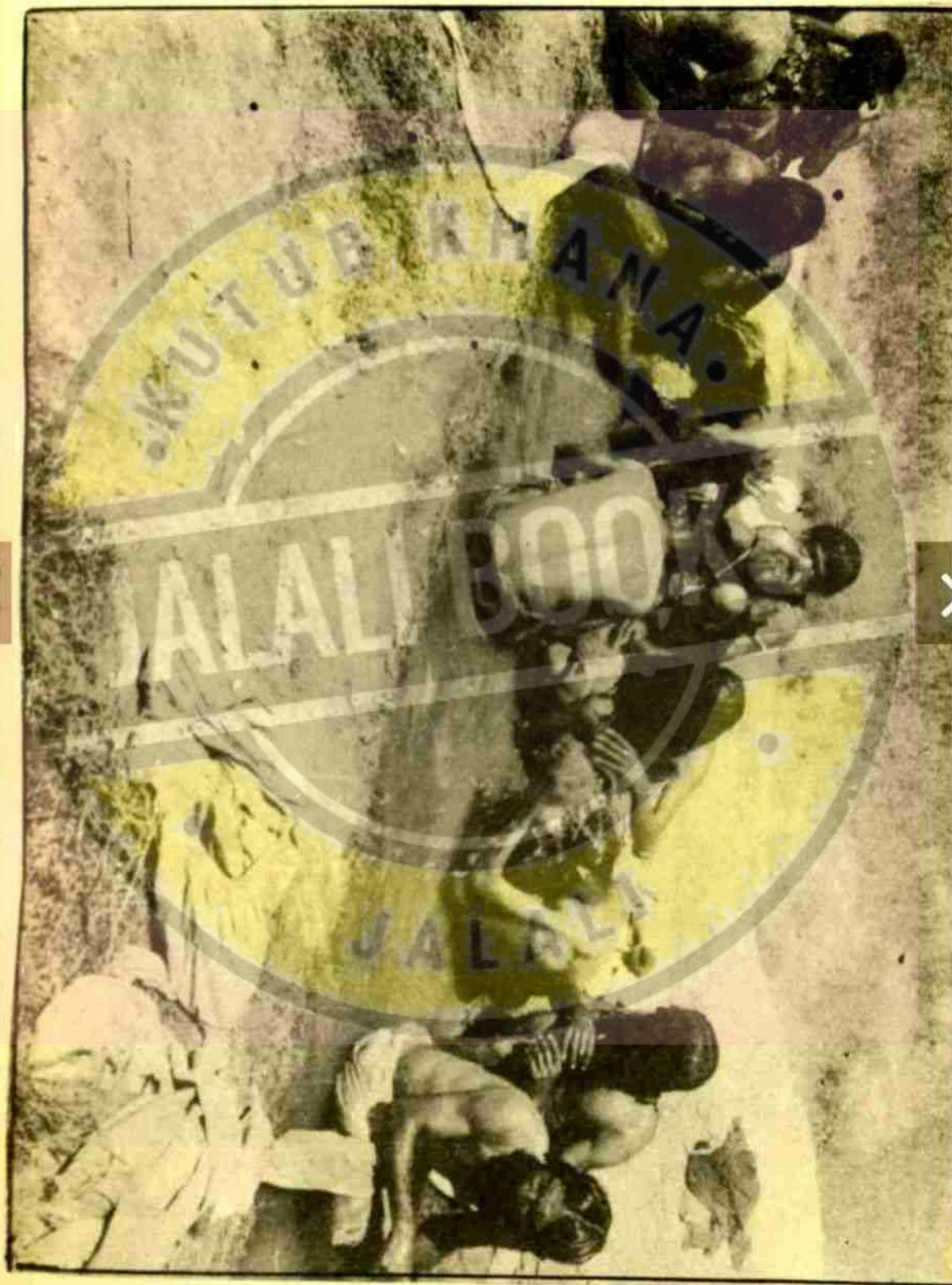
ہم نے اکثر پڑھا اور اپنے دوستوں سے کبھی سُنا کہ یہاں "سیاہ کاری" کی سزا موت ہے۔ تاہم یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ کم تر ذات کے ساتھ یہ حرکت معیوب نہیں سمجھی جاتی۔ جہاں ہر چیز کے بارے میں رواج ہیں وہاں اس حرکت کے بارے میں بھی رواج ہوگا۔

پہلی بات تو یہ کہ دونوں مجرموں کو موقعہ پر ہی ختم کر دیا جاتا ہے مگر موقعہ پر ختم کرنے کا حق ہر ایک کو نہیں۔ یہ سزا صرف سسرال اور میکے والے دے سکتے ہیں۔ سسرال میں صرف یہ افراد ذمہ دار ہیں۔ خاوند، خیر اس کا حق ہونا تو لازمی ہے آخر عورت اس کی ملکیت ہوئی۔ خاوند کا بھائی، خاوند کا والد یعنی سسر اور خاوند کا بیٹا چاہے کسی ماں سے ہو۔ اب میکے والوں کو لے لیجئے۔ ادھر صرف باپ اور بھائی کو اختیار ہے کہ یہ سزا دے سکیں، ایک دفعہ جب عورت کی شادی ہو جاتی ہے تو میکے والوں کا کوئی حق نہیں رہتا۔ مرد ہر لحاظ سے اس کا ذمہ دار اور عورت جو بھی حرکت کرے اس کا جوابدہ۔ مثال کے طور پر اگر عورت کوئی خون کر دیتی ہے یا کسی اور غلطی کی مرتکب ہو تو خاوند کا یہ فرض ہوتا ہے کہ معاملے کو خوش اسلوبی سے رواج کے تحت طے کرے۔ جب اتنی بڑی ذمہ داری خاوند سنبھالتا ہے تو مرد کے احکام بھی نادر شاہی ہوتے ہیں۔ سسرال والوں سے اگر تعلقات استوار نہ ہوئے تو

ملنے کی اجازت بھی نہیں۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ بھائی کو خبر ملی کہ بہن سخت بیمار ہے۔ بھائی آیا بھی تو دور بیٹھا ملنے کے لئے خوشامد کرتا رہا۔ اجازت نہ ملنی تھی نہ ملی۔ اگر خاوند کو رحم آگیا تو مرنے کے بعد شکل دکھادی۔ ورنہ اس کا بھی امکان اکثر کم ہی ہوتا ہے۔

ایک دفعہ ہم اپنے مری دوست سے ملنے گئے وہ اپنے قبیلے کے کافی تگڑے وڈیرے ہیں۔ ایک پیڑ کے سائے میں بیٹھے ہوئے اور محفل جمی ہوئی جیسے مقدمے طے کر رہے ہوں۔ ہمیں دیکھ کر اٹھکر ہمارے پاس چلے آئے ہم نے لاکھ کہا آپ اپنا کام کریں مگر بضد تھوڑی دیر تو بیٹھیں۔ "چلیئے بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر یہ کچہری کیسی لگائی ہوئی ہے"۔
میاں بیوی کا آپس کا جھگڑا ہے۔ مرد عورت کو چھوڑنا چاہتا ہے اسے طے کرنا ہے"۔

"میاں بیوی کے جھگڑے بھی آپ کے پاس آتے ہیں۔

"ہاں آجاتے ہیں مگر یہ کم ہوتا ہے کسی زمانے میں یہ کام سردار کا ہوتا تھا مگر ہم اپنے مقدمے کیوں سردار کے پاس لے جائیں۔ اول تو کوئٹہ کون جائے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی قوم کو سنبھالیں اگر اپنے قبیلے کے مقدمے باہر جائیں تو ہمارا اپنا اثر کم ہو جاتا ہے"۔

بات بھی درست، اپنا زور کون کم کرتا ہے' اس زور کو تو اور بڑھانا چاہیے لیکن ہمارے دوست یہ کام نہ کریں تو غریب آدمی کہاں جائے۔ ہم نے مقدمے کے بارے میں پوچھا۔

"آپ کے ہاں طلاق بھی ہو جاتی ہے ؟"

طلاق صرف مرد کی مرضی پر ہے۔ خلع کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس جھگڑے میں اب مرد کو یہ بتانا ہوگا کہ وہ کیوں عورت کو چھوڑنا چاہتا ہے۔ اگر اس کی وجوہات درست ہوئیں تو ٹھیک ہے اس صورت میں عورت اپنے سسرال چلی جائے گی اور اس کے وارث لب کی رقم واپس کر دیں گے"۔

"فرض کیجئے خاوند اپنی بیوی کو چھوڑنے کے بارے میں کوئی قابل قبول وجوہ بیان کرنے سے قاصر رہا تب"؟

"اگر ایسا ہوا تو خاوند کو جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ لیکن طلاق ہو جائے گی۔ "لب" کی رقم وارثوں سے لینے کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا"۔

"یہ جرمانے کی رقم کس کے پاس جائے گی اور اگر فرض کیجئے خاوند جرمانے کی رقم دینے سے انکار کر دے"۔

"جرمانے کی رقم تو ہمارا حصہ ہے۔ رقم نہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس دن ایسا ہوگا تو ہمیں کون پوچھے گا۔ جب تک ہم میں طاقت ہے کسی کی کیا مجال کہ ہمارا کہا نہ مانے۔"

"فرض کیجئے کوئی عورت تنگ آ کر یا ویسے ہی اپنے خاوند کو چھوڑ کر چلی جائے۔"

اگر ایسا معاملہ ہو جائے تو خاوند شکایت ہمارے پاس لاتا ہے پہلے یہ کام سردار کے سپرد تھا ہم اس عورت کو بلاتے ہیں اور طلاق مکمل کراتے ہیں۔ پھر اس عورت کا نکاح کسی اور سے کرا دیتے ہیں۔ دوسرے خاوند سے جو "لب" کی رقم حاصل ہوتی ہے وہ پہلے خاوند کو دی جاتی ہے۔ یہ لب کی رقم عموماً پہلی لب کی رقم سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس میں سے کچھ حصہ ہمارا ہوتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔ چائے تو پینا ضروری تھا۔ ورنہ ہمارے دوست ناراض ہو جاتے وقت بھی تھا ہم نے سوچا اس موضوع پر مزید معلومات حاصل کر لی جائیں۔ وہاں کچھ اور مری دوست بھی اکٹھے ہو چکے تھے اور سلسلہ کلام جاری تھا۔

"اچھا یہ بتائیں کہ ہمیشہ ہی سیاہ کار کو مار دیا جاتا ہے یا کوئی فیصلہ بغیر مارے بھی ہو سکتا ہے"؟ ہم نے یہ سوال اس لئے کیا تھا کیونکہ اس جرم کے مرتکب اکثر تگڑے لوگ بھی ہوتے ہوں گے اور غریب خاوند کی ہمت نہ پڑے وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے دوست نے چائے کا گھونٹ حلق سے نیچے اتارا اور توقف سے بولے۔ اگر سیاہ کاروں کو نہ مارا جائے تو جس خاوند یا مجرم کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو تو وہ سب کے سامنے یہ الزام مجرم اور اس کے فرقے پر لگاتا ہے۔ جسے "یا ہو" کہتے ہیں۔ اگر موقعہ پر ہی وہ ملزم کو مار دے تو خون بہا کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اگر وہ دونوں کو نہیں مارتا تو وہ طلاق کی درخواست کرتا ہے۔ درخواست کی سماعت کے دوران عورت وڈیرے کے گھر رہتی ہے۔ پہلے زمانے میں وہ سردار کے ہاں رہتی تھی۔ اس کے بعد اس کی پھر "لب" پر شادی کی جاتی ہے اس لب کا کچھ حصہ پہلے خاوند کو دیا جاتا ہے باقی حصہ ہمارا ہوتا ہے۔"

اس موقعہ پر ایک اور مری دوست نے لقمہ دیا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی پر سیاہ کاری کا الزام لگایا لیکن اس نے نہ تو اپنی بیوی کو طلاق دی اور نہ ہی مارا۔ ایسے میں الزام لگانے کے بعد

اُسی وڈیرے کی موجودگی میں ہم خاوند سے سلامتی کا پیسہ لیتے ہیں۔ اگر اس کے بعد خاوند بیوی کو قتل کر دے تو یہ پیسہ وڈیرہ ضبط کر لیتا ہے۔"

جب یہ وضاحت ختم ہوئی تو ہمارے دوست نے پھر سلسلۂ کلام شروع کیا۔ اس رواج میں ایک اور باریکی ہے ایک عورت کو اگر اس طرح سیاہ کار قرار دے دیا جائے اور اس کی شادی کر دی جائے تو اس کو کسی حالت میں دوبارہ سیاہ کار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور اس کا نیا خاوند یہ حق نہیں رکھتا کہ اس پر سیاہ کاری کا الزام لگائے۔"

ہم نے "لب" کا ذکر پچھلے باب میں بھی کیا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ بیوی کو لب پر ہی خریدا جائے۔ اکثر "ادلہ بدلہ" بھی ہوتا ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے گھر میں شادی۔ یہ رسم قریبی رشتہ داروں میں کی جاتی ہے۔ غریب طبقوں میں "لب" جانوروں کی شکل میں طے کی جاتی ہے۔ جیسے چالیس بھیڑیں یا بیس بکریاں۔ اس کے علاوہ کچھ نقدی بھی دینی پڑتی ہے۔ یہ طے کرتے وقت کمی زیادتی پر بھی بحث ہوتی ہے۔ جدھر اچھی رقم ملے وہاں بات پکی ہو جاتی ہے۔ قریبی رشتہ داروں میں یعنی "ولی" کے ساتھ "لب" کی رقم کم ہوتی ہے۔ غیروں میں یعنی "سیال" کے ساتھ شادی طے کرنے میں پیسے زیادہ ہی دینے پڑتے ہیں۔ یہاں پر شادیاں اکثر دو مرحلوں میں ہوتی ہیں۔ پہلا مرحلہ منگنی ہوتی ہے جسے یہاں پر "سانگ" کہا جاتا ہے۔ دوسرا مرحلہ "نکاح" ہوتا۔ پاکستان کے بعض علاقوں کے رہنے والے ایک اور مرحلہ بھی شامل کرتے ہیں۔ یعنی "رخصتی"۔

مری دوست "سانگ" اور "نکاح" ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ رخصتی تو تھوڑی دیر بعد ہو ہی جاتی ہے سانگ اور نکاح کی تقریب میں اکثر کافی وقفہ دیا جاتا ہے۔ "سانگ" اور نکاح کرنا باپ یا حلقے کے بزرگ کی ذمہ داری ہوتی ہے بزرگ آپس میں مل بیٹھ کر اس معاملے کو طے کرتے ہیں۔ ایک دفعہ جب لب کی رقم طے ہو گئی تو رائفل کا ایک ہوائی فائر کیا جاتا ہے۔ زیادہ خوشی ہو تو کئی فائر بھی کئے جا سکتے ہیں۔ فائر کرنے سے پہلے "لب" کی رقم کا کچھ حصہ سسرال والے ادا کرتے ہیں۔ "سانگ" کی رسم کے بعد لڑکی "شادی شدہ" سمجھی جاتی ہے۔

ہم نے مزید استفسار کیا کہ "جناب زندگی اور موت کا وقت معین نہیں۔ فرض کیجئے اگر سانگ کے بعد مرد یا عورت میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے تو لب کی رقم جو پیشگی دی گئی ہے اس کا کیا ہوتا ہے؟"

ہمارے دوست ہنس کر بولے "ہمارے رواج ہر طرح سے پکے ہیں اس میں کوئی خامی نہیں چھوڑی گئی۔ اگر فرض کیجئے کہ لڑکی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اب لڑکے کی قسمت شادی تو بہرحال مکمل ہو چکی پیسہ سسرال والوں کا! یہی حال لڑکے کے مرنے پر بھی ہوتا ہے۔ پیسہ ایک دفعہ دے کر واپس نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ "لب" کی رقم جو باقی رہتی ہے نہیں مانگی جاتی۔"

"ہمیں یہ بتائیں کہ آپ کے رواجوں میں "جہیز" کی قسم کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟"

"ہاں جہیز بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی نام کو کچھ تھوڑے بہت زیور بیٹی کو باپ دے دیتا ہے مگر جہیز دینے پر کوئی زور نہیں ہوتا۔ جہیز کو ہم "داج" کہتے ہیں۔"

"اب آپ نے جب داج یا جہیز کی بات کی ہے تو جہیز کے ساتھ ساتھ عورت کی کچھ اپنی ذاتی چیزیں بھی ہوتی ہوں گی مثلاً کپڑا، زیور وغیرہ۔"

"ہاں ضرور ہوتی ہیں۔ آخر عورت کے بھی ماں باپ اور بھائی ہوتے ہیں۔ وہ کچھ نہ کچھ تو دیتے رہتے ہیں۔"

"فرض کیجئے خاوند کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے رواج کے تحت تو عورت سسرال واپس چلی جاتی ہے، اگر شادی کے قابل ہوئی تو پھر لب پر دوبارہ "شادی"۔ تو جہیز اور عورت کا ذاتی چیزوں کا کیا ہوتا ہے؟" "مرد کے مرنے کے بعد جہیز اور عورت کا سامان بچوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور وہ خاوند کے باپ کے ساتھ رہتے ہیں۔ عورت اپنے میکے چلی جاتی ہے۔ پہلے تو اس کے بارے میں سخت رواج تھا کہ عورت ضرور ہی میکے جائے گی مگر اب عورت بچوں کے ساتھ رہنا چاہے اور اس کی عمر شادی کے قابل نہ ہو تو اس کی اجازت مل جاتی ہے۔ اگر عورت کی کوئی اولاد نہیں ہے تو پھر عورت اپنا جہیز لے کر اور ذاتی سامان لے کر میکے چلی جاتی ہے۔ اب فرض کیجئے کہ عورت کا انتقال ہو گیا تو جہیز اور عورت کا ذاتی سامان مرد رکھ لیتا ہے۔ اس کے ذمہ کفن دفن اور فاتحہ وغیرہ کے بھی اخراجات ہوتے ہیں۔"

مری علاقے میں قیام کے دوران قبائلیوں سے جب بھی گفتگو میں عورت کا ذکر آیا سب اس بات پر متفق نظر آئے کہ عورت کو سختی سے رکھنا چاہئے اور کام بھی اتنا لینا چاہئے کہ ہوش نہ آئے۔ آخر بیچاری عورت کس طرح ایسے ماحول میں گزارا کرتی ہوگی۔ بس عادت سی ہو جاتی ہے۔ جو ہمارے بے تکلف مری دوست ہیں ان کے گھر والے ہم سے بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے پھر جو لوگ فوج کے اسپتال میں آتے اکثر ان سے باتیں تو ہیں

JALALI BOOKS

ہمارے دوستوں کی مائیں تو ہم سے اکثر کافی دیر تک باتیں کرتیں۔ ماؤں کو تو اپنی اولاد سے کوئی شکایت نہیں ہوتی بلکہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ ہمارے دوست پہلے ان کے پیر چھوتے اور پھر گھر میں جاتے مگر بیویوں کو ضرور گلہ ہوتا۔ وہ بھی یہ انتظار کرتی رہتی تھیں کہ کب ان کی اولاد بڑی ہوگی۔

ایک دفعہ ہمارے ایک مری دوست اپنی بیوی کے ساتھ جا رہے تھے کہ راستے میں مل گئے۔ ہم نے دونوں کو جیپ میں بٹھالیا۔ ان کا چھوٹا بچہ فوج کے اسپتال میں زیر علاج تھا۔ اس وجہ سے خوب واقفیت تھی ان کی دو بیویاں تھیں ایک مر چکی تھی۔ ہم نے ان کی بیگم سے پوچھا کہ "جب گھر میں دو بیویاں ہوں تو آپس میں لڑائی تو نہیں ہوتی" ہنس کر کہنے لگیں "کیوں نہیں ہوتی۔ یہ تو فطری بات ہے"۔ ان کے خاوند نے لقمہ دیا "بیویاں تو ٹھیک جہاں بیویں کے ساتھ باندیاں ہوں تو وہاں لڑائی کے علاوہ دوسرا کام نہیں ہوتا۔ پھر عورت کے حسد کی کوئی انتہا نہیں ہوتی اکثر عورتیں تو اپنے خاوند کو زہر دینے سے بھی گریز نہیں کرتیں" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ کہنے لگے کہ "آپس میں مردوں کو لڑانا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے یا پھر عورتیں ایک ساتھ اکٹھا ہو کر مرد کے خلاف محاذ قائم کر لیتی ہیں اب بیچارہ گھر میں اکیلا رہ جاتا ہے یا پھر اگر اولاد بڑی ہوئی تو اولاد کا سہارا لے کر مرد پر زور ڈالا جاتا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ادلے بدلے کی شادی ہوتی ہے تو پھر ایک دوسرے پر زور قائم رکھتے ہوئے مرد کی "حکومت" کو کم کیا جاتا ہے ہمارے دوست کی بیگم صاحبہ منہ پر چادر رکھے ہوئے مسکراتی رہیں۔ آخر کب تک صبر کرتیں۔ کہنے لگیں "آپ لوگ اپنی حرکتوں کو بھی دیکھیں۔ خاص طور سے وڈیرے لوگ کسی غیر عورت سے تعلق رکھنے پر تو آپ فخر محسوس کرتے ہیں اگر عورتیں اس پر بُرا مانتی ہیں تو مرد یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ وڈیرے لوگ تو عزت والے ہیں چاہے چار بیویاں رکھیں یا دس باندیاں" ہمارے دوست نے یہ بات سُنکر کھسیانا سا جواب دیا۔

"نیک بخت میں نے تیرے ساتھ کب زیادتی کی۔ دوسری بیوی تھی مر گئی۔ اب تو تُو آرام سے ہے"۔

بیگم صاحبہ کہنے لگیں "میں تیری بات تو نہیں کر رہی۔ میں تو عام بات کر رہی ہوں"۔

میاں بیوی کی یہ بات دلچسپ ضرور تھی مگر ایک مسئلے کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا سبب وڈیروں کی لاقانونیت ہے اور اس لاقانونیت کا شکار عورت بھی ہے۔

JALALI BOOKS

شاهی جرگه

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS

شاہی جرگہ

مری معاشرے اور رہن سہن کی جھلک تو آپ نے دیکھ لی۔ اب یہاں کے نظم و نسق کے ایک خاص پہلو پر نظر ڈالتے ہیں جسے جرگے کی روایت کہا جاتا ہے۔ قبائلی رسم و رواج کے تحت جرگے کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ بالیوں کہیے جہاں قبائلی سوسائٹی ہوگی وہاں جرگے کا رواج ہونا لازمی ہے۔ انسان جب سے پیدا ہوا ہے پیار اور محبت کے ساتھ لڑائی اور مار کٹائی لازم و ملزوم ہیں۔ اچھائی کے ساتھ اگر برائی نہ ہو تو اچھائی کو پہچانے کون۔ لڑائی جھگڑا کرنا جب انسانی فطرت ہے تو جھگڑوں کا فیصلہ کیونکر ہو، ہر ایک جھگڑا تو اتنا سنگین نہیں ہوتا کہ اس کا انجام بربادی ہو۔ فیصلہ اور سزا بھی ہو سکتی ہے۔ تو قبائلی سوسائٹی کا رواج ہے کہ اگر قبیلے کا اندرونی جھگڑا ہے تو بڑے بوڑھے بیٹھ گئے اور انہوں نے فیصلہ دیدیا۔ اب بھی اکثر اچھے گھرانوں میں یہی طریقہ رائج ہے۔ ہاں ماڈرن سوسائٹی کی بات نہ کیجیے وہاں بزرگی کا کوئی معیار نہیں۔ سب ہی بزرگ اور سب ہی بچے۔ پھر تو فیصلہ عدالت میں ہوگا اور ہوتا ہے معاشی ترقی کے جہاں فوائد ہیں۔ وہاں نقصانات بھی ہیں پھر نفع کے ساتھ نقصان بھی برداشت کیجیے۔ یہ تو خیر بڑی بحث طلب بات ہے کہ سوسائٹی کی اس طرح تشکیل دی جائے جہاں ترقی کے ساتھ نقصان کا احتمال کم ہو ہاں تو قبیلے کے دائرے میں رہتے ہوئے تو فیصلے کا طریقہ ہو گیا۔ لیکن اگر کسی اور قبیلے کے ساتھ جھگڑا ہو جائے تو!

تب بھی جناب قبیلے کے بڑے بوڑھے جنہیں آجکل کی زبان میں معتبرین کہتے ہیں اکٹھے ہو گئے اور صلح صفائی کرادی کسی کو سزا دینا منظور ہوئی تو سزا دے دی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ صلح صفائی رواج کے تحت ہوتی ہے۔ بمثال کے طور پر سیاہ کاری ہے۔ اگر کم تر ذات کے ساتھ ہے۔ جیسے کوئی مرہٹا (مرہٹا ایک قبیلہ ہے) تو وہ جائز ہے۔ اگر ہم پلہ قبیلے کے ساتھ ہے تو جناب یا تو موقع پر ہی ہلاک کو ختم کر دیا جاتا ہے ورنہ جو بھی فیصلہ بڑے بوڑھے یا معتبرین دیں۔ بڑے بوڑھوں کے اس طرح بیٹھ کر فیصلہ دینے کے طریقے کو جرگے کی روایت کہتے ہیں۔

فرنگی کی پالیسی ہمیشہ کم خرچ بالا نشین والی رہی ہے۔ جس علاقے کو ترقی سے کوئی فائدہ نہیں تو بیکار خرچ کرنا حماقت ہے۔ امن تو قائم رکھنا بہر حال لازمی ہے۔ چاہے ترقی ہو یا نہ ہو۔ لوگ جاہل رہیں تو بلا سے رہیں۔ بھوکے مرتے ہیں تو مرنے دو۔ آپس میں لوٹ مار کرتے ہیں تو آپس ہی میں کرتے ہیں۔ فرنگی مفاد کو تو کچھ نہیں کہتے۔ فرنگی فوج یا اس کے کارندوں کی نقل و حرکت میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے۔ آسان طریقہ ہے آپس میں جھگڑنے دو۔ اِن باتوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے سرکار برطانیہ نے ۱۸۷۱ء میں فرنٹیئر کرائم ریگولیشن (FRONTIER CRIMES REGULATIONS) نافذ کیا جو ابھی تک رائج ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس قانون میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اس قانون کے تحت جرگے کی روایت کو برقرار تو رکھا مگر حکومت کا ہاتھ پھر بھی اونچا یعنی مقدمے کے فیصلے کی توسیع یا جرگے کی کوئی بھی کارروائی بغیر پولیٹیکل ایجنٹ صاحب کی مرضی یا ان کی مہربانی کے عمل میں نہیں لائی جا سکتی۔ بالالفاظِ دیگر پولیٹیکل ایجنٹ صاحب سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ ان کے فیصلے کی اپیل بھی کسی عدالت میں نہیں ہو سکتی جس نے چوں چراں کی ہٹا دیا جرگے سے۔ کوئی بھی بولے کیوں اپنا نجی مفاد بھی شامل ہے۔ گدی جو جاتی رہے گی۔

انگریز جب بھی کوئی قانون بناتا تھا تو کافی آگے کی سوچتا تھا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ رائے عامہ بھی ہموار ہو اور علاقے کے لوگوں کی نفسیات کا بھی خیال رکھا جائے تاکہ آئندہ سو سال تک کوئی تکلیف نہ ہو۔ جب اس نے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن کو ۱۸۷۱ء میں تشکیل دیا جس میں وقت کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت ردّ و بدل ہوتی رہی مگر ہمیشہ واسطہ رواج کا دیا کہ رواج اور طور طریقے برقرار رکھے جائیں۔ پولیٹیکل ایجنٹ صاحب جب بھی بستی میں دربار لگاتے۔ ذکر پہلے رواج ہی کا ہوتا۔ ایک ایسی تقریر نمونے کے طور پر نیچے درج ہے جو کہ کرنل بوچیپ

اے جی جی (COL SIR BEAUHAMP - AGG) نے ۱۹۳۰ء میں سبی دربار کے موقع پر کی تھی "اس وقت جبکہ ہندوستان میں سیاسی خلفشار ہے یہ ضروری ہے کہ آپ لوگ اپنے گھر کو درست رکھیں بے انصافی اور بدعنوانی یہاں نہ آنے پائے۔ آپ کی روایات و رواج ہر حالت میں قائم رہنا ضروری ہیں۔ تہذیب و تمدن کا پھیلتا ہوا طوفان چاہے کتنا ہی مہیب کیوں نہ ہو۔ اِن رواجوں کو جو آپ کو اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملے ہیں ہر قیمت پر درخشاں رکھنا ضروری ہے تاکہ یہی ورثہ آپ کی آنے والی نسلوں کو بغیر تبدیلی کے نصیب ہو۔"

بیشک دنیا ترقی کرتی ہے تو کرنے دو۔ یہاں اسکول نہ بننے پائیں۔ سڑکیں نہ کھلنے پائیں معاشی ترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر یہ ہوا تو رواج کیسے قائم رہیں گے۔ تعلیمیافتہ تو پھر دورِ حاضر کے طریقے پر سوچے گا۔ آپس میں آنا جانا بھی ہوگا۔ لوگوں کی دماغی وسعت بھی بڑھے گی پھر فرسودہ نظام کو کون مانے گا۔ زنجیریں ٹوٹیں گی سرکار برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کے مفاد کو ٹھیس پہنچے گی۔ ارے صاحب جانے دیں۔ آپ لوگوں نے آزادی کے بعد کون سا تیر مارا۔ قائد اعظمؒ نے تو بیشک ۱۹۴۷ء میں بلوچستان کا علیحدہ صوبہ بنانے کے لئے کہا تھا اور پھر یہاں کے لوگوں نے بیک زبان پاکستان کے قیام کے لئے بآوازِ بلند حمایت کی تھی۔ دیکھ لیں شاہی جرگے کی قرارداد جو ۱۹۴۷ء میں پاس ہوئی صرف ایک ووٹ ہی تو خلاف تھا۔ قائد اعظمؒ کی وفات کے بعد کیا ہوا آپ کو بھی علم ہے اس علاقے میں ابھی تک فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن قائم۔ وہی جرگے۔ وہی رواج اور وہی وڈیرے' مان لیا ایک دم سے تو یہ لعنتیں ختم نہیں ہو سکتیں۔ ویسے پچھلے دو سالوں میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں کاش یہ پہلے ہوتیں تو یہ نوبت نہ آتی۔

فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن کے تحت یہاں تین جرگے ہوتے ہیں۔ لوکل جرگہ تو سب ڈویژن کی سطح پر ہوا۔ ڈویژنل جرگہ۔ یہ جرگہ ڈویژن کے لئے ہوتا ہے۔ سب سے اعلیٰ جرگہ شاہی جرگہ کہلاتا ہے۔ کیا بات ہے "شاہی" یعنی 'امپیریل' جرگے کی۔ اس کے ممبران تمام بلوچستان سے تعین کیے جاتے ہیں۔ زیادہ تر سردار صاحبان ہی اس کے معتبر ہوتے ہیں۔ حکمرانی اپنے لوگوں کی ہے۔ حکمرانی کی جب بات آگئی تو خیال یہ رکھئے کہ ذکر یہاں صرف قبائلی علاقے کا ہے ناکہ سیٹلڈ علاقے (SETTLED AREA) کا۔ حکمرانی سے مراد پکی حکمرانی۔ اس میں کچھ شک کی گنجائش نہیں۔ دیکھئے نا اب ان کے اپنے علاقے میں ان کے اپنے تھانے ہوتے ہیں جنہیں لیوی تھانہ

کہا جاتا ہے' ان کی اپنی پولیس ہوتی ہے جسے لیوی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے' جس کو خوش کرنا ہوا لیویز تھانے بنا دیئے اور "لیوی" بھرتی کرنے کی اجازت دے دی۔ ان سب کا خرچ پہلے حکومت برطانیہ برداشت کرتی تھی اب یہ حکومت پاکستان کے سر ہے۔ خرچ کی بھی خوب رہی۔ اکٹھا پیسہ سردار کے سپرد کیا۔ انہوں نے اپنے آدمی کچھ رکھے کچھ نہ رکھے۔ زیادہ تر پیسہ اپنی جیب میں۔ آپ کو امن و امان کی ضرورت ہے تو وہ رہے گا بشرطیکہ جیب گرم رہے۔ اپنی جیلیں بنائیں۔ جس کو مرضی آئی بند کیا جس کا گھر چاہا جلا یا وغیرہ وغیرہ۔ خیر اب جیلیں تو ختم ہو چکی ہیں' لیوی تھانے ٹوٹ چکے ہیں یا ٹوٹ رہے ہیں' بعض علاقوں میں لیوی کا رواج بھی ختم ہو چکا ہے اور باقی بھی جلد ہی ہٹ جائیں گے۔ لیویز پر مفصل بحث کہیں اور کی جائے گی ابھی تو ذکر جرگے کا ہو رہا ہے۔

معمولی مقدمات لوکل جرگے کے سپرد کیے جاتے ہیں' اسی طرح سنگین جرائم کی سنوائی ڈویژنل جرگہ کرتا ہے اور پھر بین القبائل جھگڑوں کا فیصلہ یا سنگین تر جرائم کی سنوائی صرف شاہی جرگہ ہی کرتا ہے۔ جرائم کا فیصلہ دینا ہی ان جرگوں کا کام نہیں ہوتا بلکہ جب بھی حکومت کو کسی چیز کے بارے میں رائے عامہ ہموار کرنے کی ضرورت ہوئی طلب کر لیا شاہی جرگے کو اور بیان دلوا دیئے۔ انگریز نے تو بارہا کیا۔ اگر رواج اپنی سہولت کے لئے بدلنے کی ضرورت محسوس کی تو قرارداد شاہی جرگے نے پاس کر دی۔ کسی سردار کو بدنا ہوا یا کسی کا رتبہ بڑھانا ہوا تا کہ آئندہ بوقت ضرورت کام آسکے۔ بلا لیا شاہی جرگے کے سامنے۔ بندھوا دی اس کے سر پر پگڑی اور پھر ممبر بھی بنوا دیا شاہی جرگے کا۔ ممبر بنوانے کے ساتھ ساتھ مراعات بھی دے دیں۔ مراعات ہمیشہ روپے پیسے کی ہوتی ہیں۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ آج سے بیس سال پہلے تک جرگے میں صحیح انصاف ہوتا تھا۔ کوئی بھی جرم کسی علاقے میں ہوا۔ مقربین اور معتبرین نے مجرم کو پکڑا اور جرگے کے سامنے لے آئے۔ جہاں سوسائٹی محدود ہو' سب ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ روپے پیسے کی لعنت ماسوائے چند ے عوام کو نہ لگی ہو تو جرم کدھر چھپتا ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لوگ اپنے "رواج" اور دستور کے پابند ہی نہیں بلکہ اس پر فخر کرتے ہیں جو کہ سالہا سال سے چلے آ رہے ہیں چاہے کیسے بھی ہوں۔ جہاں ہر ایک سسٹم کی برائیاں ہیں وہاں خوبیاں بھی ہیں۔ چند ل

پہلے کوئی سیاسی پارٹی تو تھی نہیں اور اگر تھی بھی تو سرداروں کے رحم و کرم پر انہیں کی رائے عوام کی رائے لیکن اب کچھ حالات مختلف ہیں۔ اب جرگے کو خاص طور سے پڑھے لکھے پسند نہیں کرتے "جناب جرگہ ممبر بننے کے لئے اس میں سیاسی "نمبر بھی آگیا ہے۔ لوگ بھاگ دوڑ کرکے چاہے معتبر ہوں یا نہ ہوں ممبر بن ہی جاتے ہیں۔ پھر روپیہ پیسہ اور تعلیم کے ہوتے ہوئے لوگ رواج اور دستور کا بھی خیال کم ہی کرتے ہیں"۔

تعلیم اور روپیہ پیسہ کی ملاوٹ سے اخلاقی قدریں بدل ہی جاتی ہیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں آپ کی مرضی۔ ان کو روکنا ذرا مشکل کام ہے۔ خاص طور سے ان حالات میں جبکہ پرانا نظام دم توڑ رہا ہو اور نئی قدریں ان کی جگہ لے رہی ہوں۔ یہ تو ٹرانزیشن پیریڈ (TRANSITION PERIOD) ہو۔ یہ بدلتا دور تو اپنا وقت لے گا تاوقتیکہ حالات اعتدال پر نہ آجائیں۔ یہ ناگزیر ہے لیکن اس بات کا خیال رہے کہ حالات کو اعتدال کی طرف رخ کرنا چاہیئے۔ اپنی اخلاقی قدروں کو سرے سے پامال نہ ہونے دیں۔ سرداری اور وڈیرہ شاہی کو ہٹا کر اخوت اور مساوات کو قائم کیجئے جو کہ اسلامی اصول ہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ مثبت جذبات یعنی محبت باہمی احترام کا فروغ ہو اور منفی جذبات یعنی نفرت و حقارت کو قابو میں رکھا جائے۔ بھائی فلسفے کی حد تک تو یہ بات صحیح ہے مگر ہو کیسے؟ بنیادی چیز درست تعلیم ہے۔ گھر اور اسکول دونوں کی۔ اس پر محکمہ تعلیم اور والدین دونوں غور فرمائیں۔ تعلیم کا ذکر جب ہو ہی رہا ہے تو ایک ماہر تعلیم کا نظریہ بھی گوش گزار کر دیا جائے ان کی رائے ہے کہ کسی بھی ملک میں تعلیم کے دراصل تین اہم مقاصد ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر ایک شخص کو لکھا پڑھنا آتا ہو۔ آخر تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان کا دینی فرض ہے۔ مگر بنیادی تعلیم بغیر کسی ہنر کے بیکار ہے۔ یہ تعلیم تو عام ہونی چاہیئے۔ دوسرے مقاصد اور بھی اہم ہیں۔ جن پر کسی بھی ملک کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے ہر ایک ملک کا اپنا رائج شدہ نظام ہوتا ہے مثال کے طور پر اشتراکیت سرمایہ داری وغیرہ وغیرہ ہر ایک ملک تاریخ اور معاشرتی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی ایک نظام کو اپناتا ہے۔ اپناتے وقت نیشنل ازم، معاشی ترقی اور قومی کردار جو کہ اخلاقی قدروں پر مبنی ہوتا ہے۔ ان کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ جہاں تک اپنے ملک کا سوال ہے تو جناب یہ تو اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ جب اسلام کا نام آگیا تو جناب راہ عمل تعین کرنے میں کوئی دشواری درپیش نہیں ہونی چاہیئے تو تعلیم کو بھی ان ہی اصولوں پر استوار کیجیئے تاکہ ہر ایک پاکستانی کو راہ عمل پر یقین ہو۔

"یقین" کے بغیر نہ تو ترقی ہوتی ہے۔ نہ ہی یک جہتی قائم رہتی ہے اور نہ ہی ملک کا صحیح دفاع ہو سکتا ہے' اب رہ گئی آخری بات تو وہ یہ ہے کہ جب آپ نے تعلیم کو عام کر دیا تو یہ یاد رکھئے کہ تعلیم یافتہ لوگوں میں تقریباً ۲ فیصدی ایسے لوگ ابھرتے ہیں جو کہ ملک کے مختلف شعبوں میں ترقی کے حامل ہوتے ہیں۔ تو ان کے چناؤ ذہنی ارتقاء اور انہیں تعلیمی سہولتوں کے لئے آسانیاں بہم پہنچانی ضروری ہیں آپ کے سامنے چین کی مثال موجود ہے۔
انقلاب سے پہلے تعلیمی لحاظ سے وہاں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ لیکن دیکھتے دیکھتے دیکھتے اب اس ملک کی حالت کیا ہے۔ آج کل سرمائے کے پھیلاؤ کا ذکر تو ہوتا ہی رہتا ہے تو پھر معاشی انصاف بھی لازمی ہے۔ دولت کی تقسیم سے انصاف سے کیجئے۔ زیادہ پیسہ اور زیادہ طاقت ایک جگہ درست نہیں۔ سردار اور وڈیروں کو تو جانا ہے کاغذ پر تو چلے گئے مگر ان کا اثر کم ہوتے ہوتے کچھ دیر تو لگے گی۔ نئے نظام کو اعتدال کا خیال رکھتے ہوئے رائج کیجئے۔

ہاں تو جرگہ کا اعلان ہوا کہ بتاریخ ۲۵ دسمبر ۱۹۷۴ء بمقام کوہلو قرار پایا ہے۔ ہرکارے اکٹھے کئے گئے جو کہ لیویز کی شکل میں ہوتے ہیں اور پولیٹیکل ایجنٹ صاحب نے دعوت نامے جاری کر دیئے۔ یہ دعوت نامے تقریباً ایک ماہ پہلے جاری کئے گئے تھے۔ اب علاقہ بھی تو کافی پھیلا ہوا ہے۔ مقدم اور وڈیرے تو دور دراز جگہوں پر ہیں تقریباً ہر جگہ پیدل یا گھوڑوں پر جانا پڑتا ہے۔ سڑکیں بننے سے کافی آسانی ہو گئی ہے۔ یہ طے ہوا تھا کہ جرگہ تین دن تک رہے گا۔ دراصل یہ جرگہ نہ تو شاہی تھا نہ ڈویژنل اور نہ ہی لوکل اس کی اپنی نوعیت تھی' اس جرگے کے لئے دعوت نامے ہر معتبر اور وڈیرے اور مقدم کو بھیجے گئے۔ نام شاہی جرگہ کا ہوا۔ چلئے نام سے کیا ہوتا ہے کام سے مطلب' آپ یہ پوچھیں گے' یہ تین درجے کیا ہیں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ عزت کا معیار ہے۔ جو سالہا سال سے چلا آرہا ہے۔ آپ سے کیا پردہ چونکہ حالات کافی بہتر ہو چکے ہیں اس جرگے کا بلانے کا مقصد یہ تھا کہ مقدمین' معتبرین اور وڈیروں کو اکٹھا کیا جائے اور ان سے مری علاقے میں حالات کے بارے میں تبادلہ خیالات ہوں اور ان کی رائے بھی لی جائے کہ حالات کو اور کیسے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ ابھی تک فرار ہیں یا بقول شخصے ابھی تک پہاڑوں پر ہیں انہیں دلاسہ دے کر نیچے لایا جائے' پھر سب سے اہم بات یہ کہ مقدمین' وڈیروں اور معتبرین کو امن برقرار رکھنے میں ان کی ذمہ داری کا احساس بھی دلایا جائے۔ جس کے لئے وہ مراعات لیتے

رہے ہیں۔

مہمانداری تو دو تین دن پہلے سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ کچھ پیدل چل کر آئے کچھ گھوڑوں پر جیپیں اور سرکاری سواریاں بھی مہیا کی گئیں۔ ٹھہرنے کے لئے کوئٹہ کے معززین نے گھر خالی کر دیئے مگر مہمان تو چار سو سے اوپر ہی ہوں گے لیکن جرگے میں شامل ہونے والوں کی تعداد اسی تھی۔ بھئی وڈیرے لوگ جب کہیں جاتے ہیں تو ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جتنا بڑا آدمی اتنے ہی حالی موالی اس کے ساتھ' ان سب کی مہمانداری حکومت کا فرض ہے۔ یہ تو رواج ہے جو چلا آرہا ہے۔ دونوں وقت سجی کا ہونا ضروری ہے اگر نہ ہو تو ناراض ہو جائیں۔ اب بیچارے کہاں ناراض ہوتے ہیں اور خاص طور سے آجکل۔ یہ پرانی باتیں ہو گئیں کہ کھانا ٹھیک وقت پر نہ ملا تو لوگ ناراض ہو کر اٹھ بیٹھے۔ جگہ رتبہ کے لحاظ سے نہ رکھی تو تار بادشاہ سلامت تک کھڑک گئے۔ یہ لوگ نخرے بھی کرتے تھے اور ان کے نخرے برداشت بھی کئے جاتے تھے۔ کیونکہ سرکار برطانیہ کے لئے تندہی سے خدمت بھی بجا لاتے تھے۔ خلعت ملتی تھی۔ زمینیں دی جاتی تھیں۔ جاگیریں بٹتی تھیں۔ وہ بعد میں بھی ہوتا رہا۔ بیچارے عام آدمی تو پھر عام ہوئے نا۔

جرگہ ہال ایک بڑے شامیانے سے بنایا گیا تھا۔ وڈیرے اور معتبرین اسٹیج کے سامنے بیٹھے تھے اسٹیج کے ایک طرف مقدمین اور شاہی جرگہ ممبران' دوسری جانب سول افسران' اسٹیج پر پولیٹیکل ایجنٹ' کمشنر صاحب اور چیف سکریٹری۔ پریس کی جگہ بھی بنائی گئی تھی۔ دعوت نامے بھی بھیجے گئے تھے لیکن پریس افسر کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

پہلے کمشنر صاحب نے تقریر کی پھر چیف سکریٹری صاحب نے "آپ لوگ خود دیکھ رہے ہیں کہ حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ ہر جگہ ترقی اور تعمیری کام سرانجام دیئے جا رہے ہیں۔ یہ کام جب ہی جاری رہ سکتے ہیں کہ علاقے میں امن و امان ہو۔ کچھ لوگ ابھی تک فرار ہیں شاید ڈر کی وجہ سے ان لوگوں کو ابھی تک یقین نہیں ہے کہ حکومت انہیں معاف کر دے گی۔ وزیر اعظم صاحب کا اعلان بالکل واضح ہے کہ پندرہ دسمبر تک عام معافی ہے۔ آپ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ انہیں سمجھا بجھا کر واپس لائیں۔ بغیر تعلیم اور تعمیری کاموں کے ترقی ممکن نہیں۔ آپ لوگوں کو اپنی آئندہ نسل کا خیال ہونا چاہیئے۔ یہاں تعلیم ایک فی صدی سے بھی کم ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ امن و امان

قائم رکھنے کے لئے آپ لوگوں کو واضح منصوبہ تیار کرنا چاہیئے۔ تاکہ آپ کے اپنے علاقوں میں گڑبڑ نہ ہو۔ یہ تو یہاں کا رواج اور دستور ہے۔ اب چونکہ تعمیری کام ہو رہا ہے۔ آپ ہم لوگوں کو بتائیں کہ آپ کی کیا ضروریات ہیں اور انہیں کیسے پورا کیا جا سکتا ہے۔"

تقریریں ختم ہوئیں تو سب ایک ساتھ بولنے کی کوشش کرنے لگے۔ کوئی بلوچی میں بولتا اور کوئی اردو میں کمشنر صاحب نے سب کو خاموش کیا اور استدعا کی کہ برائے مہربانی ایک ایک کر کے بولیں۔ وڈیرہ صغر خان کھڑے ہوئے، دائیں بائیں دیکھا خاص طور پر سردار قیصر خان کی طرف جو سردار خیر بخش مری کے بھائی ہیں اور مقدمین کی قطار میں بیٹھے تھے "جناب ہمارے رسم و رواج کے مطابق ہمارا سردار ہی سب کچھ ہوتا ہے، اب سردار خیر بخش کی جگہ سردار قیصر خان ہیں۔ آپ نے ذکر امن و امان کا کیا تو ضروری ہے کہ ہمیں یعنی سارے مقدمین کو سردار سے ملنے کی اجازت دی جائے تب ہی ہم کچھ کہہ سکتے ہیں۔"

ابھی صغر خان کی تقریر جاری تھی کہ دوسرے کونے سے کچھ وڈیرے جوش میں اُٹھ کھڑے ہوئے، ان سب کا روئے سخن افسران کی جانب تھا کبھی کبھی قیصر خان پر بھی نظر ڈال لیتے۔ اِن سب بولنے والوں میں سب سے زیادہ، اونچی آواز وڈیرہ سہالن کی تھی "کہاں اور کب کی بات کرتے ہیں آپ لوگ آجکل جمہوریت اور جمہوریت کا زمانہ ہے۔ ایک آدمی کی رائے کوئی رائے نہیں ہوتی۔ فیصلہ ہم سب نے مل کر کرنا ہے نہ کہ اکیلے سردار نے۔"

بات کچھ بڑھتی ہوئی نظر آئی تو پھر کمشنر صاحب نے خاموشی کی استدعا کی۔ وڈیروں، معتبرین اور مقدمین میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ کچھ ایسا لگتا تھا کہ وڈیرہ سہالن کی بات کافی حد تک درست تھی مگر کچھ لوگ سردار کی طرفداری بھی کرنا چاہتے تھے۔ زیادہ تر طرفین کی باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے بیچ کا راستہ اختیار کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ کیا پتہ کل پھر سرداری نظام آجائے۔ پہلے بھی دو بار ایسا ہی ہو چکا ہے۔ ہر ایک کو اپنی جان، بیوی اور بچے عزیز ہوتے ہیں۔ پھر ویسے بھی بیچ کا راستہ درست ہوتا ہے۔

"جناب سردار سے ملنے کی وجہ یہ نہیں کہ ہم ان کے کہنے پر چلیں گے ہمارا مقصد یہ ہے کہ سردار صاحبان سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ قوم برباد ہو رہی ہے۔ نہ تعلیم ہے نہ اسکول اور نہ سڑکیں۔ مکمل امن و امان اگر قائم نہ ہوا تو ترقی میں دیر لگے گی۔ بہتر یہی ہے کہ دوستی کی راہ اختیار کی جائے۔"

وڈیرہ نہالن پھر جوش میں اٹھا "اگر سردار نے نہ مانا تو؟"

اس پر خاموشی سی ہو گئی۔ پھر چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ بحث کا رخ بدلا "ہمارا ایک اور مطالبہ ہے کہ ہمارے جو ہتھیار لے لئے گئے ہیں وہ واپس کئے جائیں۔ آپ صاحبان یہاں کے حالات سے واقف ہیں۔ ہمارے چاروں طرف اور جو قبائل رہتے ہیں ان سب کے پاس ہتھیار ہیں۔ ہمارا جھگڑا کھیتران، لونیوں، ڈرخیوں سب ہی سے ہے اب پوندے اور شنواری بھی آنے شروع ہو گئے ہیں، ہم اپنی اور اپنے جانوروں کی حفاظت بغیر ہتھیار کیسے کریں گے؟"

اس بات پر سب مصر تھے۔ مصر ہونا بھی جائز تھا۔ "جناب اگر آپ ہمیں ہتھیار نہیں دے سکتے تو ان سب کے بھی ہتھیار واپس لے لیں۔" سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔ کوئی آہستہ بولا کوئی غصے میں آ کر کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کسی نے بلوچی میں تائید کی کسی نے اردو میں تقریر کرنے کی کوشش کی۔ جب سب کہہ چکے تو وڈیرہ کریم داد جوش میں کھڑا ہوا۔ "ہم حکومت کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ افغانستان کو غلط پروپیگنڈے سے روکا جائے، ان کا ریڈیو ہماری بلوچی غیرت کو بار بار للکارتا ہے ہم خاموش تماشائی نہیں رہ سکتے۔ اگر حکومت ایسا کرنے سے قاصر ہے تو ہمیں اجازت دی جائے ہم خود حکومت افغانستان سے نمٹ لیں گے، ہم افغانستان کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ پاکستان کی سالمیت کے لئے ہم جان دینے کو تیار ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہے یہ ہمارا نجی معاملہ ہے۔"

ابھی وڈیرہ کریم داد بول ہی رہا تھا کہ معتبرین میں سے ببر خان کھڑے ہو گئے "صاحب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ریڈیو افغانستان ایک مری سردار کا نام لے کر پروپیگنڈہ کرتا ہے کہ مری افغانستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس سردار کا نام مہربان خان بتاتا ہے۔ ہم سب یہاں ہیں ہم میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں کہ مہربان خان کون ہے۔ چلئے اگر مان بھی لیا جائے کہ ایک مہربان افغانستان چلا گیا ہے تو باقی ان ہزاروں مہربانوں کا بھی ذکر کرے جو پاکستان میں برابر افغانستان کی حکومت سے تنگ آ کر یہاں آ رہے ہیں۔ ان لوگوں نے مری غیرت کو نہیں دیکھا ہے۔ ہم یہاں سے کیوں جائیں۔ پاکستان ہمارا وطن ہے نجی معاملے کس ملک میں نہیں ہوتے۔"

اس سلسلے میں کافی بحث ہو چکی تو بات ترقی کی شروع ہوئی۔ جناب ہماری استدعا یہ ہے کہ ترقی کی رفتار کو برقرار رکھا جائے، ہم اپنی فوج کے بے حد شکر گزار ہیں کہ وہ اتنی جانفشانی سے ترقی کے کاموں میں حصہ لے رہی

JALALI BOOKS

ہے۔ مکان بن رہے ہیں کنوئیں کھودے جارہے ہیں۔ ٹیوب ویل لگوارہے ہیں، سڑکیں بنا رہے ہیں، کہیں ان لوگوں کے جانے کے بعد کام سست نہ پڑ جائے"۔

بحث مباحثہ۔ چہ میگوئیاں اور کاٹ چھانٹ جاری رہی اب معاملہ ذمہ داری کا آگیا" ہم لوگ اپنے علاقے میں ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں ہمیں معلوم ہے کون باہر سے آیا اور گیا۔ بشرطیکہ ہمارے ہتھیار دے دیئے جائیں اور حکومت ہماری مدد کرے"۔

سردار قیصر خان کو کچھ اختلاف تھا۔ یہ "کہاں" سے پندرہ وڈیروں کے ساتھ آئے تھے" ہمارے لئے اپنے علاقے میں ذمہ داری لینا مشکل ہے۔ ہم لوگ خود شرپسندوں سے تنگ ہیں۔ ہماری اپنی جان خطرے میں ہے اگر ہم ذمہ داری لیتے ہیں اور خدانخواستہ کچھ ہمارے علاقے میں ہوگیا تو آپ لوگ ہمیں نہیں چھوڑیں گے امن و امان تو سب لوگ چاہتے ہیں مگر ذمہ داری کا سلسلہ مشکل ہے"۔

" صاحب کیسے مشکل ہے۔ شرپسند ہماری ہی قوم میں سے ہے ہر ایک وڈیرے کو معلوم ہے کہ اس قبیلے کا کون بدمعاش ہے اور کہاں بدمعاشی کرے گا۔ راشن اور ہتھیار بھی جہاں سے آتے ہیں وہ بھی ہم جانتے ہیں' اگر ہم سب سچے دل سے خواہاں ہیں کہ امن و امان قائم ہو تو یہ کارروائی بند کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ سب گڑبڑ اسی وجہ سے ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ اپنے مفاد کے لئے دوغلی پالیسی پر چل رہے ہیں"۔

کچھ کو غصہ آیا، کچھ ہنسے، کچھ سنجیدہ رہے، بات سے بات نکلتی رہی۔ کمشنر اور چیف سکریٹری صاحب دلچسپی لیتے رہے اور ایک طرح سے ماڈریٹر کے فرائض انجام دیتے رہے، بات زیادہ تر جرگے والے ہی کرتے تھے چیف سکریٹری صاحب نے بڑے تحمل سے کہا" آپ لوگ سب جانتے ہیں کہ حکومت کیا چاہتی ہے۔ اب آپ لوگ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ کام کس طرح خوش اسلوبی سے انجام دیا جا سکتا ہے آج کا دن آپ کے پاس ہے کل بھی آپ لوگ سوچیں اور آپس میں صلاح مشورہ کریں، اس دوران جب بھی آپ چاہتے ہوں کہ ہم لوگ ساتھ شامل ہو جائیں آپ ہمیں بلالیں لیکن کل ضرور آپ لوگ ہمیں اپنی رائے اور مشوروں سے کلی طور پر مطلع کردیں"۔

ہم لوگ اٹھ کر چلے آئے مگر میں ذاتی طور پر جرگے کے ماحول سے بے حد متاثر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کا جرگہ جہاں اتنے لوگ شامل ہوئے تقریباً آٹھ سال کے بعد ہوا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جو جس کے دل

KUTUB KHANA JALALI BOOKS

میں آتا ہوتا ۔ شروع شروع میں ضرور بولنے والوں میں تھوڑی جھجھک تھی کہ وڈیروں نے مقدمین کی طرف دیکھا ۔ قیصر خان یا افسران کی طرف نگاہ ڈالی مگر بعد میں کھلی بحث تھی ۔ کچھ دل کی بھڑاس نکالی کبھی کسی پر طعن بھی ۔ افسران کو بھی تختۂ مشق بنایا ۔ ظاہر ہے آٹھ سال سے اور پھر خاص طور سے فوجی کارروائی کے بعد سے پہلی مرتبہ باہمی تبادلۂ خیال کا خلا ٹوٹا تھا ۔ یہاں پر سب سے بڑا مسئلہ اسی خلا کو پُر کرنا ہے ۔ کاش وڈیروں کے ساتھ یہاں کے عوام بھی نمائندے ہوتے ۔ اسے تو جناب دیر لگے گی ۔ صدیوں کی بات اتنی جلدی ختم نہیں ہوتی جب تک حکومت پوری طرح سے قائم نہ ہو جائے اور کسی حد تک جان اور مال کی حفاظت نہ سنبھال لے اور پھر بڑی بات تعلیم ۔ جب تک یہ باتیں نہ ہوں تو نمائندے تو یہی رہیں گے مگر عام آدمی سے ربط قائم کرنے کے لئے کون روکتا ہے ۔ بسم اللہ تو ہونی چاہیئے اور فوراً ہی ہونی چاہیئے ۔ عام آدمی کی بات بعد میں ہوگی ۔ ابھی انہی مقدمین وڈیروں اور معتبرین ہی کو لے لیں ۔ اس جرگے سے پہلے جب بھی انہیں بلایا جاتا تو یہ لوگ کھل کر بات نہیں کرتے تھے ۔ ربط تو کوئی خاص تھا نہیں ۔ کچھ جھجھک ، کچھ ڈر اور کچھ احترام ۔ جب تک آدمی کھلے نہیں تو سچی اور دل کی لگی بات کیسے ہو اور کیسے ان لوگوں کو یقین آئے کہ جو آپ کہہ رہے ہیں سچ ہے اور کیسے یہ بھروسہ کریں کہ حکومت کا یہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں ۔

یہاں پر جہاں اور بہت سے خلا موجود ہیں یعنی تعلیم کا خلا ۔ رسل و رسائل کا خلا ، ترقی کا خلا ، وغیرہ وغیرہ ۔ ان سب سے اہم خلا عوام کے ساتھ باہمی تبادلۂ خیالات کا خلا ہے جسے انگریزی میں INTER PERSONAL MMUNICATION GAP کہتے ہیں ۔ تو جناب یہ خلا موجود تھا اور اب بھی کسی حد تک ہے ۔ آج کل کے حالات کی نوبت بھی اسی خلا کی بنا پر ہوئی ۔ آپ کا لاکھ جی چاہتا ہے کہ عام آدمی سے بات کریں اور اس کی بھی سنیں مگر " زبانِ یار من ترکی ، من ترکی نمی دانم " لہٰذا جو آپ اس سے کہنا چاہتے ہیں وہ سمجھتا نہیں ۔ اب جو کچھ وہ سنتا ہے ، اپنے وڈیرے ، معتبر یا مقدم سے ، یہ کہتے ہیں کہ تمہاری عورتیں اٹھالی جائیں گی ۔ سچ ہے تمہارے جانور اور زمینیں چھین لی جائیں گی ۔ سچ ہے ، اب اس غلط فہمی کو کون دور کرے ۔ عام آدمی جب مشکوک ہے تو آپ کے پاس کیسے آئے اور اگر آئے تو کھلے کیسے ۔ جب سے سڑکوں پر کام شروع ہوا ہے اور پھر حال ہی میں اور ترقیاتی کام شروع ہوئے تو عوام اور انتظامیہ قریب آئے ۔ کام تو ساتھ مل کر کرنا تھا ۔

JALALI BOOKS

ایک دوسرے کی زبان سیکھی۔ ربط بڑھا شکوک دور ہوئے، پہلا طعنہ یہی تھا کہ آپ بات کرتے ہو تو وڈیروں سے۔ ہماری بھی سنو، راشن کپڑا، مزدوری جو کچھ دینا ہے ہمیں ہمارے ہاتھ میں دو، ہمیں تو لوٹ لیا برباد کر دیا اگر وڈیرہ سامنے آگیا تو خاموشی۔ دیر تو ضرور لگے گی۔ یہ زنجیریں تو ٹوٹتی ہیں اور ٹوٹیں گی۔

ایک عجیب بات کہ بیداری آتی ہے تو تیزی سے آتی ہے۔ آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ سوتے آدمی کو دھکا دے کر اٹھائیں تو اونگھ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک ہمارے مری دوست جو سڑک پر کام کرتے ہیں شکوہ کرنے لگے "یہ شامیانے کس کے لئے لگ رہے ہیں باتیں کن سے ہو رہی ہیں۔ وڈیروں سے ہی نا! ہمیں کون پوچھتا ہے؟" رقابت تو ہونی تھی۔ جواب دینا مشکل۔ سوچ کر بولے" ایک دن میں تو دنیا نہیں بدلتی۔ کام آہستہ آہستہ ہی ہوتے ہیں۔ چلئے ربط تو قائم ہوا۔ چاہے۔ وڈیروں ہی سے۔

دوسرے دن جرگہ منعقد ہوا اور متفقہ طور پر ایک قرارداد پاس کی گئی جس کا مفہوم یہی تھا پاکستان ہم سب کا ملک ہے اور اس کی ترقی کے لئے سب سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ افغانستان کے رویے کی مذمت کی گئی۔ ترقی کی رفتار کی برقرار رکھنے کے لئے زور دیا گیا۔ عوامی حکومت اور خاص طور سے وزیر اعظم صاحب کی ذاتی کوششوں کو جو وہ ترقی کے سلسلے میں کر رہے ہیں۔ سراہا گیا۔

آپ کہتے ہیں کہ اس فرسودہ نظام کو ہٹاتے ہٹاتے دیر لگے گی۔ جی ہاں دیر تو لگے گی ایک نظام چاہے کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو، اسے ایک دم نہیں ہٹایا جا سکتا۔ اگر آپ ہٹائیں گے تو پھر وہی خلاء والی بات۔ یعنی (VACUUM) پیدا ہو جاتا ہے جو بذاتِ خود مضر ہے، اسے تبدیل ہی کیا جا سکتا ہے، تبدیلی میں دیر تو لازمی ہے مگر شروع تو ہو گئی ہے کل ایک اہلکار بہت ناراض تھے۔ "کیا ہوا جناب؟" "کیا عرض کریں جناب کوئی آتا ہے کپڑے دو کوئی کہتا ہے راشن کا نظام درست نہیں۔ کوئی کہتا ہے فلاں کا کنواں منظور کیا ہے مجھے کیوں نہیں حکومت سب کو دیتی ہے آپ لوگ کوتاہی کرتے ہیں، میں تو تنگ آگیا ہوں"۔ "اس میں تنگ ہونے کی کیا بات ہے" "صاحب کس کس کو سمجھائیں۔ جب ڈانٹ کر باہر نکالنے کی دھمکی دی تو کہنے لگا۔ اچھا مت سنو۔ بھٹو صاحب جب آئے گا تو ہم اس کو کہیں گے"۔

❋

کوہلو میں عید

کوہلو کی پیپلز کالونی جو زیر تعمیر ہے

کوہلو میں عید

کوہلو میں گرمی زیادہ نہیں پڑتی۔ اس لئے کام کے باوجود روزہ رکھنا مشکل نہیں۔ رمضان شریف میں کافی کوشش کی گئی کہ اپنے دوستوں کو اور پھر جو نظر بند ہیں انہیں بھی نماز پڑھنا سکھایا جائے۔ اس نیک کام میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ روزہ یہاں لوگ کم ہی رکھتے ہیں مگر اچھی خاصی تعداد نے ہمت کر ہی لی۔ ایک بات عجیب ہے کہ بیشتر کے ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے۔ اللہ کو ضرور یاد کرتے ہیں۔

سترہ اکتوبر کو سب اس امید میں تھے کہ عید شاید اٹھارہ کو ہو جائے۔ مگر شام کو رویت ہلال کمیٹی کا اعلان ریڈیو پر سنا کہ عید انیس کو ہوگی۔ ویسے عید کے سارے انتظامات مکمل کر لئے گئے تھے کہ نماز فوجی اور غیر فوجی ایک ہی ساتھ پڑھیں۔ نظر بندوں کو ساتھ ملایا جائے گا اور کھانا بھی ایک ہی جگہ کھایا جائے گا۔

اٹھارہ اکتوبر کو چونکہ عید نہیں تھی اس لئے ہم لوگ کام میں مشغول ہو گئے۔ یکایک پتہ چلا کہ لوگوں کی خاصی تعداد نے عید منالی ہے۔ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

"ان لوگوں نے ابھی ابھی چاند دیکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بازار میں بھی کھلے بندوں کھا رہے ہیں" دوپہر

کو پہلی کا چاند نظر آتے آج تک سنا نہ دیکھا۔ جب ہمارے ایک افسر نے مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ایک مولوی صاحب نے فتویٰ دیا ہے کہ آج کی عید ہے۔ مولوی صاحب سے استفسار کیا گیا کہ جناب کیا آپ نے فتویٰ دیا ہے کہ آج کی عید ہے"۔

"مجھے فتویٰ دینے کا کوئی حق نہیں اور نہ ہی میں نے یہ کہا ہے کہ آج کی عید ہے"۔

"لوگ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے آج عید منانے کی اجازت دی ہے"۔

"مطلب یہ ہوا کہ آپ نے عید منانے کی اجازت دی ہے۔ کیا آپ اس بارے میں کوئی دلیل پیش

"صاحب بات یہ ہے کہ ایک نوجوان نے کہا چاند نظر آگیا، میں نے بھی دیکھا ہے اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آپ بھی دیکھ لیں میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ اس معاملے میں مسئلہ یہ ہے کہ روزے چاند دیکھکر شروع کیے جاتے ہیں اور چاند ہی نظر آنے پر اختتام پر پہنچتے ہیں۔ اب چونکہ چاند نظر آگیا ہے تو افطار لازم ہے۔

کر سکتے ہیں۔ یا فتوے دے سکتے ہیں"۔ مولوی صاحب کچھ سوچ کر بولے کہ "جناب عید منانے کے بارے میں تو میں کوئی فتویٰ نہیں دے سکتا کیونکہ زوال کا وقت شروع ہو گیا ہے اور نماز بہرحال کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ اب روزہ رکھنا جائز نہیں"۔

"مولوی صاحب بات دراصل یہ ہے کہ افطار میں صرف چار گھنٹے باقی رہ گئے ہیں اور ایسی حالت میں روزہ توڑنا درست نہیں لگتا"۔

مولوی صاحب خاموش ہو گئے۔ پھر سوچ کر بولے "صاحب جو آپ کی مرضی لیکن یہ تو دین کی بات ہے اور مسئلہ صاف ہے۔ چاند نظر آگیا۔ لہٰذا اب روزہ رکھنا جائز نہیں"۔

اب جس نے چاند دیکھا تھا اُسے طلب کیا گیا۔ چاند دیکھنے والا ایک سگنل مین تھا۔ سگنل مین ریڈیو کے ایریل کو ٹھیک کر رہا تھا۔ اُس کی نظر چاند پر پڑ گئی اس نے اپنے ساتھیوں کو دکھایا اور جو آس پاس لوگ تھے انہیں بھی۔

"آپ نے کہا کہ چاند نظر آگیا اور آج کی عید ہے"۔

"صاحب میں نے تو چاند دیکھا تھا یہ نہیں کہا تھا کہ آج عید ہے"۔

"پہلی بات تو آپ نے چاند دیکھا کیوں؟ اگر دیکھا بھی تو ہماری اجازت کے بغیر دوسروں کو کیوں دکھایا؟"

"جناب میں نے تو نہیں دیکھا' وہ تو نظر آگیا۔ یہ ضرور غلطی ہوگئی کہ بغیر آپ کی اجازت کے دوسروں کو دکھایا۔"

"اب غلطی ہوگئی ہے تو چلو ہمیں بھی چاند دکھاؤ"

افسر صاحبان مکان کی چھت پر چڑھے تو معلوم ہوتا تھا کہ سگنل مین نے چاند دکھانے کا پورا پورا بندوبست کیا ہوا تھا۔ چھت پر ایک طرف دوربین رکھی ہوئی تھی۔ ایک کنارے پر دوشاخہ کاٹ کر بیچ میں ایک نشان لگایا ہوا تھا۔ نشان کو چھت کے کنارے سے ملا کر مکمل شست لگائی گئی تھی۔ افسر صاحبان نے پہلے تو بغیر دوربین کے چاند کو دیکھا مگر یقین نہ آیا پھر دوربین سے دیکھا تو چاند صاف نظر آرہا تھا۔ مولوی صاحب خاموش کھڑے تھے۔ آخر میں یہ طے پایا کہ نماز اور خطبہ تو بہرحال ہو نہیں سکتا اب رہ گیا سوال روزے کا۔ مولوی صاحب اس پر مصر کہ چاند دیکھنے کے بعد اگر کسی نے روزہ رکھا تو یہ حرام ہوگا۔ دوسرے مولوی صاحبان بلائے گئے' ہر ایک کی رائے مختلف۔ روزے کا مسئلہ نیت پر چھوڑ دیا جائے اللہ تعالیٰ بڑا غفور الرحیم ہے' وہ نیت کو دیکھتا ہے۔ نیت صاحب اپنی جگہ پر' یہ تو دینی احکام ہیں' مسئلہ صاف ہے' چاند دیکھ لیا روزہ توڑنا لازم۔"

"اچھا آپ اتنے مصر ہیں تو دلیل پیش کریں"

کوہلو میں مسئلے مسائل کی کتابیں کہاں' مولوی صاحب بڑی دیر بعد اس پر راضی ہوئے کہ چلئے ہر ایک کا گناہ ثواب اس کے ساتھ مگر "میں تو یہی کہوں گا کہ اب روزہ رکھنا جائز نہیں"۔ بہرحال یہ طے پایا کہ عید کی نماز کل صبح ہوگی۔

مری قبائل کی جہاں اور روایات ہیں وہاں ایک خاص روایت یہ بھی ہے کہ ہر ایک وڈیرہ عموماً اپنے فرقے یا خاندان کے ساتھ ایک مولوی ضرور رکھتا ہے۔ یہ مولوی صاحبان اکثر پٹھان یا ڈیرہ غازی خان کے رہنے والے ہوتے ہیں۔ مری مولوی اکثر کم ہی نظر آتے ہیں۔ آج کل کافی لوگ رحیم یار خان یا بھاولپور کے مدرسوں میں تعلیم پارہے ہیں۔ لیکن تعلیمیافتہ مری مولوی صاحبان خانہ بدوشوں کے ساتھ پھرنے کو ناپسند کرتے

ہیں اور عام طور سے مسجدوں کو آباد کر کے وہاں درس دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس قسم کے کئی مولوی صاحبان
سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ماشاءاللہ کافی عالم لگتے تھے اور سب سے بڑی بات مشنریوں کی طرح اس بات پر
آمادہ نظر آتے تھے کہ جہالت کو ختم کر کے رہیں گے اور قرآنی تعلیم کو جہاں تک ممکن ہوا پھیلائیں گے۔ اللہ تعالیٰ
ان کو کامیاب کرے آمین ثم آمین۔ ان مولوی صاحبان کی ہم نے ہر طرح سے مدد کرنا چاہی مگر ان لوگوں نے یہ
کہہ کر ٹال دیا کہ "ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے۔ اگر آپ لوگوں سے ہم نے مدد لی تو ہمارا یہاں رہنا دوبھر ہو جائے گا۔
اگر آپ امداد اس طرح سے کر سکیں کہ دوسروں کو پتہ نہ چل سکے تو بسم اللہ۔ کون ایسا ہو گا کہ ایک نیک
کام میں ہاتھ نہ بٹاتا۔

دوسرے وہ مولوی صاحبان ہیں جو کہ مشہور مقامات پر رہتے ہیں جیسے کہ ملوا اور میوند وغیرہ
یہاں تو ہر طریقے سے مدد کی جا سکتی ہے اور کھلے بندوں مدد قبول کرتے ہیں۔ ہاں تو ذکر ایسے مولوی صاحبان
کا ہو رہا تھا جو کہ قبائلیوں کے ہمراہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہتے ہیں۔ نظر بندوں کے ساتھ ایسے تین
مولوی صاحبان ہیں۔ دو ڈیرہ غازی خان سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک پٹھان جو دکی کے رہنے والے ہیں۔ جہاں
تک دکی والے مولوی صاحب کا تعلق ہے، ان کا کہنا ہے کہ وہ خیرات لینے ہر دوسرے یا تیسرے مہینے علاقے کا
چکر لگاتے ہیں اور قبائلیوں سے خیرات لے جاتے ہیں۔ اکثر نماز جنازہ پڑھانے کے سلسلے میں بھی مدد ہو جاتی
ہے، اگر کہیں موت واقع ہو جائے تو پھر وہاں سے دو یا تین دنبے خیرات کے مل جاتے ہیں۔ یہ مولوی صاحب
ایک چھوٹی سی زیارت کے مجاور بھی ہیں۔ لوگ وہاں منتیں مانگنے بھی آتے ہیں۔ پھر تعویذ اور "ہدی" کرنے
سے بھی آمدنی ہو جاتی ہے "ہدی" کرنے سے یہ مراد ہے کہ کسی کے اوپر دم کر دیا جاتا ہے کہ تمہیں گولی نہیں لگے گی اگر
لگے گی بھی تو مرو گے نہیں اور اگر مر بھی گئے تو سیدھے جنت میں جاؤ گے"۔

ڈیرہ غازیخان کے مولوی صاحبان میں سے ایک تو پولیس کی نوکری کر چکے ہیں اور دوسرے پنشن یافتہ
حوالدار ہیں۔ ان مولوی صاحبان کے لئے سب سے زیادہ سہولت یہ ہے کہ یہ لوگ اردو اور بلوچی خوب روانی سے بولتے
ہیں لہٰذا انہیں ترجمان کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اس لئے ان لوگوں کی عزت میں کافی اضافہ ہوا ہے پہلے تو ان لوگوں
کو "ملّا" کہا جاتا تھا جو کہ عام رواج ہے مگر جوں جوں دن گزرتے گئے اور یہ لوگ نظر بندوں کی دادرسی اور تک

KUTUB KHANA JALALI BOOKS

پہنچانے تو پھر یہ مولوی بنے اور آج انہیں مولوی صاحب کہا جاتا ہے۔ یہ مولوی صاحبان قبائلیوں کے ساتھ رہتے ہیں، اذان پانچوں وقت کی دے لیتے ہیں، ماشاء اللہ نماز پڑھانا بھی آتی ہے، کہتے ہیں نماز جنازہ بھی پڑھا سکتے ہیں مگر اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ ان لوگوں کی گزر اوقات اچھی خاصی ہو جاتی ہے۔

عید کا اجتماع ہوا۔ نظر بند ایک طرف اور باقی دوسری طرف۔ عید کے دن یہ بات دل کو نہ لگی قصداً ہم فوجی بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ نماز ختم ہوئی۔ سب سے گلے ملنا شروع کیا۔ یہاں ایک رواج ہے کہ عید ملنے کے بعد عید ملنے والا کہتا ہے "حق بخشا" پھر دوسرا بھی یہ ہی جواب دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ جو بھی غلطیاں ہم سے سرزد ہوئیں معاف کر دو۔ "بڑی بات ہے" اس طرح "حق بخشوا" کر سب پھر سے آپس میں بھائی بھائی اور دشمنی فراموش کر دی جاتی ہے۔

یہ ایک نیک شگون تھا۔ عید کے ایک ہفتے بعد ہی عام معافی کے تحت سب نظر بندوں کو رہا کر دیا گیا۔

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

عامر معافی

میرے بہت سارے دوست کوہلو کیمپ میں

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS

عام معافی

"ضد اور انتقام" انسانی فطرت ہے اس کی نفی "صبر اور تحمل" ہے۔ فطری عادتوں کو قابو میں رکھنا ایک خوبی ہوتی ہے۔ خوبی ہی کیا ہوئی اگر ہر ایک شخص اس کا مالک ہو' اچھے سے اچھے انسان میں بھی کوئی نہ کوئی خامی ضرور ہوتی ہے۔ ورنہ فرشتہ بننا آسان ہو جائے اور دنیا کی خرابیاں کسی حد تک دور ہو جائیں۔ ضد کسی حد تک جائز بلکہ یوں کہیے کہ برداشت کی جا سکتی ہے۔ انتقام بھی چلیے اعتدال تک درست۔ جی تو نہیں مانتا مگر مان لیتے ہیں۔ کیونکہ آپ نے لفظ اعتدال شامل کر لیا ہے۔ لیکن جب ان فطری عادتوں کا اثر گناہگار اور بے گناہوں پر یکساں پڑے تو پھر آپ ہی جواب دیجیے' آخر حقوق بھی تو کوئی چیز ہوتے ہیں۔

چلیے حقوق ہی کی کچھ بات ہو جائے "حقوق النفس" یعنی انسان کے اپنے نفس کے کچھ حقوق ہوتے ہیں مگر اس حد تک کہ ان سے تجاوز نہ کیا جائے۔ لیکن اگر تجاوز کیا گیا تو بات مُضر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ ایک یا دو وقت تو بھوکے رہ کر اپنا کھانا دوسروں کو دے سکتے ہیں مگر ہمیشہ تو ایسا نہیں کر سکتے مگر اس کا سب سے بہتر امتزاج یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اتنا ہی کھانا کھائیں جتنا آپ کو ضرورت ہے باقی دوسری حاجت مندوں کو دے دیں۔ یہ بھی آج کل کے زمانے میں مشکل کام ہے' نفس تو بہرحال نفس ہے۔ پہلے "میں" بعد میں کوئی

اور "میں" ہے کہ ختم ہونے پر ہی نہیں آتا " بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارا کو گر مارا " آگے بڑھیئے تو حقوق العباد آتے ہیں یعنی بندوں کا بندوں پر حق ان حقوق کو تو سرے ہی سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس حق تلفی کو تو خدا بھی معاف کرنے کے لئے تیار نہیں۔ جب تک کہ جس کے ساتھ حق تلفی کی گئی ہو وہ معاف نہ کر دے۔ "حقوق اللہ" تو خیر سب ہی جانتے ہیں اور اس کو اس طرح کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ بڑا غفور الرحیم ہے۔

اگر آپ کے ساتھ کسی نے زیادتی کی ہو تو اس کو معاف کرنا ذرا محال ہوتا ہے۔ زیادتی دیدہ و دانستہ یا پھر کسی غلط فہمی کی بنا پر ہو سکتی ہے اس کا تجزیہ ضروری ہے مگر تجزیہ ہو کیسے۔ جذبات پر قابو رکھیں اور سوچیں۔ جناب جذبات ہی کیا ہوئے جو قابو میں آ سکیں۔ آ سکتے ہیں۔ ذرا "ضد اور انتقام" کو ایک طرف کر دیں۔ کیسے کر دیں یہ تو انسانی فطرت ہے۔ فطرت تو ہے مگر حقوق جن کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی تو کوئی چیز ہیں۔ ارے صاحب! کہاں کی اور کب کی بات کرتے ہو۔ جناب حال ہی کی بات ہو رہی ہے دنیا کے ماہرین نفسیات بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ اگر ذہنی کوفت اور بیماریوں سے بچنا ہے تو خدا کا سہارا ڈھونڈو۔ جو لوگ خدا ترس ہیں اور ایمان رکھتے ہیں تو یہ بیماریاں ان کے پاس پھٹکتی تک نہیں۔ یہی حال قوموں کا ہے قوموں کو بھی تو بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں بھائی پھر فلسفے پر آ گئے کہنا کیا چاہتے ہو۔

اکثر شام کو ٹہلتے ہوئے نظر بندوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ہیں تو اپنے ہی! چاہے انہوں نے زیادتیاں ہی کی ہیں۔ آدمیوں کو مارا ہے ان پر فائرنگ کی ہے مگر اب بات دوسری ہے۔ پناہ پھر پناہ ہوتی ہے۔ بدلہ لینے یا دینے والا تو کوئی اور ہی ہے۔ انسان کا اگر بس چلے تو ذرا اختلاف ہو تو رزق بند کر دے وہ تو کہیئے خیریت ہوئی کہ موت و حیات اور تقدیر خداوند تعالیٰ نے اپنے ذمے رکھی ہے۔ اگر وہ لینا چاہے تو کسی کا زور نہیں چل سکتا اور اگر دینا چاہے تو کسی کی مجال نہیں کہ دخل اندازی کر سکے۔ " بھٹو صاحب تو ہم لوگوں کو معاف کر گئے آپ ہمیں کب چھوڑ رہے ہیں کہ اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے۔

مری حال ہمیشہ صحیح اور تیز ہوتا ہے۔ اب پتہ نہیں یہ خبر کہاں تک درست تھی۔ بہر حال اس میں تھوڑی بہت حقیقت ضرور ہوگی۔ "جہاں اتنا صبر کیا تھوڑا اور سہی۔ کاغذات تیار کرتے ہوئے بھی دیر ہو ہی جاتی ہے" ایک طرف نظر بندوں کا یہ حال تھا تو دوسری جانب اسی علاقے اور اطراف کے کچھ پڑھے لکھے قبائلیوں

اور چند مہمانوں کی جو رائے تھی۔ ان کی ایک جھلک آپ بھی دیکھ لیں۔

" یہ لوگ تھوڑے دنوں بعد یہی حرکت کریں گے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے انگریزوں کے زمانے میں بھی یہی ہوتا آیا ہے۔"

جناب وہ تو ان لوگوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور علاج بھی خوب کرتے تھے۔ آپ کو نہالاں کے والد کا قصہ معلوم ہے یہیں کوہلو میں ایک گورا پلٹن ہوتی تھی وہ گشت کر کے مع اپنے کمانڈنگ آفیسر کے" برنتگی" سے واپس آ رہی تھی۔ نہالاں کے والد نے کچھ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان پر فائر کھولا۔ اس حادثے میں کمانڈنگ آفیسر مارا گیا۔ انہوں نے اس کے باپ کو گرفتار کیا ویسے بھی وہ اس علاقے کا وڈیرہ تھا۔ دس اور آدمی اس کے ساتھ پکڑے۔ کوہلو کی آبادی کو اکٹھا کیا۔ ان سب کو توپ کے دہانے کے آگے باندھا اور اڑوا دیا۔ مجال ہے اس کے بعد سے یہاں کوئی اس قسم کی واردات ہو تو جائے۔"

" اب سب کو معلوم ہے کہ کون کون تخریبی کارروائیوں میں ملوث تھے یہ بھی معلوم ہے کہ کس کس نے کہاں فائر کیا کہاں گولیاں چلائیں اور جانی نقصان کیے۔ اب اور کیا چاہیے۔ اس کے برخلاف آپ لوگ ان کے جنازے پڑھتے رہے۔ بیماریوں کا علاج کیا اور کر رہے ہیں اس کا دوسرا اثر یہ ہو گا کہ یہ لوگ سمجھیں گے کہ بس کھیل ہے۔ دوبارہ پھر سے کام شروع۔ معافی تو مل ہی جاتی ہے۔ مان لیا سب ان کارروائیوں میں شامل نہ تھے بہر حال جن کے خلاف شہادتیں موجود ہیں اور کم سے کم ان وڈیروں کو تو نہ چھوڑا جائے جو اس میں شامل تھے۔"

" معلوم ہوتا ہے کہ مہمان آئے ہیں۔ نظر بندی کیا ہے مہمان خانہ کھلا ہے ان کا کھانا چیک کیا جاتا ہے کوئی بیمار ہو تو ڈاکٹر آ گئے۔ پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ بیوی بچوں کے لئے مفت راشن تقسیم ہو رہا ہے۔ بچہ یا کوئی عورت بیمار ہو تو ایمبولنس اٹھارہ میل جا رہی ہے۔ ٹی بی کے مریض ہیں تو سبی کا پڑے کوئٹہ پہنچائے جاتے ہیں۔"

" جانے دو ان باتوں کو اور کیا کہیں ہفتے میں ایک دفعہ گاڑیوں پر بٹھا کر انہیں اپنے بیوی بچوں سے ملانے لے جایا جاتا ہے کبھی یہ خاطر تواضع سنی ہے ؟"

ہم باہر کھڑے سلسلہ کلام سنتے رہے۔ کوئی مشرقی پاکستان کا حوالہ دیتا کہ وہاں بھی عام معافی ہوئی تھی اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ کوئی ملیشیا کی کہانی دہراتا تو کوئی افریقہ کی۔ اس محفل میں ہماری ایک یونٹ کے

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

کمانڈنگ آفیسر صاحب بھی موجود تھے۔ کافی دیر تک خاموشی سے یہ باتیں سنتے رہے آخر ان سے نہ رہا گیا اور ان کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئی۔

"جناب نہالاں کے باپ کے ساتھ کیا ہوا تھا اور کس نے کیا تھا وہ امپریلسٹ اور یہ کالونی تھی ہم لوگ یہ کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارے بھائی ہیں اور پاکستان کے شہری۔ یہ کام مشکل تو ہے مگر اس کو اس طرح سے سرانجام دینا ضروری ہے کہ ہم سے انہیں نفرت اور حقارت نہ پیدا ہو۔ فوج عوام کی ہوتی ہے۔ ہر وقت ان کے دل میں ہماری محبت قائم رہنی چاہیے۔ امپریلسٹ فوج سے لوگوں کو ڈرنا چاہیے اور یہی وجہ تھی کہ انگریز انہیں جان بوجھ کر اس طرح استعمال کرتے تھے نیشنل یا قومی اور امپریلسٹ فوج میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ انگریز کی ذہنیت سے کامیابی نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کے مقاصد اور ماحول ہی جُدا تھے۔ یہ تو اپنے بھائی ہیں۔"

"بھائی تو خیر ٹھیک ہے" کسی نے آہستہ سے کہا مطلب یہ کہ بات دل کو نہیں لگی۔

"انگریز کا یہاں کیا مقصد تھا صرف یہ کہ امن قائم رہے اور وہ بھی کم سے کم خرچ میں۔ یہ علاقہ تو ہمیشہ سے غیر منافع بخش رہا ہے۔ یہاں اب تک کوئی ترقی نہیں ہوئی لہٰذا آمدنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیسا بقیہ پاکستان ہے پاکستان صرف کراچی، لاہور، پشاور اور کوئٹہ تک ہی محدود نہیں۔ پاکستان کو ہلو، میوند اور کاہان بھی ہے۔ اگر پاکستان بننے کے بعد یہاں سڑکیں نہیں بنیں، اسکول نہیں کھلے، انڈسٹری قائم نہیں ہوئی۔ انتظامیہ جدید تقاضوں کے طرز پر قائم نہیں ہوئی تو کس کا قصور ہے اگر انگریز کا طریقہ استعمال کرنا ہے تو پھر امپریلسٹ ہی رہیے یہاں لوگوں کے لئے پاکستان یا انگریز کی حکمرانی ایک ہی معنی رکھتی ہے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا مطلب اور مقصد تو یہی تھا کہ ہر ایک پاکستانی کو یکساں حقوق میسر ہوں۔ کسی کی بھی کسی کے اوپر بالادستی نہ ہو اور ہر ایک فرد اپنی استعداد کے مطابق پاکستان کی ترقی میں یکساں شریک ہو۔"

محفل میں خاموشی سی چھا گئی۔ یہ بڑی مشکل ہے دراصل جب کوئی آفیسر بات کرنی شروع کر دے تو بہت کم لوگ اس کے سامنے اختلاف کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔ اختلاف تو ضرور کرنا چاہیے بشرطیکہ اگر کسی کو دل سے یقین ہو کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ ٹھیک ہے۔ اگر ایسا نہیں ہو گا تو آپ کو کیسے پتہ لگے گا کہ دوسروں کے

جذبات کیا ہیں۔ مان لیں اگر ان کے جذبات آپ کے خیال میں درست نہیں تو پھر آپ ان کو راہِ راست پر کیسے لا سکتے ہیں۔ جب آپ کو پتہ ہی نہیں کہ دوسرے کیا سوچتے ہیں اور کیسے سوچتے ہیں۔ کرنل صاحب نے سوچتے ہوئے سلسلہ کلام شروع کیا۔

"ان حالات میں فوجی کارروائی مختلف ہوتی ہے فوجی عمل صرف پندرہ فی صدی اور سول عمل پچاسی فیصدی ہونا چاہیے۔ جس سے حالات قابو میں آسکیں یعنی زیادہ زور اس بات پر ہو کہ جو علاقے کی تکلیفات ہیں جیسے انتظامیہ کا نہ ہونا۔ طبی امداد کا فقدان، اسکول اور سڑکیں ناپید وغیرہ وغیرہ کو پورا کیا جائے موجودہ گڑبڑ کو ایک ہی زاویے سے نہیں دیکھا جاسکتا اسے تو ہر زاویے سے دیکھنا ہوگا۔ اور اسی طرح اس کا سدِباب کیا جاسکتا ہے۔ بات صرف موجودہ حالات ہی کی نہیں ہے آپ کو آئندہ کا بھی خیال رکھنا ہے مطلب یہ کہ کم سے کم بیس سال آگے کی سوچیں"۔

کسی نے بیچ میں لقمہ دیا "یہ سب تو صحیح ہے فی الحال تو یہ دیکھیے کہ یہ حالات آخر کیوں پیدا ہوئے تاکہ ان کا سدِباب جڑ سے کیا جائے"۔

بحث کا رخ مڑ چکا تھا اور یہ سود مند معلوم ہوتی تھی۔ ایسی بحث میں حصہ لینے کی بجائے سننے میں زیادہ لطف آتا ہے اور انسان کافی حد تک سیکھتا ہے بشرطیکہ سیکھنا چاہے۔ کرنل صاحب اپنی رائے کی وضاحت کر رہے تھے۔ اب آپ یہاں کی تاریخ پر نظر ڈالیں، سو یا دو سو سال میں یہاں ذرہ برابر فرق نہیں آیا ہے ان لوگوں کی زندگی پہاڑوں میں خانہ بدوشوں کی حالت میں گزری ہے، انہیں حفاظت تو چاہیے حکومت ہے ہی نہیں تو حفاظت کیا ہوتی۔ لہٰذا انکی حفاظت تو جزوی قبیلے ہی کی صورت میں ہوتی ہے اور جزوی قبیلے کا وڈیرہ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ جزوی قبیلے کے بعد پورے قبیلے کی حفاظت کا سوال تو یہ سب جزوی قبیلوں کے متحد ہونے پر ہے۔ لامحالہ سردار کا اثر اور اس کی طاقت لامحدود ہوتی ہے، انگریز نے جان بوجھ کر سردار اور وڈیروں کی اہمیت کو اور مضبوط کیا۔ تاکہ ایک قسم کا جسے ایک انگریزی میں "ازم" کہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی سطح پر قائم ہو جائے وہی پرانی پالیسی "رخنہ ڈالو اور لڑاؤ" اس طرح آپس کی اکھاڑ پچھاڑ کو ہوا دینے کا طریقہ ڈھونڈا۔ قبائلی تعصب کو بڑھایا۔ لوگ فرنگی کو بھول گئے اور آپس میں رسہ کشی شروع ہوگئی اور انگریز کو عادل سمجھ بیٹھے۔ آخر جھگڑوں

کا فیصلہ تو فرنگی نے اپنی مرضی کے مطابق ہی دینا ہوتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد وہی سلسلہ قائم بلکہ انگریز نے جو انتظامیہ منظم کی تھی اسے بھی کمزور کر دیا یعنی تھانے ختم کرا دیئے گئے۔ جب ایسے حالات ہوں تو بے ایمانی اور بدتر قسم کی انارکی (ANARCHY) جنم لیتی ہے۔ عام آدمی کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا۔ اب ترقی کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ انتظامیہ کو جدید تقاضوں کے مدنظر بحال کیا جائے تو یہ ہو رہا ہے۔ دیر تو لگے گی بدلتا زمانہ تو اپنا وقت لیتا ہے۔" ایک مہمان وضاحت کرتے ہوئے بولے "آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں درست ہے' ان حالات کو ایک اور زاویئے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے جس کا تھوڑا ذکر آپ نے کیا ہے' وہ یہ کہ آج کل کے زمانے میں ہر ایک شخص اپنے بنیادی حقوق چاہتا ہے اسے معاشی انصاف اور ضروریاتِ زندگی کی بھی ضرورت ہے۔ اسے تعلیم اور انصاف کا بھی حق ہے۔ اگر ملک کا ایک حصہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے تو یہ ضروری ہے کہ اور حصوں کو محروم نہ رکھا جائے۔ ترقی کا انحصار ملک کے انفرادی حصوں پر نہیں ہوتا بلکہ اجتماعی طور پر ہوتا ہے۔ صدیوں کا یہ فرق سرطان (CANCER) کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خاص طور پر ایسے ملک میں جہاں "ازم" کی جان بوجھ کر پرورش کی گئی ہو۔ مختلف زبانیں بولی جاتی ہوں۔ ذرائع آمد و رفت محدود ہوں اور تاریخ میں وہ ملک نوآبادی رہا ہو۔ افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا کے بیشتر ممالک میں یہی مرض نظر آئے گا سرطان کا مریض اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ کوئی معمولی سا مرض بھی بآسانی کاری وار کر سکتا ہے' ایسے حالات میں تفریق۔ زبان کا مسئلہ' قومیت کا مسئلہ یا کوئی بھی مسئلہ بڑھا چڑھا کر کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ جو تمام ملک کے لئے نقصان دہ ثابت ہو۔"

ایک اور مہمان نے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا "جہاں تک عام معافی کا سوال ہے' اس سے حالات سدھارنے میں مدد ملے گی۔ ان لوگوں کو ابھی تک آپ پر مکمل بھروسہ نہیں ہے۔ انہوں نے فوج کو انگریزوں کے وقت دیکھا تھا یا اب دیکھ رہے ہیں۔ ویسے اسکاؤٹ یا ملیشیا تو آتے جاتے رہے ہیں شروع شروع میں وڈیروں کے علاوہ آپ کے پاس اور کون آتا تھا' آپ کو کیا معلوم کہ جب وڈیرہ کسی کا کام کرتا کراتا ہے تو وہ اپنی فیس اس سے دُہرا لیتا ہے۔ یہ آپ کو جب پتہ چلا جب عوام سے رابطہ قائم ہوا۔ اب تو عورتیں بچے ہر قسم کے ہی لوگ اپنے مسائل لے کر آپ کے پاس آتے ہیں کوئی روائی ۔

کے لئے اور کوئی صلاح مشورہ لینے کے لئے"۔

بحث میں کافی لطف آرہا تھا مگر میرے کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور ادھر کا رُخ کرنا پڑا۔ پتہ چلا کہ پرسوں نظربندوں کو رہا کردیا جائے گا۔ ان لوگوں کے کاغذات تیار ہو چکے تھے سوچا کہ ایک دن باقی ہے پیشگی خبر ان کے خاندانوں کو بھی دے دی جائے۔ یہ لوگ مختلف جگہ آکر اکٹھے ہوگئے تھے ان کی دیکھ بھال اور راشن مہیا کرنا ہماری ذمہ داری تھی۔

"دوسروں کے لئے کبھی وہ نہ چاہو جو اپنے لئے نہیں چاہتے"۔ اس چھوٹی سی حدیث میں انسانی نفسیات کا ایک بڑا راز پنہاں ہے اگر اس پر سبھی عمل پیرا ہوں تو دنیا کے دکھ درد مٹ جائیں۔ بات وہی داتا صاحب کی آگئی کہ روزہ نماز کلمہ سب ٹھیک" خدا پر ایمان بھی ہے" اگر ایمان ہو تو عمل میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ جب میں بیٹھے بیٹھے ہمارے ایک دوست کہنے لگے "مجھے ان خاندانوں کو دیکھ کر بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ مگر پھر ان کے مردوں کی زیادتیوں کا بھی خیال آتا ہے"۔

"انسانی احساسات تو سب کے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ بچے پوچھتے ہیں کہ باپ کو کب رہا کرو گے۔ عورتیں چادر پھیلا کر اپنی اولاد اور آدمیوں کی رہائی کا سوال کرتی ہیں۔ انہیں جب تسلی دی جاتی ہے کہ صبر کرو کچھ نہ کچھ تو ہو ہی جائے گا۔ آپ لوگ بھی تو ہمارے اپنے ہیں غلطی انسان سے ہو ہی جاتی ہے اس ذرا سی تسلی میں انہیں کتنا سکون ملتا ہے لوگوں کے چہروں کی رنگت بدل جاتی ہے"۔

"تسلی بھی کتنا بڑا سہارا ہوتا ہے"۔

محبت میں کشش ہوتی ہے اور ظلم سے حقارت جنم لیتی ہے۔ یہ سب ہی کو پتہ ہے مگر بات تو وہی عمل کی ہے ذرا حوصلہ، تھوڑی ہمت اور درگزری کی عادت یہ کیسے پیدا ہو" میں کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

ہمارے دوست بولے آپ نے دیکھا کہ پہلے یہی فوجی گاڑیوں سے دور بھاگتے تھے اب ارد گرد جمع ہوجاتے ہیں اپنی تکالیف بغیر کسی جھجک کے بیان کرتے ہیں اور باتیں ان کی ختم نہیں ہوتیں۔ مگر رہائی کی خبر سُن کر سب تکلیفیں ختم۔ بچے ہیں کہ ناچ رہے ہیں اور بڑوں کے منہ سے ایک ہی لفظ نکلا "شکر"۔

"شکر ہی سارے درد کا مداوا ہے"۔

SUBHAN JALALI BOOKS JALALI

خوشی تو یہی بھی ہے کہ کسی بچے کو یہ بتانا کہ تیرا باپ کل آجائے گا۔ باپ ماں اور بیوی کی رہائی کی خوشخبری دینا خاص طور سے جب انہیں وڈیروں نے یہ یقین دلایا ہو کہ فوج سے کوئی زندہ سلامت نہیں آتا کتنی بڑی بات ہے۔"

"یہ بھی ایک طرح کی خوش قسمتی ہے۔"

میں اکثر فراریوں سے یہ پوچھتا ہوں احسان جتلانے کے لئے نہیں بس صرف معلومات کی خاطر یا یوں کہیے انسانی نفسیات کو سمجھنے کے لئے کہ جن لوگوں پر تم گولیاں چلاتے رہے ہو آخر ان کی بھی اولاد ہوگی ان کے بھی ماں باپ ہوں گے ان کی بھی بیویاں ہوگی۔ کبھی یہ بھی سوچا؟"

جواب ملا "ہماری بدبختی، ہماری جہالت" یہ ہیں ماننے کے لئے تیار نہیں یہ بتاؤ کہ تمہارے اوپر کس نے گولی چلائی۔ تاوقتیکہ تم نے فائر نہ کیا ہو۔ کہنے لگے کہ یہ تو ہم حلفیہ کہنے کو تیار ہیں۔ پھر میں نے سوال کیا کہ کبھی کسی عورت کو تنگ کیا "کبھی نہیں کبھی نہیں" "فوجیوں نے ہمیشہ انہیں ماں اور بہنیں سمجھا" پھر۔

"بس بدبختی ہمیں غلط بتایا گیا تھا۔"

کسی بزرگ کا قول ہے تھوڑی وضاحت۔ ذرا صبر اور پھر درگزر۔ سارے جھگڑوں کا مداوا ہے۔

*

مری ھسپتال کوھلو
KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

کوھلو ویلی کا ایک منظر

KUTUB KHANA · TALHA BOOKS · JALALY
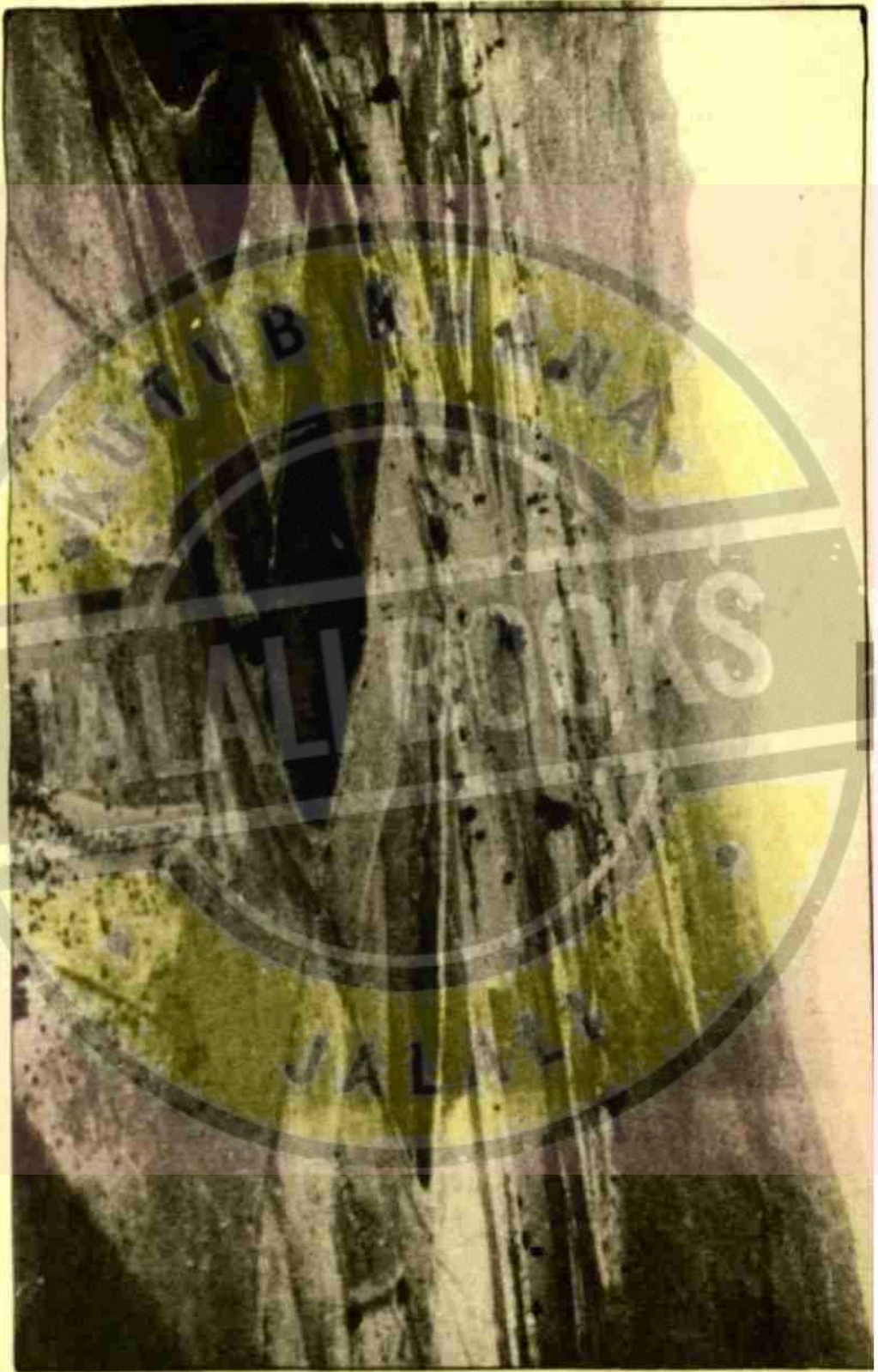
مری ہسپتال کوہلو

کوہلو کے مغرب میں تقریباً تیس میل کے فاصلے پر وادی دنگہ واقع ہے، اس سے تھوڑا سا شمال کی طرف جائیں تو "کنل" کا علاقہ آتا ہے۔ جن دنوں حالات ذرا خراب تھے ایک دفعہ گشت پر وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ صبح کاذب کا وقت تھا۔ دور سے ایک مدھم روشنی نظر آئی۔ آہستہ آہستہ اس کی طرف رُخ کیا قریب پہنچ کر ایک عجیب منظر نظر آیا۔ ایک آدمی زمین پر لیٹا ہے اور چار آدمیوں نے ہاتھ پیر پکڑے ہوئے ہیں ایک معالج لوہا آگ میں گرم کرتا اور اس کی جانگوں میں داغ دیتا گرم لوہا لگنے سے ہلکا سا دھوئیں کا بھبکا اُٹھتا اور گوشت کے جلنے کی بو آتی، غریب مریض کی چیخ نکل جاتی۔ ہمارے ساتھ کچھ مری دوست بھی تھے۔ ہم نے تجسس سے پوچھا کہ آخر اس آدمی کو کس گناہ کی سزا دی جا رہی ہے"۔

ہمارے ساتھی ہنس کر بولے " اس شخص کا علاج کیا جا رہا ہے۔ سزا نہیں دی جا رہی ہے"۔

اچھا علاج کیا جا رہا ہے۔ بیماری بھی بدستور قائم رہے گی اور پھر ان زخموں کا علاج بھی کرانا ہوگا۔

"نہیں صاحب اس علاج سے فائدہ ہوگا یہ یہاں کا مانا ہوا معالج ہے"۔

قریب پہنچ کر معالج صاحب سے استفسار کیا کہ جناب جس بیماری کا آپ علاج کر رہے ہیں ذرا ہمیں بھی تو

بتائیں یہ کیا مرض ہے؟ کہنے لگے " معمولی سی بات ہے ایک دفعہ پہلے بھی میں نے اسے اسی طرح داغا تھا' اس وقت یہ ٹھیک ہو گیا تھا۔ اب پھر بیمار ہے" متانت سے سوچتے ہوئے پھر بولے " دراصل اس کے پیر کی نس میں کچھ فرق آگیا ہے' اس وجہ سے چلنے میں درد ہوتا ہے اور کافی دنوں سے اسے بخار بھی ہے۔"

اتفاق سے ساتھ میں ہمارے ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ ہم نے کہا کہ لگے ہاتھوں آپ بھی دیکھ لیں ڈاکٹر صاحب نے تسلی سے مریض کو اچھی طرح دیکھا اس سے حال دریافت کیا۔ مریض ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ دائیں ٹانگ سوکھتی جا رہی تھی اور اسے ہلانے سے درد محسوس ہوتا تھا۔ مریض کو چار پانچ ماہ سے متواتر بخار بھی بھی آ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے " میرا خیال ہے کہ اسے کولہوں کے جوڑ کی ٹی بی (HIP JOINT T.B) ہے اسے لے چلو کیمپ میں رکھ کر علاج کریں گے یا اورالائی ہسپتال میں داخل کرلیں گے۔"

"ڈاکٹر صاحب کچھ مسکرائے ان کی ہنسی میں ہلکا سا طنز بھی تھا" اس کے علاج میں مہینے لگیں گے۔ ہمارے پاس نہ دوائیاں ہیں اور نہ ہی باقی سہولتیں۔"

دل نہ مانا کہ مریض کو اس طرح چھوڑ دیا جائے" ڈاکٹر ذرا ہٹ کر ڈ ایسی بھی کیا بات ہے۔" چلیے لیے چلتے ہیں" مگر مریض اور اس کے رشتہ دار کسی طرح ساتھ چلنے پر رضامند نہ تھے۔ ہمارے ایک مری دوست جو ساتھ تھے انہوں نے ہمارا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لیجا کر کان میں کہنے لگے " یہ کبھی نہیں جائے گا ڈیرے کا حکم ہے" خبردار جو کیمپ میں گئے یا حکومت سے کوئی واسطہ رکھا" ہم نے بھی بہت کوشش کی مگر جواب نفی میں اس وقت زبردستی تو نہیں کرسکتے تھے مگر آج کے حالات ہوتے تو زبردستی بھی کرتے۔ کیونکہ ہماری نیت صاف تھی۔

اسی طرح زیارت مست توکل پر جانے کا اتفاق ہوا یہ زیارت بھی کوہلو سے اٹھارہ میل شمال مغرب میں ہے یہ زیارت بہت مانے ہوئے مری شاعر بزرگ کی ہے۔ مقبرہ بڑا شاندار ہے پاس میں پانی اور زمینیں ہیں جو مزار کی ملکیت ہیں۔ صبح اور شام لنگر چلتا ہے لوگ دور دراز سے آتے ہیں۔ مزار کے قریب ایک بڑا نقارہ رکھا ہے' جب کھانا تیار ہوجاتا ہے اس پر چوب لگائی جاتی ہے تو آس پاس کے مسافر بھی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

ایک طرف کونے میں ایک عورت بیٹھی تھی ساتھ میں کچھ رشتہ دار" اس پر جن آتے ہیں انہیں اتروانے آئے ہیں"
تھوڑی دیر میں دو آدمی نمودار ہوئے ایک نیم مولوی قسم کی چیز تھے اور دوسرے شاید ان کے شاگرد' یہاں نم

مولوی لوگوں کو "ملّا" کہہ کر پکارتے ہیں۔ اپنے حجرے سے نکلتے ہی دونوں نے نعرے لگائے۔ نعرہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا تھا بشاگرد نے بال بکھیر لئے۔ اور جھومنا شروع کردیا۔ مُلّا کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا تھا۔ یہ دونوں میاں جان مریضہ کے جتنے قریب ہوتے جاتے تھے اتنا ہی شاگرد کا جھومنا بڑھتا جاتا۔ اور مُلّا کا وِرد تیز اور زور وشور سے جاری رہتا۔ یقیناً مُلّا صاحب کلام مجید کی آیتیں نہیں پڑھ رہے تھے۔ جب شاگرد کا جھومنا بظاہر بے قابو ہوگیا تو ملانے بآواز بلند اعلان کیا کہ جن عورت کو چھوڑ کر شاگرد پر سوار ہوگیا ہے! سوال جواب شروع ہوگئے۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ جن عورت کو چھوڑنے کے لیے تیار ہے مگر اس کے لئے کچھ قربانی دینی ہوگی۔ یہاں پر قربانی تو دُنبوں ہی کی ہوتی ہے اس قسم کی قربانی کے یہ غریب عادی ہوتے ہیں کیونکہ وڈیرے اور سردار کے کارندے آئے دن مال وصول کرتے رہتے ہیں مگر اب نوبت کمی ہوگئی ہے۔ یہ تماشا آدھ گھنٹے میں ختم ہوگیا۔ چار دُنبے نذر کرنے پڑے جناب آج کل ایک دُنبے کی قیمت اڑھائی سو روپے ہے' اچھے سے اچھا ڈاکٹر بھی اتنی فیس نہیں لیتا۔ ویسے مُلّا صاحب اس عورت کا علاج پہلے بھی کر چکے تھے۔ اس وقت انہوں نے صرف ایک دنبہ لیا تھا۔ آجکل گرانی بھی تو ہر جگہ ہے۔

یہاں پر ایک دوائی بہت عام ہے آپ اسے ٹوٹکہ کہہ سکتے ہیں مگر ہم دوائی ہی کہیں گے کیونکہ ہمارے مری بھائی اسے دوائی کہتے ہیں۔ ہم جب چھوٹے سے ہوتے تھے تو اس زمانے میں ایک دوائی بہت عام تھی جو ہر مرض کی دوا سمجھی جاتی تھی جسے "اَمرت دھارا" کہتے ہیں بس یہ علاج بھی یہاں کا امرت دھارا ہے۔ پیٹ میں درد ہو بخار ہو' چوٹ لگ گئی ہو' طبیعت مضمحل ہو' غرض کہ کوئی بھی بیماری ہو مریض کو دنبے کی کھال پہنا دی جاتی ہے بالکل ٹیٹرامائی سین (TETRRAMYCIN) کی طرح اس کا بھی بڑا (BROAD SPECTRUM) ہے یعنی دنبے کو ذبح کیا اور کھال سالم اتار لی اگلی ٹانگوں کی جگہ مریض کے ہاتھ اندر کردیئے اور باقی کھال جسم پر اتار دی بس یہ سمجھ لیں کہ کھال کا جیکٹ پہنا دیا جاتا ہے یہ کھال عموماً دو دن تک ایسے ہی پہنے رہنا ضروری ہے بعض معالج یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ جب تک کھال سڑ نہ جائے اسے اتارنا قبل از وقت ہے۔ اس سے فائدہ ہوتا ہے؟ ہوتا تو ہوگا۔ جب ہی یہاں پر "یہ دوائی" کی جاتی ہے۔

مری علاقے میں ادویات کی اقسام بہت ہیں مثلاً بھیڑ' بکری یا اونٹ کے دودھ کو سڑا کر یا خشک کرکے مختلف قسم کے لیپ بنائے جاتے ہیں۔ بعض جھاڑیوں کو کوٹ کر چوٹ پر باندھا جاتا ہے یا اُبال کر ان کا عرق

بھی پلایا جاتا ہے یہاں پر ایک قسم کا پھوڑا ہوتا ہے جسے ڈاکٹری زبان میں CUTANEOUS LEISH MANIASIS کہتے ہیں۔ ہم نے اپنے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ جناب یہ نام سمجھ میں نہیں آیا۔ ذرا عام فہم لفظ استعمال کریں کہنے لگے ALEPOO BUTTON نہیں سمجھے ORIENTAL SORE اب بھی پلے نہیں پڑا TRORICAL SORE۔ بھائی سیدھی بات کہو پھوڑا ہے ۔ ہے تو پھوڑا مگر قسم بھی تو کوئی چیز ہے اس کے مریض ہم بھی رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک ریت کی مکھی ہوتی ہے اور وہ بھی مچھر سے چھوٹی اس کے کاٹنے سے یہ پھوڑا پیدا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے ایک کی جگہ کئی بھی ہو سکتے ہیں اس پر کسی دوائی کا اثر نہیں ہوتا۔ یہ تو اپنا وقت لیتا ہے۔ یعنی صرف چھ ماہ بعد میں اس کے انجکشن اور مرہم بھی آتے۔ یہ زندگی میں ایک دفعہ ضرور ہوتا ہے جب اس بیماری کے فوجی مریض زیادہ بڑھے تو شور اوپر تک پہنچ گیا۔ ہدایات آئیں کہ ریت کی مکھی یہ جراثیم کتے، بلی، گیدڑ اور چوہوں سے حاصل کرتی ہے ۔ لہٰذا انہیں مارا جائے اور اس کام میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے ۔ ہم نے کہا کہ جناب بیماری ہمیں منظور رہے مگر ان جانوروں کے پیچھے بھاگنا ہمارے بس کا کام نہیں ہے۔ ہاں تو ہم نے اپنے مری دوستوں سے رجوع کیا۔ انہوں نے معالجوں سے پوچھا۔ کہنے لگے یہ تو ہمارے یہاں کا میوہ ہے ۔ یہ تحفہ تو ہر آنے والے کو نصیب ہوتا ہے یعنی جیسے بادام اور پستہ وغیرہ اچھا میوہ ہے اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو باندھیے اونٹ کی دُم کی چربی ضرور افاقہ ہوگا۔ اس چربی کو حاصل کرنے کے لئے چھ ہزار کا اونٹ خریدا جائے ۔ ہمت خریدیے دوائی تو بتا دی۔

تعویذ گنڈے تو عام ہیں اگرچہ ڈاکٹروں اور ادویات کا فقدان ہے بہرحال علاج تو کروانا ہے ڈاکٹر اور ادویات آج کی ایجاد تو ہیں نہیں یہ چیزیں تو ازل سے ہی زندگی کے ساتھ ہیں ۔ ہاں فرق صرف تعلیم اور ترقی کا ہے تو جناب جیسا ماحول ویسا ہی معالج اور اسی رنگ کی ادویات۔

ایک دفعہ ہم لورالائی سے آرہے تھے راستے میں ایک آدمی کو چادر اوڑھے ہوئے لیٹے دیکھا اس زمانے میں سڑک کے کنارے کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اور وہ بھی "لوھار کی ٹک" کے قریب جہاں اکثر حادثات رونما ہو چکے تھے گاڑیوں کو روکا اور دریافت کیا۔ پتہ چلا کہ ہیں تو ہمارے مری دوست مگر حالت ناگفتہ بہ ہے ۔ بولنے کی کوشش کرتے مگر بول نہ پاتے۔ بخار اور نقاہت سے بُرا حال تھا ساتھ لے آئے۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب بہت ہی عمدہ آدمی

ہیں۔ کام سے کبھی گریز نہیں کرتے مگر شکایت ضرور کرتے ہیں کہ نہ ادویات ہیں اور نہ سہولتیں' پھر آپ ٹی بی کا کیس لے آئے اسے تو آنتوں کی ٹی۔ بی ہے" ڈاکٹر گھبراتے کیوں ہو سب بندوبست ہو جائے گا۔ بھائی کو اس طرح ایڑیاں رگڑتے دیکھا نہیں دیکھا جاتا۔" "وہ تو ٹھیک ہے اب آپ میری بھی تو کچھ مدد کیجئے بغیر ادویات کے میں بے بس ہوں کاش کہ مجھ میں روحانی طاقت ہوتی اور بغیر دوائیوں کے علاج کر سکتا۔ اس بیمار کو تو میں اوروں کے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ اِن کے لئے علیحدہ جگہ ہونا ضروری ہے"۔

"ڈاکٹر سب ہو جائے گا۔ نیک کام میں کبھی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ ہمت برقرار رکھو۔" وہ تو ہے چلیے اب تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ دوائیاں اور خیمے ضروری ہیں۔ رات میس میں افسروں سے ذکر کیا راتوں رات دوائیاں آئیں اور صبح تک خیمے نصب ہو گئے۔

تھوڑے دنوں بعد فوجی ہسپتال میں ڈاکٹروں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ سرجن انستھیسٹ، میڈیکل اسپیشلسٹ بھی پہنچ گئے۔ حالات بھی کچھ بہتر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اب جسے بھی جہاں کوئی مریض ملتا ساتھ لے آتا۔ دوائیاں اس سے پہلے تو ان لوگوں نے استعمال کی نہیں تھی۔ دو ایک دن میں حالت بہتر ہوتی تو جانے کے لئے ضد شروع کر دیتے لاکھ سمجھایا جاتا کہ مرض ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ مگر مریض کا دل ہسپتال میں نہ لگتا۔ چاروناچار جانے کی اجازت دی جاتی۔ ساتھ سول ہسپتال تھا۔ مگر وہاں بھی یہی عالم تھا۔ خیر ادھر تو داخلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر کچھ لوگ دوائیاں لینے ضرور آتے وہ بھی کوہلو کے گردونواح سے۔

اپنے فوجی دستے جہاں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی علاج معالجے شروع کئے۔ مگر یہ دقت تو رہی عورتیں اور بچے تو بالکل ہی ہسپتال کے قریب نہیں بھٹکے تھے۔ اس اثنا میں ہمارے ڈاکٹر صاحبان نے بیماریوں کے متعلق اعداد و شمار اکٹھے کرنے شروع کیے۔ بیچارے گشتی دستوں کے ساتھ جاتے لوگوں سے پوچھ گچھ کرتے اور مریضوں کو دیکھتے۔ یہ کافی دِقت طلب کام تھا جو اعداد و شمار اس عرصے میں مہیا ہو سکے آپ بھی پڑھ لیں۔

(ا) بیس سے تیس فیصدی بچے پیدائش کے پندرہ دن کے اندر مر جاتے ہیں۔

(ب) مختلف اقسام کی ٹی۔ بی تیس فیصدی بیماریوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ مرض عورتوں اور بچوں میں بہت عام ہے۔

(ج) خون کی کمی اور غیر متوازی غذا کی بدولت اینیمیا اور ڈیفارمیشن (DEFORMATION) بہت

KUTUB KHANA JALALI BOOKS

عام ہے۔ مریضوں میں ان کی تعداد تقریباً بیس فیصدی ہوگی۔

(د) ملیریا کے بیمار ہر موسم میں یہاں ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد بیماریوں میں تین فیصدی ہے۔

(۳) ذیابیطیس کے مریض بھی تقریباً بیماروں میں ایک فیصدی ہوں گے۔

(م) سردیوں میں زیادہ تر اموات نمونیا اور برانکائٹس (BRONCHITIS) سے ہوتی ہیں، زیادہ تر بچے اور بوڑھے شکار ہوتے ہیں۔

(ن) آنکھوں کے امراض میں پانچ فیصدی لوگ مبتلا ہیں۔ رات کا اندھا پن عام ہے۔

(د) نسوانی امراض کے بارے میں اعداد و شمار اکٹھا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ پورے علاقے میں نہ تو لیڈی ڈاکٹر ہے اور نہ ہی لیڈی ہیلتھ وزیٹر۔ اتنے میڈیکل کالج کھل گئے ہیں مگر یہاں کون آئے اپنے بھی پرائے بن گئے ہیں۔ کچھ نہیں تو چھٹیوں میں تو یہاں آ سکتے ہیں۔ کیا بات کی ہے آپ نے بھی چھٹیاں آرام کرنے کے لیے ہوتی ہیں یا کام کرنے کے لیے۔ کام دنیا میں ویسے بھی اور کون سے کم ہیں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ باوجود بیماریوں کے اور ڈاکٹر صاحبان موجود ہوتے کے یہاں کے لوگ ہسپتال کیوں نہیں آتے لاکھ وڈیرہ منع کرے۔ جان سب کو عزیز ہوتی ہے اور پھر اب تو حالات بھی بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ امام غزالیؒ کا قول یاد آیا کہ پہلے "روح" کو سمجھو پھر صورت اپنے آپ نکل آئے گی تو جناب روح کو ٹٹولنا شروع کیا۔ لوگوں سے بات۔ ڈاکٹر صاحبان سے مشورہ کیا۔ پھر ایک مشنری ڈاکٹر جنہوں نے افریقہ میں بڑا کام کیا تھا اور جن کی کتاب عرصہ ہوا پڑھی تھی۔ خیال آیا۔ پھر یہ کہ اس قسم کے مسئلہ کو یکطرفہ نظر سے تو حل نہیں کیا جا سکتا۔ کلی نظر سے دیکھنا ضروری ہے۔ یعنی نفسیاتی، معاشی، روایتی اور سماجی وغیرہ وغیرہ۔

جہاں اس قسم کا معاشرہ ہو یعنی گھومنے پھرنے والے لوگ جو کہ اپنے خاندانوں کے ساتھ پھرتے رہتے ہیں آپ اس کے ایک فرد کو لا کر اسپتال میں ڈال دیں جہاں اس سے بات کرنے والا کوئی نہیں، ایک اجنبی جگہ، صفائی کی پابندی، وقت پر کھانا۔ ڈاکٹر صاحب چکر لگانے آتے ہیں۔ عجیب عجیب آلوں سے چیک کرتے ہیں دوائی پلانے، سوئی لگانے کے لئے کمپاؤنڈر سر پہ کھڑا۔ ادھر مت بیٹھو، ادھر مت تھوکو۔ رفع حاجت کے طریقے بھی جدا۔ ملنے والے آتے ہیں تو وقت کی پر۔ نہ بابا نا۔ یہ تو قید ہے۔ دوائی بیشک اپنا اثر دکھائے گی۔ مگر ذہنی کوفت

بیماری سے اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ دو دن کے بعد آدمی ویسے ہی بھاگنے کی سوچتا ہے' آپ کا ہسپتال
ویسے ہی کیمپ کے اندر ہے اب اگر ایک بیمار آئے گا تو اس کے رشتہ دار بھی ساتھ ہوں گے۔ کراچی یا لاہور
تو نہیں ہے کہ بس پر بیٹھ کر بیس میل سے بھی ملنے والے وقت پر آئیں اور چلے جائیں۔ یہاں تو جو آئے گا وہ
ٹھہرے گا۔ بھئی۔ پیدل فاصلہ طے کرنا روز روز کی بات نہیں۔ اب عورتوں اور بچوں کو لے لیں۔ عورت تو
جناب اکیلی رہ نہیں سکتی۔ اس کے ساتھ کوئی اس کا رشتہ دار بھی ہوگا یعنی کوئی مرد' پھر اس کے اپنے چھوٹے
بچے بھی ہوں گے۔ مرد تو گھر پر بچوں کو سنبھالنے سے رہا۔ وہ تو شادی ہی اس لئے کرتا ہے کہ سارا کام عورت
کرے۔ رہی بچوں کی بات' تو ان کے ساتھ یہ مجبوریاں لاحق ہیں۔ ہسپتال چلانا ہے اور خدمتِ خلق کرنی
ہے تو ان چیزوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ ڈاکٹر اور دوائیاں بیکار۔ نہیں مانتے تو دونوں اپنی
جگہ خوش۔ ہمارا کام تو ہسپتال کھولنا تھا تو وہ کھول دیا' بورڈ بھی لگا دیا۔ سارے انتظام بھی کر دیئے' اب
لوگ ہی نہیں آتے تو نہ آئیں آپ اپنی بات کرتے ہیں۔ جناب حکومت نے بہت سی جگہ پکی بلڈنگیں بنائی ہیں' عملہ بھی ہے
اور کیا کچھ نہیں پھر بھی متعلقہ افراد آرام سے بغیر کام کے بیٹھے رہیں۔ چلتا ہے' سب چلتا ہے جب لوگ تھوڑے
پڑھ لکھ جائیں گے تو اپنے آپ آئیں گے۔ پھر تو عالم یہ ہوگا کہ اسمبلیوں میں شور ہوگا کہ کام ٹھیک سے نہیں چل
رہا' اتنے دنوں کون انتظار کرے۔ کام کرنا ہے تو اب۔ اگر آپ مخلص ہیں تو دیر کیوں۔ زندگی اور موت کا کیا بھروسہ
آج ہیں کل نہیں یا پھر آج یہاں کل وہاں۔

ایک گھر کی تلاش شروع کی۔ قبضہ کرتے وقت تو کوئی دشواری نہ ہوئی' بعد کی بات جانے دیجئے' پکا
وڈیرے کا گھر۔ بیچ میں تین کمرے خاصے بڑے اور چاروں طرف صحن' سامنے بڑا سا باغ جو کہ لوگ عموماً رفع
حاجت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مریض کے ساتھ بے شک رشتہ دار ٹھہریں کوئی حرج نہیں۔ ملاقات جب مرضی
آئے کرو سارا دن دروازے کھلے رہتے ہیں۔ صحن میں چائے بنانا چاہتے ہیں بنائیں۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے سبجی
بنانی ہے بناؤ۔ راشن ہم بھی دیں گے۔ بن گیا اپنا ماحول کوئی قید نہیں سارے ہی دن ملنے والے آتے ہیں۔ اچھا
ہے نا ہر وقت چائے بنتی رہتی ہے۔ کیا حرج ہے صفائی تو رکھنی ہوئی تو رکھیں۔ دن میں تین بار صفائی کرائیں
مگر آدمیوں پر کوڑا کرکٹ ہٹانے کی پابندی فی الحال نہ رکھیں۔ جب لوگ عادی ہو جائیں تو بعد میں صحیح پابندیاں

لگائی ہیں۔ تو پھر نام "مری ہسپتال" کیوں رکھا۔ اگر یہی نام رکھنا ہے تو ماحول بھی وہی رہنے دیں۔ آدمی بیاری تو رشتہ داروں کے ساتھ بیٹھ کر اپنے انداز میں رہنے سہنے سے ختم ہو جاتی ہے۔ پہلے لوگ ٹی۔ بی کے ہسپتال کھولتے تھے اور اب بھی ہیں۔ یہیں ٹی بی سینی ٹوریم کہا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں تو یہ سلسلہ ختم ہی ہو گیا کیوں لوگوں کو نفسیاتی طور پر بیمار کرتے ہو کر و علاج عام حالات ہیں۔

لوگوں کو نہانے کی عادت بھی ڈالیں۔ نہیں ابھی نہیں۔ ابھی غسلخانے بنایئے، پانی کا بندوبست کیجئے۔ ایک آدھ دفعہ محبت سے التجا کریں اگر ہفتے میں ایک دفعہ بھی کوئی نہا لے تو اچھا ہے مگر کوشش جاری رکھیے۔ کپڑے بنا دیں کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ تو سنبھال کر رکھ لیتے ہیں کہ پھر کام آئیں گے کوئی حرج نہیں ایک ادھ جوڑا بنا دیا آخر حکومت کپڑے بانٹنے ہی کے لئے دے رہی ہے۔ ہاں ذرا کپڑا دھونے کی عادت بھی ڈالیں۔ صابن اور تیل کی فرمائش ہے مہیا کر د۔ یہ عادتیں تو ضروری ہیں۔ بیماری اپنے آپ کم ہونی شروع ہو جائے گی۔

جب مسئلے کی روح درست ہوئی تو جاب لگ آنے شروع ہوئے پہلے مایوس کن مریض جو یہاں کے تمام علاج آزما چکے تھے۔ یہ دائمی مریض تھے۔ اب مریضوں کو لانے کی ضرورت نہ تھی لوگ خود لاتے۔ رسیوں اور بلیوں سے اسٹریچر بنایا اور اس پر مریض باندھا ہوا۔

مریض قریب المرگ ہسپتال میں پہنچا ساتھ میں ماں اور کچھ لوگ "کہاں سے لائے ہو" "بالا ڈاکہ سے۔ یعنی قریب پچیس میل دور سے "ماں پھر ماں ہوتی ہے" ان سب کی خوشامد کی ہے کہ میرے بیٹے کو لے چلو تب یہاں پہنچے ہیں ڈاکٹر میرا بیٹا بچ جائے گا۔ میرے کوئی اور اولاد نہیں یہی میری زندگی کا سہارا ہے۔

"مائی کتنے دن سے بیمار ہے۔"

"یہی ایک مہینے سے"

"ساری دوائیاں کریں مگر کوئی فائدہ نہیں۔ کئی ڈبوں کی کھالیں پہنا چکی ہوں۔ کوئی بس نہیں چلتا" ڈاکٹر صاحبان نے بڑی تسلی سے دیکھا۔ ایسے مریضوں کے لئے ہمیشہ جو پہلے کارروائی کی جاتی ہے یعنی گلوکوز کی بوتل لگا دی گئی۔ "ہاں ڈاکٹر صاحب کیا تشخیص کیا" ڈاکٹر صاحب نے لمبا چوڑا سا کوئی ٹکنیکی نام بیان کر دیا "بھائی اس معاملے میں ہم بالکل جاہل ہیں آپ سیدھی سادی زبان میں بتائیں۔"

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

"دراصل اس کی پیٹ کی جھلی میں ورم آگیا ہے۔ دیکھیے کوشش کرتے ہیں، شفا دینے والا تو اللہ ہے" آخر کیوں آگیا ہے" "کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اپنڈکس اندر پھٹ گیا ہو اور پھر خود بخود بند ہو گیا ہو" ڈاکٹر صاحبان نے سارا زور لگا دیا خدا کا کرنا کہ مریض ایک ہفتے میں ٹھیک ہو گیا۔

زیادہ تر ٹی۔بی کے مریض آئے اپنی عمر میں اتنی اقسام کی ٹی بی نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی، ہمارا تو خیال تھا کہ صرف پھیپھڑوں کی ٹی بی ہوتی ہے۔ یار ہو نا جاہل۔ نہیں پتہ تو خاموش رہو، ڈاکٹر لوگ تو پڑھے لکھے ہوتے ہیں وہ کیا سمجھیں گے، اب ہیں جاہل تو کیا کریں اس عمر میں تو پوچھ کر ہی معلومات میں اضافہ کیا جا سکتا ہے، ایسا کرو جیسے بڑے لوگ کرتے ہیں، ظاہر کرو کہ ہمیں سب کچھ معلوم ہے۔ اور ڈاکٹروں پر رعب جماؤ۔ دنیا کرتی ہے۔ رہنے دیں اپنی نصیحت سارے ڈاکٹر اتنے اچھے اور قابل ہیں کہ خدا کرے کہ سب ان جیسے ہو جائیں۔

مریض کمزور ہو جاتا ہے، پیٹ میں درد رہتا ہے، بخار ہے، ٹسٹ مکمل کئے معلوم ہوا کہ آنتوں کی ٹی بی ہے کمزوری، بخار، غدود سوجے ہوئے۔ غدودوں کی ٹی بی، جوڑوں کی ٹی بی، ہڈیوں کی ٹی بی، پتہ نہیں کتنے اقسام کی اور ٹی بی کے مریض یہاں زیر علاج رہے۔ اور اللہ کا کرم اور احسان ہے کہ سب صحتیاب ہوئے۔

خبریں پھیلنی شروع ہوئیں تو لوگ قریب اور دور سے چلے آرہے ہیں۔ اب عورتیں اور بچے بھی آنے لگے۔ عورتیں تو اکثر ٹی بی کی مریض نکلتیں۔ روزانہ اوسطاً سو کے قریب مریض دیکھے جاتے۔ پہلے ہسپتال میں کوئی داخلے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا اب یہ مشکل کہ جگہ نہیں ایک میں تین سے زیادہ مریضوں کا رکھنا ناممکن۔ بڑھایا ہسپتال کو۔

اگر ہم اپنے سرجن اور اینستھیسٹ کا ذکر نہ کریں تو ذرا ان کے ساتھ بے انصافی ہوگی دونوں کی کیا بات ہے۔ ہمیشہ تیار چاہے دن ہو یا رات۔ بارش ہو یا طوفان۔ آپریشن تھیٹر خیمے ہی میں بنایا ہوا تھا۔ شروع میں تو ہچکچائے "خیمے میں آپریشن درست نہیں، جب تک پکا تھیٹر نہ ہو" اب یہاں پر پکا تھیٹر کہاں سے لائیں یہی ہے۔ علاج کرو یا ہار مان لو علاج اور ہار ماننے کی بات نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ ایسا کیوں مول لیا جائے۔ اب تک تھیٹر پوری طرح ڈس انفکٹ (DISINFECT) نہ ہو تو آپریشن کرنا درست نہیں۔ جناب وہ تو ٹھیک ہے مگر ایمرجنسی کا کیا کریں۔ چلیے ایمرجنسی میں تو ہو گیا۔ تھیٹر میں کیا مجال کوئی داخل تو ہو جائے اپنے جوتوں سمیت یا ناک اور سر پر سفید ماسک پہنے بغیر۔ اللہ نے ان لوگوں کے ہاتھ میں بلا کی شفا دی ہے۔

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

ایک مریضہ داخل ہوئی کمر کے نیچے سے تمام گوشت اڑا ہوا۔ اب کیا کیا جائے۔ وارثوں کو کوئی اعتراض نہیں کہ ڈاکٹر اگر مرد ہیں۔ "اس کی تو پلاسٹک سرجری کرنی ہوگی۔ اور خامی دیر لگے گی" کوئی بات نہیں عزت کا سوال ہے کہ مریض ہسپتال سے بغیر علاج کے واپس نہیں جانا چاہیے۔ کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ بھئی لو اللہ کا نام اور شروع کرو سرجن اور انستھیسٹ مسکرائے اور بسم اللہ کرکے آپریشن تھیٹر کا رخ کیا۔ تھوڑے دنوں بعد پٹی کھولی۔ آپریشن پوری طرح تو کامیاب نہ تھا مگر کافی حصے پر جلد چڑھ گئی تھی۔

"بات یہ ہے کہ مریض کو بالکل ہلنا جلنا نہیں چاہیے۔" اب کوئی زنانہ نرس بھی نہیں غریب مریضہ کی کون مدد کرے پیشاب کرنا ہے رفع حاجت کرنی ہے" غریب عورت ہے کوئی وارث بھی یہ کام کرنے کو تیار نہیں۔ کہیں سے دائی لے آؤ۔ یہ کوئٹہ یا پشاور تو نہیں ہے۔ یہاں آنے کو کون تیار ہوگا۔ کریں گے کوئی بندوبست۔ کوئی بھی عورت اس کام پر تیار نہ ہوئی۔ عورت اور نوکری توبہ توبہ۔ پھر کچھ کیا۔ ایک اور آپریشن کے بعد مریضہ دعائیں دیتی اپنے گھر کو واپس ہوگئی۔

ہمارے سرجن نے ایک آپریشن تو کمال کا کیا۔ یعنی ان حالات میں اتنے بڑے آپریشن پر کون ہاتھ ڈالتا ہے۔ ایک عورت داخل ہوئی۔ چوٹ سے اس کے جگر پر زخم ہو گیا تھا سرجن ذرا سوچ میں پڑ گئے۔ آپریشن کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اگر نہیں کرتے تو جان ویسے بھی جاتی ہے۔ اگر کرتے ہیں تو شاید ناکامیاب ہو۔ ویسے بھی اس قسم کے آپریشن اسی فیصدی ناکام ہوتے ہیں" ڈاکٹر شفا دینے والا کوئی اور ہے تم نہیں۔ ٹھیک ہے بات دل کو لگی اور بسم اللہ کی، پندرہ دن کے اندر اندر مریضہ نے اپنے وارثوں کے ساتھ گھر کا رخ کیا۔

JALALI BOOKS KUTUB KHANA

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI
"مس"

دو بلوچ لڑکیاں سیوی اور جہاں بی

"میں"

مری علاقے کی جھلک ہم نے مختلف زاویوں سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ جغرافیائی، تاریخی، معاشرتی، عمرانی اور انتظامی امور کو زیر بحث لایا گیا۔ ہم اپنے محدود علم کا پہلے ہی اعتراف کر چکے ہیں۔ مگر مشاہدے میں تو اس کا سوال کم ہی پیدا ہوتا ہے۔ چلئے کچھ تو کوششیں ہوئیں۔ اب ذرا اپنا تجزیہ ہو جائے بغیر اس کے بیان تشنہ رہ جاتا ہے۔

میں ہوائی جہاز کے سفر سے ہمیشہ گھبراتا ہوں۔ گھبرانے کی ایسی کیا بات ہے، مرنا تو ایک دن ہے ہی۔ مجھے سب کچھ پتہ ہے مگر کیا کروں بس گھبراتا ہوں۔ لطف بھی بڑا آتا ہے اور جب بھی موقع ملے اس کی سواری چھوڑی بھی نہیں جاتی۔ بڑی متضاد بات ہے، اب کیا کیجئے یہ ہی حقیقت بھی ہے۔

جب سے بلوچستان آیا ہوں۔ ہوائی جہاز سے اتنے سفر کیے ہیں کہ حساب رکھنا مشکل ہو گیا ہے، یہاں اس کے بغیر گزارہ بھی نہیں۔ کوہلو سے کوئٹہ جانا ہو، جیپ پر اگر آپ جائیں تو کم از کم دو دن لگتے ہیں۔ بیٹھے جہاز پر اور دو گھنٹے میں کوئٹہ پہنچ گئے۔ کوہلو سے سبی جانا ہو تو پہلے کوئٹہ جایئے پھر وہاں سے سبی۔ مگر جہاز کی کیا بات ہے ناک کی سیدھ پکڑی اور ایک گھنٹے میں سبی۔

جہاز پر بیٹھ بیٹھ کر راستے خوب یاد ہو گئے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر ہوا میں آپ راستہ بھول جائیں

تو بڑی مشکل ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے پائلٹ ساتھ ہوتا ہے مگر اپنی جان بھی عزیز ہے جہاں اپنا مفاد شامل ہو تو بات کچھ اور ہوتی ہے مفاد بھی ایسا ویسا نہیں۔ وہ بھی زندگی کا معاملہ' ایک دفعہ جہاز پر بیٹھا۔ لورالائی جانا تھا۔ علاقہ میں نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور پائلٹ صاحب بھی نئے' اب راستہ بھول گئے۔ جب ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا اور راستہ نہ ملا۔ بھئی نقشہ ساتھ نہیں تھا؟ نقشہ بھی ساتھ تھا۔ جہاز کا قطب نما بھی کام کر رہا تھا' مگر ایسا بھی ہو جاتا ہے' کیسے ہو جاتا ہے؟ اب ہو گیا ہے کیا کریں۔ نیچے ایک سڑک نظر آئی۔ جہاز کا تیل بھی کم ہو رہا تھا۔ میں نے پائلٹ سے کہا "میں تو انفنٹری والا ہوں اب پیدل چلنے والوں کا طریقہ استعمال کریں" کہنے لگے "سمجھا نہیں" بھائی اللہ کا نام لو اور نیچے اتر جاؤ" سڑک پتلی ضرور ہے۔ پوچھ لیتے ہیں کسی راہ گیر سے کہ لورالائی کس سمت میں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ پتہ چلا کہ ہم لورالائی سے صرف پچاس میل مختلف سمیت میں پہنچ چکے ہیں۔

گرمیوں میں یہاں جہاز کا سفر کچھ حد تک خطرناک ہوتا ہے۔ خاص طور سے جب پائلٹ نیا ہو۔ دھند ایسی کہ الاماں الحفیظ' کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ جناب تو جہاز چلاتے کیوں ہیں؟ کوئی بات تو ہوگی جو چلاتے ہیں۔ بیکار چلانے میں کیا مزہ آتا ہے۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ پیش آیا۔ کوئٹہ جانا ضروری تھا۔ جہاز پر بیٹھے۔ اس جہاز میں صرف دو آدمی سما سکتے تھے میں اور پائلٹ۔ وہ بھی تجربہ کار مجھے بھی یہاں کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ گرد اتنی تھی کہ سو گز بھی دیکھنا مشکل۔ گرمیوں کی گرد بھی خوب ہوتی ہے۔ آسمان تک پھیل جاتی ہے اور بیٹھنے کا نام نہیں لیتی۔ ہوا چلے تو غبار ہٹے۔ اگر ہوا چل بھی گئی تو غبار تھوڑی دیر کو ہٹ جاتا ہے مگر تھوڑی دیر میں پھر سر پر سوار۔ جہاز ژھوند پہنچا اس کے بعد سے چاکر نگی کے ساتھ ساتھ جانا تھا۔ چاکر نگی کے آگے ترک کھنڈ آتا ہے پھر تھوڑی دور آگے چل کر تبی کا میدان آتا ہے۔ چاکر نگی وہ جگہ ہے جہاں میر چاکر نے ترکوں کا مقابلہ کیا تھا اور ترک کھنڈ پر ترک قابض ہو گئے تھے میر چاکر کی جان ان کی بیوی بی بی بانی کی تجویز سے بچی تھی۔ اب چاکر نگی نظر آئے تو آدمی دیکھے۔ نیچے دیکھتے ہیں تو کچھ نظر نہیں آتا۔ اوپر نگاہ کی تو خاکی رنگ کا آسمان۔ دائیں بائیں کی پہاڑیاں غائب۔ سامنے نظر دوڑائی تو گرد۔ تھوڑی دور چل کر ایک دم سے ایک بڑا پہاڑ نظر آیا فاصلہ بھی کچھ ایسا زیادہ نہیں۔ موٹر کار ہو تو آدمی روک کر کھڑا ہو جائے یا دائیں بائیں کاٹ کر پہاڑ سے نکلے۔ کیا بات ہے یعنی پہاڑ نہ ہو گیا جانور ہے کہ آپ اس سے نہیں بچ سکتے۔ جہاز دائیں کاٹیں یا بائیں۔ ممکن ہے کسی اور پہاڑ سے ٹکرا جائے۔

جناب اللہ کا نام لیا اور کہا، دائیں کیا کرو گے راستہ یاد ہے" اس وقت تو کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے. کوشش کرتا ہوں کہ اس پہاڑ کو عبور کروں دعا کریں کہ کوئی اور پہاڑ نزدیک نہ ہو. کیونکہ اسے عبور کرنے کے لئے اونچائی حاصل کرتے کرتے دو تین چکر لگانے ہوں گے۔" اتنا نو عمر لڑکا کتنے اطمینان سے بات کر رہا ہے. آپ ہیں کہ گھبرائے جا رہے ہیں. ویسے تو ہمیشہ لیکچر دیتے ہو کہ مرنا تو ایک دن ہے پھر موت سے کیا ڈرنا' لیکچر ٹھیک ہے' اب میدان کی بات کرو' میدان کی بات۔ جتنی آیتیں یاد تھیں پڑھ ڈالیں. بیگم نے قرآن کریم کی ایک آیت لکھ کر جیب میں رکھدی تھی کہ جب سفر کرو ضرور پڑھ لیا کرو' یہ آیت حضرت نوحؑ اپنی کشتی پر طوفان سے بچنے کے لئے بیٹھے تو اس وقت انہوں نے پڑھی تھی "بِسمِ اللہ مجریھا ومرسٰھا ان ربی لغفور الرحیم" (اللہ کے نام سے ہے اس کا بہنا اور ٹھہرنا. بے شک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے) جلدی جلدی جیب ٹٹولی اور اس کا ورد شروع کر دیا اس واقعے کو دو تین منٹ لگے ہوں گے مگر گھنٹوں گزر گئے. پہاڑ عبور ہوا تو بس کا میدان. میدان کیا خاک نظر آتا اس وقت تو زمین اور آسمان سب ہی خاکی میدان بنے ہوئے تھے. "کوئٹہ چلتے ہیں بس سمت رکھکر کوئٹہ کا رخ کیا اور چل دیے اب ہوا بھی تیز ہو گئی تھی' کیا خوبی ہے اس جہاز کی. اوپر جاتا ہے' نیچے آتا ہے' ہچکولے کھا رہا ہے مگر چل رہا ہے. کوئی آدھا گھنٹہ اسی کشمکش میں گزر گیا مگر اب گرد کچھ کم ہو چکی تھی اور پہاڑیاں بھی صاف نظر آ رہی تھیں' اللہ اللہ کر کے مشکل دور ہوئی.

اسی قسم کے اور بھی حادثات پیش آتے رہے مگر یہ بات نہ ہو تو پھر زندگی کیا. بات ڈر اور گھبراہٹ کی تھی. یہ قدرتی بات ہے اپنا بچاؤ فطری چیز ہے. یہ تو صحیح ہے مگر میگر پھر کیا. بات یہ ہے کہ نماز پڑھتے ہو' پڑھتا ہوں. روزے رکھتے ہو رکھتا ہوں اگر بیمار نہ ہوں. حج. کیا تو نہیں مگر کرنے کا ارادہ ہے ضمیر نے آواز دی کہ یہ ساری باتیں تو ہیں مگر ہمیشہ سچ بھی بولتے ہو؟ جان دینی ہے' اللہ کو منہ دکھانا ہے' ہمیشہ تو سچ نہیں بولتے' غیبت کرتے ہو' اکثر یہی مشغلہ رہتا ہے' وعدہ نبھاتے ہو کوشش کرتا ہوں' نہیں بات پکی اور سیدھی کرو' اس کو کبھی اہمیت نہیں دی' اپنے مفاد کو دوسرے کے فائدے نقصان پر ترجیح دیتے ہو. ظاہر ہے کہ آج کل کے زمانے میں کون دوسروں کا خیال کرتا ہے کیا فائدہ ایسے روزے نماز کا. واہ صاحب روزہ نماز اپنی جگہ دنیا اپنی جگہ. کیا جگہ "تعین کی ہے صاف نکل گئے. اگر صاف بچنے کی کوشش کرو گے تو یہی ہو گا جواب تک ہوتا رہا ہے. داتا گنج بخشؒ کی کتاب "کشف المحجوب" پڑھی. کچھ سیکھا بھی' یہ تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر سوچنے پر مجبور ہو گیا. نماز روزے سے پہلے یہ دیکھکر کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی ربوبیت..

پر یقین بھی ہے یا نہیں' یہ ایمان کی ابجد ہے' ہے صاحب ضرور ہے' اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے' ہر بات جانتا ہے اور سنتا ہے حیُ القیوم ہے' ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہے گا وہی رزاق ہے، وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس سے لینا چاہے کسی کا باپ اسے نہیں روک سکتا۔ دنیا کی کوئی چیز بغیر اس کے حکم کے نہیں ہل سکتی۔ بس بس خداوند تعالیٰ کی تعریف تو ختم نہیں ہو سکتی۔ اگر سارے سمندر سیاہی ہو جائیں اور سارے درخت قلم پھر بھی بیان کرنا ناممکن ہے۔ آدمی تو لکھے پڑھے ہو یہ بتاؤ پھر جھوٹ کیوں بولتے ہو۔ غیبت کیوں کرتے ہو' وعدہ کیوں نہیں نبھاتے' انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ دوسروں کا بھی خیال رکھو' بولو اب۔ جھوٹ بولتے ہو تو خدا سے تو نہیں ڈرتے ہو ہو دنیا سے ڈرتے ہو اپنا مفاد ہر حال میں پیارا ہے۔ جب ہی تو دوسرے کی گردن کاٹتے ہو اور غیبت کرتے ہو پھر کہتے ہو کہ خدا کو منہ دکھانا ہے' ویسے گردن کاٹتے ہو' جھوٹ بولتے ہو۔ غیبت کرتے ہوئے۔ خدا تو دیکھ رہا ہے تمہیں یقین نہیں کہ خدا دیکھ رہا ہے۔ تم کہہ رہے ہو کہ وہ ہی دینے والا ہے مگر بھروسہ نہیں ہے۔ اگر بھروسہ ہے تو چار سو بیسی کیوں کرتے ہو۔ بیجا خوشامد سے دور کیوں نہیں رہتے۔ بات تو یہی ہے۔ نماز روزہ اسی ایمان کو پختہ کرنے کے لیے ہے۔ نماز پڑھو اس کے معنی پر غور کیا جائے۔ مت غور کرو پھر گلہ کیوں ہے!

ذکر غور کرنے کا آگیا۔ ہمارے صاحبزادے ایک روز کہنے لگے کہ "ابا آجکل مغربی ممالک میں میڈیٹیشن (MEDITATION) کا بڑا کریز (CRAZE) ہے۔ لوگ ہیں کہ یوگا کی دن رات مشق کرتے ہیں پہلے فرار کی راہ اختیار کی۔ یعنی شراب اور نشے کے رسیا ہیں' اس میں سکون نہ ملا تو میڈیٹیشن پر اتر آئے' کہتے ہیں اس سے دل کو سکون ملتا ہے۔ صاحبزادے کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میڈیٹیشن پر اتر آئے' کہتے ہیں اس سے دل کو سکون ملتا ہے"۔ صاحبزادے کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میڈیٹیشن تو مسلمان ہی کرتے تھے۔ جسے "مراقبہ" کہتے ہیں۔ "ابا مراقبہ تو صرف بزرگانِ دین ہی کرتے تھے ہم لوگ کیسے کر سکتے ہیں"۔ پھر سوچ کر بولے "چلہ کھینچنا تو مراقبہ کی ہی ایک قسم ہے' چلہ اگر آدمی غلط کھینچے تو پاگل ہو جاتا ہے"۔ مذہب نہ ہوا ایک تماشہ ہو گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم بزرگانِ دین کی باتیں سنتے ہیں اور عش عش کرتے ہیں مگر ہم۔ جناب بس کی بات نہیں مت مراقبہ کرو' مت چلہ کھینچو' مگر خدا کو حاضر ناظر جانو' اس کی وحدانیت اور ربوبیت کو پہچانو اس پر عمل کرو۔ یہ ہی تو سب سے مشکل کام ہے تو پھر گلہ کیوں کرتے ہو' پھر رہو جیسے رہ رہے ہیں۔ تمہارا اعمال ان سے بھی بدتر ہوگا۔ وہ کم سے کم دنیادار تو ہیں جنہیں سب جانتے اور پہچانتے ہیں۔ تم نہ دنیادار

اور نہ دیندار، تو جناب ملاوٹ تو چل نہیں سکتی۔ زندگی تو کتا بھی گزار دیتا ہے۔

ہم نے بزرگوں سے سنا ہے اور داتا صاحب کی کتاب میں پڑھا بھی ہے کہ خداوند تعالیٰ کی صفت پر جب غور کرو تو تین باتوں پر خاص توجہ دو یعنی اس کے "جمال" "کمال" اور "جلال" پر یعنی انگریزی میں Precision, Beauty "Majesty" تو بہت کچھ عمل بھی کیا۔ یہ ذرا مشکل کام ہے۔ آپ بار بار عمل کی بات کرتے ہیں اپنے پیشے کو لے لیجئے آپ نے بڑی کتابیں پڑھی ہوں گی لیکن جب بھی موقع ملا اس پر عمل کہاں تک کیا۔ کہہ دو یہ بھی مشکل تھا۔ ہاں تھا تو۔ آ ... آ ... اپنا ایمان کی۔ جب جو کچھ پڑھا ہے اس پر ایمان ہی نہیں کیونکہ اسے پختہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تو عمل کیا خاک ہو گا

ذکر شروع کیا جہاز کے سفر کا اور پھر سلسلہ کہاں پہنچا دیا۔ چلئے جہازی کی بات کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں ڈر بھی لگتا ہے اور سواری بھی خوب کرتے ہیں یعنی "جان پیاری بھی نہیں، جان سے جاتے بھی نہیں" جہاز کا سفر بعض اوقات بقول شخصے بہت ہی بور ہوتا ہے اور خاص طور پر فوجی جہاز۔ دو آدمی ہیں اڑے جا رہے ہیں اگر "انٹرکام" (INTERCOM) خراب ہو تو آپس میں بات بھی نہیں کر سکتے۔ دھکے لگے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ نیچے دیکھا۔ گھبراہٹ ہوئی سگریٹ پینی شروع کر دی، ایک دو منٹ کی بات نہیں گھنٹوں کی بات ہوتی ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اتنا گناہگار ہوتے ہوئے خداوند تعالیٰ کے جمال، کمال اور جلال کی بات کر رہا ہوں، لوگوں نے تو اس پر عمریں صرف کر دی ہیں۔ تو کیا بات کرے گا۔ کیا تیری ہستی اور کیا تیری ذات۔ بھائی سب ٹھیک ہے۔ گناہگار کو کچھ کہنے کا حق بھی نہیں سن تو لیں۔

جہاز اڑا آہستہ آہستہ اس نے اونچائی حاصل کرنا شروع کی، سامنے زیارت کی پہاڑیاں ہیں۔ یہ پہاڑی سلسلے کا آغاز ہے، مشرق کی جانب سے سورج نکل رہا ہے۔ سورج کی کرنیں ان پہاڑیوں پر پڑتی ہیں۔ مختلف قسم کے رنگ بکھرتی ہیں۔ کوئی پہاڑی سرخی مائل، کوئی سرمئی، کسی کا ملا جلا رنگ۔ جیسے جیسے جہاز آگے چلتا جاتا ہے۔ رنگ بدلتے جاتے ہیں۔ یہ بھی نظارہ بھی اور کیا کیا رنگ بکھر رہے ہیں، ان پہاڑوں پر سے مختلف اوقات اور مختلف موسم میں گزرا ہوں مگر ہر دفعہ ایک نیا لطف آیا ہے اور ایک نیا سماں دیکھا ہے، لوگ کہتے ہیں۔ کہ ایک ہی چیز کو صبح اور شام دیکھے جاؤ تو طبیعت اکتا جاتی ہے۔ غور سے دیکھیں تو ہر لمحہ نیا ہے اور ہر ساعت دلکش۔ موسم خراب بھی ہوا، بادل بھی سامنے آئے مگر لطف اور دوبالا۔ آگے بڑھے تو زیارت کے پہاڑ یہاں جہاز وادی میں سے گزرتا ہے۔ ہرے درخت

ان پر سورج کی چمکتی ہوئی کرنیں، سامنے کالے بادل، مختلف رنگ، ان کا تضاد۔ کبھی سورج چھپتا ہے تو سماں ہی بدل جاتا ہے۔ کہاں یہ چیز آپ آرٹ گیلری یا سینما میں بیٹھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ جس سے کہ طبیعت سیر ہی نہیں ہوتی۔ آپ سارے دن جہاز کو چکر دیں لطف کم نہیں ہوتا۔ اپنی اپنی نظر ہے چاہے جس زاویے سے دیکھیں، اس کا حسن تو ہر ایک کے لئے ہے۔ اپنے اپنے ظرف کے مطابق سیری کریں۔ نہ چاہیں تو آپ کی مرضی۔ پیجیے سگریٹیں اور گھنٹے گنیے۔ گزاریے وقت جیسے بھی گزرتا ہے۔

سورج اوپر چڑھ رہا ہے۔ اپنے تعین شدہ راستے پر اگر آپکا حساب صحیح ہے تو اس میں فرق نہیں آسکتا لوگ تو اس سے گھنٹوں کیا سیکنڈوں کا حساب رکھتے ہیں، جیسے جیسے سورج چڑھتا جاتا ہے۔ مختلف رنگ بکھرتے جاتے ہیں۔ لگائیے آپ کمپیوٹر۔ ارے صاحب! کیا بات کر رہے ہیں آپ تو کفر پر اتر آئے۔ کہاں خدا اور کہاں بندے کا مقابلہ مگر لوگ کرتے ہیں۔ روسیوں نے جب پہلا راکٹ خلا میں چھوڑا تو خروشچیف جامے میں نہ سمائے اور کہنے لگے "ہم اوپر آسمان پر بھی جا کر دیکھ آئے ہیں۔ وہاں کوئی خدا نہیں" یار خدا کو آسمان میں تلاش کرتا ہے اور وہ بھی اپنی عقل کا تعین کیا ہوا آسمان۔ اس کی وسعت کو سمجھنے کے لئے عقل کہاں تک ساتھ دے گی۔ عقل تو خود محدود ہے خدا تو تیرے قریب ہے، آس پاس ہے، ہر جگہ ہے۔ باتیں تو کچھ ٹھیک ہی کرتے ہو مگر عمل۔ اب جانے دیں ان باتوں کو کمزوری کا اعتراف تو کرتا ہوں۔

جہاز سے نیچے دیکھا۔ پہاڑیوں پر نظر پڑی۔ کب سے یہ پہاڑیاں اور پہاڑ قائم ہیں اور کب تک رہیں گے، ان میں کیا رد و بدل رونما ہوا۔ کبھی یہاں سمندر ہوتا تھا۔ پھر جنگل۔ کون کون سی مخلوق یہاں رہی ہوں گی۔ فوسلز (FOSSILS) یعنی رکازات میں نے بھی کافی اکٹھے کیے ہیں۔ بس یہ سمجھ لیجیے کسی جانور یا پانی کی مخلوق کا ڈھانچہ جو کسی دباؤ کے تحت پتھر بن جاتا ہے، یہ پتھر کے ڈھانچے لاکھوں کروڑوں سال پرانے ہوتے ہیں، ان فوسلز سے پتا لگتا ہے کہ کبھی یہاں ڈائنا سور (DIANASOUR) گھومتے پھرتے ہوں گے۔ ڈائنا سور کروڑوں صدیوں پہلے ایک جانور ہوتا تھا جو کہ ہاتھی سے بڑا تھا اور جب یہ زمین زیادہ تر پانی سے ڈھکی ہوئی تھی چاروں طرف آتش فشاں پہاڑ تھے اس وقت چہل قدمی کرتا تھا۔ اس زمانے میں درخت بھی ہوتے تھے۔ جن کی پتیوں سے پیٹ بھی بھر لیتا تھا۔ محقق کہتے ہیں کہ ان کی کچھ اقسام گوشت خور بھی ہوتی تھیں، تو گوشت بھی قدرت دوسرے جانوروں کا مہیا کرتی تھی۔ زمین

کی حالت بدلی۔ یہ جانور اور درخت معدوم ہو گئے۔ کتابوں میں ہم نے بھی پڑھا ہے'آپ کو یقین نہیں آتا تو خود یہاں آ کر ان کے ڈھانچے دیکھ لیں جو پتھر بن گئے ہیں۔ کچھ ہڈیاں اور درخت کی شاخیں میرے پاس بھی پڑی ہیں۔ اگر پھر بھی یقین نہ آئے تو میں آپ کو جگہ بتائے دیتا ہوں۔ کیا بات کرتے ہیں یا الف لیلیٰ کی کہانی کہنے بیٹھ گئے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ لیکن اصل بات کمال کی ہے'اس نے ہر وقت کا تعین کیا ہے اور اس وقت کے لحاظ سے کاروبار چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ ہر ایک سیکنڈ کا اسے علم ہے۔ کیجئے غور! کہاں تک کیجئے گا۔

جس زاویئے سے دیکھئے ایک نیا پہلو نظر آتا ہے۔ کتنے کو پتھر ہیں مگر سائنسی نکتہ نگاہ سے دیکھئے کہ ان میں کیا کیا اجزا شامل ہے'کب اور کیسے ان کی ترکیب ہوئی۔ لگایئے حساب کہ ایک سوئی کے برابر پتھر کے ٹکڑے میں کتنے مالیکیول (MOLECULE) اور ایٹم (ATOM) ہوں گے۔ کتنے الیکٹران' پروٹون چکر لگا رہے ہوں گے۔ ہمارا علم درست بھی ہے۔ یہ بھی ہم نہیں کہہ سکتے۔ مگر اندازہ تو لگا سکتے ہیں۔ یہ الیکٹران' پروٹون اور نیوٹرون بھی تو ایک خاص حدود میں چکر لگاتے ہیں۔

بات آ گئی جلال کی۔ کیا اس کی حکومت ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہے گی۔ وقت اور فاصلے بے معنی لامحدود اور لامتناہی' ہر ایک بندش سے آزاد۔ علم اور عقل کی بلندی سے بالاتر۔ آپ ایک جہاز میں سفر کر رہے ہیں نیچے نظر جاتی ہے تو پہاڑ ہی پہاڑ نظر آتے ہیں۔ کہیں آبادی ہے کہیں درخت کہیں خشک میدان۔ انسان تو رہتے ہوں گے پتہ نہیں کتنے ہیں۔ ارے بھائی رب العالمین ہے'اس کی مخلوق تو چیونٹی اور اس سے بھی چھوٹے جانور ہیں جو کہ آپ خوردبین سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ کیا حساب ہے مخلوق کا پتھروں کے نیچے دفن' سمندر میں' ہوا میں' آگ میں۔ کون سوچ سکتا ہے اور کہاں تک۔ لیکن اپنی ہر ایک مخلوق کا اسے پتہ ہے۔ ہر ایک کا اپنا وقت مقرر ہے۔ رزاق ہے۔ وہ سب کو رزق بھی دیتا ہے۔ کیا اس کی حکومت ہے'ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ تخیل کو ذرا اور ڈھیل دو اگر ہے تب۔ یہ تو تھوڑا سا علاقہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اب آپ دنیا پر نظر ڈالئے کروڑوں لوگ یہاں بستے ہیں۔ لوگوں کو جانے دیں۔ مخلوق انگنت۔ ہر ایک کا خدا اور جو آپ اس جہاز میں جا رہے ہیں کروڑوں انسانوں میں سے ایک آپ کی کیا ہستی ہے مگر میرا بھی تو خدا ہے' میرے ساتھ ہے۔ پھر تخیل تنگ کر دیا۔ اس کائنات میں ایک آپ کی

زمین ہی تو نہیں اور چاند ہیں اور سورج ہیں اور ستارے ہیں۔ کتنے ہیں؟ حساب نہیں لگا سکتے۔ ان میں بھی تو مخلوق ہو گی۔ جاندار ہی تو اس کی مخلوق نہیں۔ بے جان بھی تو اس کے ہیں۔ کیا اندازہ لگائیں گے۔ مگر پھر بھی دیکھیے وہ آپ کے ساتھ ہے اور اس کا آپ کو پتہ ہے۔ اس کی مرضی تو ہو کر رہے گی۔

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
ناقابلِ فراموش
JALALI
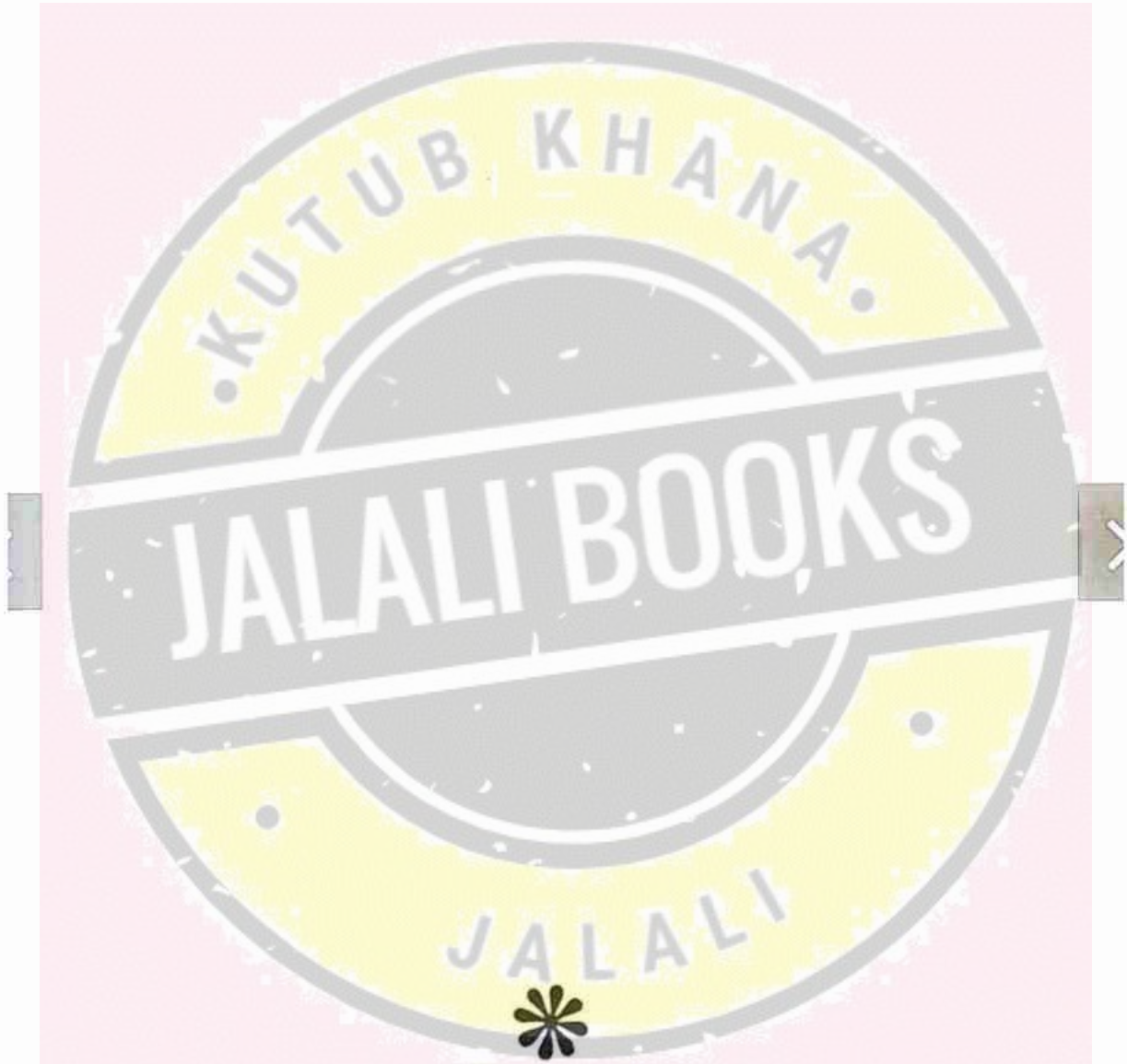
ناقابلِ فراموش

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب کہ حالات بہتر نہیں تھے۔ کوہلو پہنچے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے لوگوں سے واقفیت اور حالات کا علم نہیں تھا جب کبھی بھی حادثات رونما ہوئے کارروائی کی جاتی اور گرفتاریاں عمل میں آتیں پوچھ گچھ شروع ہو جاتی اور چھان بین جاری رہتی۔ یہ کام تو سول حکام کرتے۔ مقدمے کی کارروائی مکمل ہوتے ہوتے بھی دیر لگتی۔

ہم اپنی گاڑی خود ہی چلاتے ہیں اس کی دو وجوہ ہیں ایک تو نفسیاتی یعنی کچھ ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ جب تک ڈرائیونگ جاری رہتی ہے سگریٹ پینے کی خواہش نہیں ہوتی۔ سگریٹ کم کرنے کا یہ ایک آزمودہ نسخہ ہے دوسرا یہ کہ ان حالات میں اگر کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش آجائے تو تیزی سے خود کارروائی کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک روز ہم جا رہے تھے سڑک خاموش اور سنسان گاڑی چلانے والے کی نگاہ سڑک پر لگی ہوتی ہے تاکہ برابر میں بیٹھا ہوا آدمی پہاڑوں کی ڈھلوان کو غور سے دیکھتا جاتا ہے تاکہ اگر کوئی غیر معمولی حرکت نظر آئے تو پہلے سے آگاہی ہو سکے چلتے چلتے ایک بچہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا ہوا نظر آیا۔ ایک عجیب سی بات تھی گاڑی آہستہ کی قریب سے دیکھا تو ایک بچی جس کی عمر تقریباً آٹھ نو سال کی ہوگی دونوں ہاتھ اوپر کئے کھڑی تھی۔ ہم اتر کر سنبھالا

یا کھلونے اپنے ساتھ رکھتے تھے کہ جب کوئی بچہ نظر آتا اسے دے دیتے۔ بچوں سے ہمیشہ محبت رہی ہے۔ گاڑی روکی اور بچی کو بلایا۔ زار و قطار آنکھوں سے آنسو جاری اور زور زور سے گھبراہٹ میں کچھ کہہ رہی ہے، اس بچی کا ہیں رونا عجیب سا لگا۔ نیچے اتر کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا مگر غصے میں آ کر اس نے سر ایک طرف کر لیا۔

میرے باپ کا کیا قصور ہے جو اسے تم لوگ اپنے ساتھ لے گئے ہو اگر اسے نہیں چھوڑتے تو میرے اوپر سے جیپ گزار دو میں راستے سے نہیں ہٹوں گی"۔

"بیٹا ہم تو تمہارے باپ کو جانتے بھی نہیں کسی بڑے آدمی کو بلاؤ پتہ چلائیں کہ اس کا نام کیا ہے اور اسے کیوں پکڑا گیا ہے"۔

"میں کسی کو نہیں بلاتی' فیصلہ کرنا ہے تم نے اور میں نے یا تو تم جیپ چلاؤ اور مجھے ختم کر دو یا میرے باپ کو چھوڑ دو"۔

بچی کے بولنے کا کچھ انداز ایسا تھا کہ ہم بھی ضبط نہ کر سکے۔ جب بچی نے یہ حالت دیکھی تو اس کا حوصلہ بھی بندھا ہمارے ساتھ ایک مری دوست تھے وہ بھی نیچے اتر آئے' انہوں نے بھی بچی کو یقین دلایا ذرا آرام سے بات بیان کرو گھبرانے کی کوئی ایسی بات نہیں سارے فوجی اپنے ہیں کوئی باہر کے تو نہیں جو ناجائز ظلم کریں گے"۔

اچھے اپنے ہیں کہ بچی کو باپ سے جدا کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ تیرا باپ اب زندہ واپس نہیں آئے گا" کافر کسی کو بھی نہیں چھوڑتے میں اپنے باپ کے بغیر نہیں رہ سکتی سا اگر اسے مار دیا ہے تو مجھے بھی مار دو"۔

ہمارے دوست نے پھر دلاسہ دیا" بیٹا ہم سب مسلمان ہیں' ان میں کافر کوئی بھی نہیں ہے تیرا باپ اگر بے گناہ ہے تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تیرا حلقہ کدھر ہے آؤ معلوم کرتے ہیں کہ بات کیا ہے؟"

بچی نے جب "مسلمان" کا لفظ سنا تو عجیب نگاہوں سے ہم لوگوں کی طرف گھورا' جیسے اسے یقین نہیں آیا ہو اور خاموش کھڑی ہو گئی۔ میرے ساتھ ایک اور افسر ہیں۔ داڑھی بھی خوب گھنی رکھی ہوئی ہے اور بلوچی بھی عمدہ بولتے ہیں لہٰذا وہ بھی اتر کر بچی کے سامنے آ گئے۔ وردی پہنی ہوئی تھی۔ بچی انہیں دیکھتے ہی زور سے بولی۔ "تو تو مسلمان ہے اور بلوچ بھی ہے کچھ تو خیال کر"۔

افسر نے بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا" بیٹا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم سب ہی مسلمان ہیں۔ تُو ہم سب کی بیٹی ہے چل ہمیں اپنے حلقے میں لے چل' پوچھتے ہیں کیا بات ہے"۔

بچی کو اب تھوڑا تھوڑا صبر سا ہو چلا تھا۔ اپنے افسر سے جب اسے آشنا و مانوس دیکھا تو ہم نے بھی اپنی بلوچی بولنے

کی مشق شروع کی۔ اس دفعہ جب ہم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس نے جھٹکا نہیں۔ اب وہ ہمیں اپنے 'حلق' کی طرف لے چلی۔ اپنا نام 'سیوی' بتاتی تھی اور پیردادانی قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے آنسو بھی تھم چکے تھے بات بھی آہستہ آہستہ کر رہی تھی جو ہم سمجھ رہے تھے۔

پتہ چلا کہ کچھ دن ہوئے ہمارے ایک گشت پر لوگوں نے فائر کیا۔ گشت نے گھیرا ڈالا اور کچھ لوگوں کو ہتھیاروں سمیت گرفتار کر لیا۔ ان گرفتار ہونے والوں میں سیوی کے والد صاحب بھی شامل تھے۔ بچی کو یقین دلایا کہ تمہارا باپ اگر بےقصور ہے تو چھوڑ دیا جائے گا۔ کہنے لگی مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ زندہ بھی ہے اور پھر اس نے رونا شروع کر دیا "نہیں بیٹا وہ زندہ ہے"۔ "تمہیں یقین نہیں آتا تو ہمارے ساتھ چل کر دیکھ لو"

"اگر وہ زندہ ہے تو مجھے ملوا دو اور اسے چھوڑ دو؟"

اب بچی کے سامنے ہم لاجواب ہو چکے تھے۔ بچی کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ بحث کی کوئی گنجائش بھی نہیں تھی۔ دل میں خیال آیا کہ سول حکام سے سفارش کی جائے کہ اسے ضمانت پر رہا کر دیا جائے' اس زمانے میں کوئی ضمانت دینے کو بھی تیار نہ تھا۔ فیصلہ کیا کہ اگر کوئی ضمانت نہیں دیگا تب بھی کوئی صورت نکالیں گے" آخر بچی کو بار بار "بیٹا" کہہ کر مخاطب کیا

تھوڑی دیر بعد ایک اور بچی آ گئی اس نے بھی ہمارا ہاتھ پکڑ لیا۔ اپنا نام "جہاں بی" بتاتی تھی' اس کی بھی یہی درخواست تھی۔ ہم نے دونوں سے کہا کہ دونوں ہمارے ساتھ چلو اور اپنے باپ کو ساتھ لے آؤ۔

حیرانی سے تکنے لگیں اور یکدم اپنی جھگیوں کی طرف لپکیں اور تیار ہو کر بھاگی ہوئی واپس آ گئیں کہ چلیے۔ ان کی مائیں چلا رہی تھیں کہ کافروں کے ساتھ کدھر اکیلی جا رہی ہو۔

نہیں، یہ لوگ مسلمان ہیں۔ ہم ضرور جائیں گی اور ابھی ابا کو لیکر واپس آتے ہیں۔ راستے میں ہمارے مری دوست بولے

" آپ نے بچیوں کو بیٹا کہا ہے اب تو اسے نبھانا ہوگا۔ آپ ان کے باپ کو اب چھوڑ بھی دیں تو وہ کہیں نہیں جائیں گے۔

"بھائی نبھانے کی کوشش کریں گے۔ ہماری بھی تو کچھ مجبوریاں ہیں۔"

" مجبوریاں وغیرہ تو اب بے معنی' بلوچی روایات کے مطابق آپ کو اپنے وعدے پر قائم رہنا ہوگا" چنانچہ ایسا ہی کیا۔ سب سے پہلے ہم نے سول حکام سے بات کر لی تھی۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ ذمہ داری اٹھاتے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔

جب لڑکیوں نے اپنے باپ کو دیکھا تو دونوں طرف سے حیرانی تھی۔ بچیاں کہنے لگیں ہمیں یقین نہیں آتا کہ تم زندہ ہو پھر ایسی لپٹیں کہ سارے جہان کی محبت و شفقت طرفین میں سمٹ آئی ہو۔

باتیں شروع کرنے سے پہلے وہی "حال" کا رواج۔ مجال ہے بچیوں نے "حال" دیتے وقت کوئی مکالمہ یا واقعہ بیان کیا ہو جو ہمارے اور ان کے درمیان ملاقات کے دوران پیش آیا تھا مثلاً کیسے جیپ روکی مسلمان اور کافر والی بات۔ ماں اور لوگ کہتے تھے کہ تم کو (باپ) مار دیا گیا ہے یا مارنے کی تیاری ہو رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔

جب ان لوگوں کو واپس چھوڑنے گئے تو دونوں کہنے لگے۔

جب اور جہاں آپ ہمیں بلائیں گے ہم حاضر ہو جائیں گے۔

"بچیوں سے ہم نے دریافت کیا" بیٹا یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کس نے بتایا کہ ہم کافر ہیں"۔

"ہمارے سب بڑے ہی یہ کہتے ہیں"۔

"اچھا اب بھی تم ہمیں کافر سمجھتی ہو" بچیوں نے نفی میں سر ہلا دیا اور مسکراتی ہوئی جھگیوں کی طرف چل دیں۔

ہماری بی بی سوزی اور جہاں بی، جب تک ہم کوہلو میں رہے برابر ہمیں ملنے کے لیے آتی رہیں۔ ہماری دعا ہے کہ وہ جہاں رہیں خوش رہیں۔ ایک باپ یہی دعا کر سکتا ہے۔

فوجی کارروائی کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جب کبھی بھی خبر ملتی کہ تخریب کار کسی جگہ جمع ہیں تو رات کی تاریکی میں علاقے کو گھیرے میں لے لیا جاتا اور صبح تخریب کاروں کی چھان بین ہوتی اکثر ایسی کارروائیوں میں تخریب کار مزاحمت کرکے نکلنے کی کوشش کرتے ایک دفعہ ایسی ہی کارروائی کی گئی اور چند بدنام فراری گرفتار کر لیے گئے۔

کارروائی ختم ہونے کے بعد گرفتار شدہ فراریوں کے وارثوں کو جمع کیا گیا تاکہ ان کی دیکھ بھال کی جا سکے۔

جہاں یہ کارروائی عمل میں آئی تھی اس جگہ کئی قبیلے موجود تھے ایک روز لوگوں کے وارثوں کو دیکھنے گئے کہ پتہ کریں کہ انہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ راشن اور کپڑے وغیرہ ٹھیک طور سے تقسیم ہو رہے ہیں۔ بندوبست سے تو یہ مطمئن نظر آتے تھے مگر ان کی بات چیت سے شک سا ہوا کہ بے اطمینانی پائی جاتی ہے۔ عورتیں آپس میں بات کر رہی تھیں کہ کسی کی بیوی پیچھے رہ گئی ہے ہم نے اپنے مری دوست سے کہا کہ ذرا آپ معلوم کریں کیا بات ہے۔

وڈیرہ گنج علی جو کہ پیر دادانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے عمدہ آدمی ہیں۔ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں کہنے لگے

آپ یہیں ٹھہریں میں تفصیل سے معلوم کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد آئے اور بتایا کہ جہاں کارروائی ہوئی تھی وہاں کئی قبیلے تھے۔ تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منڈانی قبیلے کے دس افراد نے نکلنے کی کوشش کی ان کے ساتھ ان کی عورتیں بھی تھیں ایک پیر دادانی عورت اور ایک منڈانی کی بیوی ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ یہ لوگ اپنی عورت کو تو اٹھا لائے مگر پیر دادانی وہیں پڑی ہے۔

"کمال ہے بھئی عورت پھر عورت ہوتی ہے' چاہے کسی بھی قبیلے کی ہو وہ غریب پتہ نہیں کہاں کب سے ہوگی"۔

ہماری تشویش میں اور بھی اضافہ ہوا۔ لوگوں کو جمع کیا اور تفصیل سے پوچھنا شروع کیا کہ آخر غریب کہاں پر پڑی ہے؟ کتنے دن سے وہاں ہے اور کس کی بیوی ہے۔ پتہ چلا کہ ایک دن اور ایک رات تو گزر چکی ہے۔ جہاں پر وہ ہے نہ پانی ہے وہاں اور نہ کھانے کا کوئی انتظام۔ جس شخص کی وہ بیوی ہے وہ کوہلو میں نظر بند ہے۔ شام ہو رہی تھی جو صاحب غریب عورت کو چھوڑ کر آئے تھے انہیں طلب کیا اور پوچھا اچھے مرد ہو کہ غریب عورت کو اکیلا چھوڑ آئے اور کسی کو بتایا بھی نہیں۔ کیا کریں ہمارے قبیلے کی عورت تو تھی نہیں۔ اب جس کی ہے وہ جانے۔ ہماری سپردگی میں بھی کوئی کر دیتا تب بھی ہم کچھ نہ کرتے۔ بحث کرنے کا موقعہ نہیں تھا۔ وقت بھی تھا۔ ان سے کہا کہ جناب ہیلی کاپٹر منگاتے ہیں آپ ہمارے ساتھ چلئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ ویسے ہی گزر چکے ہیں وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں"۔

سُنکر بولے "اب تک تو وہ ویسے ہی مر گئی ہوگی۔ جنگلی جانور کب زخمی کو ایسی حالت میں چھوڑتے ہیں جہاز پر بیٹھ کر آپ کو راستہ بتانا مشکل ہے۔ ویسے رات کا وقت تھا ہمیں جگہ بھی ٹھیک سے معلوم نہیں"۔

بہت غصہ آیا کہ انسان کی زندگی بھی لوگ سستی سمجھتے ہیں مان لیا کہ قبیلہ اپنا نہیں مگر سب انسان تو ہیں۔ وڈیرہ گنج علی ہمارا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے وقت تھوڑا ہے اس عورت کے مرد کا نام ہم نے پتہ کر لیا ہے' اب کوہلو چل کر اسے ہی بھیجتے ہیں اگر قسمت ہوئی تو زندہ بچ جائے گی"۔

کوہلو پہنچتے پہنچتے رات ہو چکی تھی۔ مرد کو بُلوایا پتہ چلا کہ تسلیم شدہ فراری ہے سول حکام نے ان کے خلاف کئی مقدمات درج کر رکھے ہیں اور وہ انہیں کسی قیمت پر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ اب کیا کیا جائے۔ ہمارے ایک نوجوان افسر جذباتی ہو گئے کہنے لگے۔ ساری باتیں درست مگر اس میں عورت بیچاری کا کیا قصور ہے میں اس

JALALI BOOKS

کے مرد کے ساتھ چلتا ہوں۔ اگر آج رات تک اس کے پاس پہنچا نہ گیا تو غریب موسم کی شدت اور بھوک پیاس سے مر جائے گی۔ اس کی موت کے ہم سب ذمہ دار ہوں گے۔

بات دل کو لگی مرد نے بھی عاجزانہ گزارش کی۔ مان لیں میں بہت ہی گناہگار ہوں۔ اگر آپ مجھ پر بھروسہ کر کے چھوڑ دیں تو میں ضرور اپنی بیوی کے ساتھ حاضر ہو جاؤں گا۔ بیوی کا تو مجھے پتہ لگ گیا مگر کہوں کا بھی پتہ کرنا ہے۔"

ہمت کی مرد سے کہا تم جاؤ اور ابھی جاؤ تمہارے ساتھ ڈاکٹر بھی جائے گا۔ آنا نہ آنا تمہاری مرضی پر ہے۔"

دو دن بعد اپنے خاندان کے ساتھ ہمارے دوست خود حاضر ہو گئے۔

بیوی کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی وہ بھی علاج کے بعد ٹھیک ہو گئی۔

ہم نے اپنے مری دوستوں سے اکثر پوچھا کہ بھائی ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے ایک عورت کو بے یار و مددگار چھوڑا جا سکتا ہے کہہ دو کہ بس رواج ہے کہ دوسرے قبیلے کی پرواہ نہیں کی جاتی۔

اب ذرا اچھے دنوں کی بات کرتے ہیں۔ ہماری دوستی مری بھائیوں سے کافی بڑھ چکی تھی۔ اکثر علاقے کا لمبا چکر لگایا کرتا تھا۔ کچھ گاڑیاں ساتھ ہوتیں اور کوشش یہ رہتی کہ جہاں تک دور دراز علاقے میں جانا ممکن ہو چکر لگایا جائے۔ گاڑیوں کے راستے تو ناپید تھے۔ عموماً بغیر راستوں کے ہی گاڑیاں چلائی جاتیں۔ ربط قائم کرنا ضروری تھا تاکہ دوستی بڑھے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ راستہ بتانے اور بات چیت میں مدد دینے کے لئے ہمارے مری دوست بھی شامل ہو گئے۔

ایسے ہی ایک دفعہ ہم تملا جنگ جا نکلے۔ کافی لمبا سفر کرنا پڑا۔ چلتے چلتے جب تھک گئے تو ایک جگہ تھوڑی دیر قیام کے لئے رکے۔ ہمارے مری دوست بھی وہاں جمع ہو گئے۔ باتیں ہوتی رہیں کسی نے بتایا کہ یہاں سے تھوڑی دور ایک بستی ہے جہاں ایک عورت بیمار ہے۔ ہمارے ساتھ ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ سوچا گئے تو تھوں، بیمار کی عیادت بھی ہو جائے۔

درحقیقت عورت کے جگر پر ورم تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ "اگر مریضہ کو بچانا ہے تو فوری آپریشن ضروری ہے۔ ویسے آپریشن کامیاب ہونے کی امید کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ چلئے کوشش کیے لیتے ہیں۔"

سب سے بڑی مشکل اس بات کی تھی کہ مریضہ کی حالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کچے راستے راستے

بیس میل دور لیجایا جائے۔ وائرلیس پر کوہلو بات کی۔ اتفاق سے وہاں ایک ہیلی کاپٹر کام سے آیا ہوا تھا۔ پائلٹ فوراً آنے کے لئے رضامند ہوگیا۔

گھر والوں کو مریضہ کے کوہلو ہسپتال پہنچنے پر کوئی اعتراض نہ تھا" اب ویسے بھی یہ مرجائے گی۔ آپ لوگ بھی کوشش کرلیں" کچھ لوگ یا [illegible] نہ تھے بس کچھ بے اعتباری والی بات۔

مریضہ تو خیر کوہلو پہنچ گئی اس کا آپریشن بھی ہوا اور خدا کے فضل سے جلد صحتیاب بھی ہوگئی مگر ایک بات سے ہمیں بہت دکھ ہوا۔ وہ یہ کہ جب مریضہ زیرِ علاج تھی ہم اس کے علاقے میں کسی کام سے جانکلے۔ ایک عمر رسیدہ عورت نے ہماری گاڑی کو روکا "کیا بات ہے خیریت تو ہے"

"یہ بتاؤ جس عورت کو تم لے گئے تھے اس کا کیا حال ہے"۔

"بالکل ٹھیک ہے تھوڑے دنوں بعد واپس آجائے گی"۔

اس نے کچھ اس طرح منہ بنایا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو۔ سوچ کر بولی" اسے کھانا کھلایا تھا پانی پلایا تھا کہیں جہاز سے دھکا تو نہیں دے دیا"۔

صدیوں کی بے اعتباری ایسی آسانی سے تو نہیں جاسکتی۔

اب ذرا ذکر اپنی نااہلی کا اور بڑوں کی فراخدلی کا ہوجائے۔ ایسے حالات میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں غلطیاں اگر دیدہ و دانستہ ہوں تو ان سے درگزر بھی کیا جاسکتا ہے۔ معاف کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اس کے لئے تو بڑا دل چاہیئے۔ اور ساتھ ساتھ رحم کا جذبہ بھی اور خدا کا خوف بھی۔ اگر یہ اجزاء بڑوں میں موجود ہوں تو کام کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس معاملے میں ہم بڑے ہی خوش قسمت واقع ہوئے ہیں۔

چیف آف آرمی اسٹاف جنرل ٹکاخان مری علاقے میں اکثر تشریف لاتے ہمیشہ ہدایت یہی ہوتی کہ عام قبائلی کا خاص خیال رکھا جائے۔ انہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو۔ تکالیف تو بے شمار تھیں اور ہمیشہ سے ہیں۔ گھر بار ندارد۔ راشن کا ناقص بندوبست۔ طبی امداد کی عدم موجودگی وغیرہ وغیرہ مگر ان کے حصول کے لئے کوشش جاری رکھنا ضروری ہے۔

ایک دفعہ ہماری سفارش پر ہدایت دی گئی کہ نمونے کے طور پر پانچ کمیونٹی سنٹرز (COMMUNITY CENTER

بنائے جائیں ہر ایک سنٹر میں اسکول، ڈسپنسری۔ دوکانیں، کنواں اور تالاب مہیا کیا جائے تاکہ قبائلی کسی حد تک خانہ بدوشی ترک کرکے آباد ہونا شروع ہو جائیں ان کی قریبی زمینوں کو بھی آباد کیا جائے اگر لوگوں کو آباد کرنا مقصود ہے تو پھر روزی کمانے کے ذرائع کا مہیا کرنا بھی لازمی ہے۔ فی الحال یہ ذرائع محدود ہیں۔

کام زور و شور سے جاری ہوا۔ یہ تو لازمی تھا جنرل ٹکا خان کو ٹیلیفون پر بار بار اس کام کی رفتار بتلائی جاتی۔ پھر وہ خود بھی اس کام کو دیکھنے آئے۔ جب کام مکمل ہو گیا تو ہم نے سوچا کہ اب یہ سنٹر خود ہی آباد ہوتے رہیں گے جو ہمارا کام تھا ہم نے کر دیا۔ مزید فرائض اتنے زیادہ تھے کہ ہمارا دھیان ان کی آبادکاری کی طرف سے ہٹ گیا۔ ہمیں جب تک خبر ملی کہ جنرل ٹکا خان کوہلو آ رہے ہیں۔ آتے ہی انہوں نے ایک سنٹر کو دیکھنے کی ظاہر کی یہ سنٹر کوہلو سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر بنایا گیا تھا۔ ویسے بھی ہم اپنے فرائض ادا کرکے کوئٹہ جانے والے تھے اور سنٹر میں بھی بہت دنوں سے جانا نہیں ہوا تھا۔ سنٹر کے قریب ہیلی کاپٹر اترا۔ مری قبائل چیف آف سٹاف آرمی کو دیکھ کر جمع ہو گئے انہیں تو سب ہی جانتے تھے اور پہچانتے تھے اور بات کرنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ شکایتیں ہیں کہ جاری ہیں۔

یہ کام تو فوج کا نہیں ہے۔

کام بے شک آپ کا نہیں ہے مگر ان لوگوں کی مدد کرنا تو آپ کا فرض ہے۔

زمینیں ٹھیک کرنے کے لئے بل ڈوزر اور ٹریکٹر ابھی تک نہیں آئے ہیں۔ کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی تک یہاں نہیں پہنچے ہیں۔

کوشش سے کیا مراد انہیں تو یہاں موجود ہونا چاہیے۔

اسکول تو بن گئے استاد کوئی نہیں ہے

لکھا تو ہے ابھی تک کوئی تعینات نہیں ہوا۔

آپ لوگوں کا یہاں ہونے سے کیا فائدہ ہے؟

شکایتیں ہوتی رہیں۔ ہم جواب تلاش کرتے رہے قصور کلیتاً ہمارا نہ تھا مگر کچھ تو تھا۔ لیکن ہمیں کچھ اس انداز سے آگاہی دلائی گئی کہ ہم خود ہی شرمندہ تھے اور کوتاہیوں کا احساس اشد ہو رہا تھا۔ روایتی ڈانٹ پھٹکار سے شاید وہ بات نہ بنتی۔

ایک دفعہ وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کوھلو تشریف لائے۔ ان کے ہمراہ جنرل ٹکا خان بھی تھے۔ وزیرِ اعظم کی آمد سے پہلے ہمیں ان کے ہمراہ آنے والے مہمانوں کی ہدایت بھی دی گئی تھی۔ ان کی تعداد کے مطابق ہیلی پیڈ پر گاڑیوں کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ جب ایسے ہیلی کوپٹر نیچے اتر گئے تو معلوم ہوا کہ مہمان فہرست سے کہیں زیادہ ہیں۔ گاڑیاں بھر چکی تھیں۔ جنرل ٹکا خان آرام سے ایک جیپ میں پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ ہم اپنی نااہلی پر پشیمان ہوئے کہ جیپ ایک علیحدہ ان کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ مگر ایسا کیوں ہوا! بھاگ دوڑ کر کے ایک اور جیپ منگوائی مگر جنرل صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں۔ کوھلو میں جیپ مہیا کرنا بھی آسان کام نہیں ہے۔"

وزیرِ اعظم بھٹو ہیلی پیڈ سے نظر بندوں کو دیکھنے گئے۔ سب ان کی آمد کے منتظر تھے۔ تمام چاروں طرف جمع ہو گئے۔ سلام دعا کے بعد ہر ایک نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا۔ اسی دوران ایک مری قرآن شریف اوپر اٹھائے ہوئے آگے بڑھا "ہمارا فیصلہ آپ اس کتاب پر کریں" کلام پاک کو دیکھ کر شروع میں ہم سب گھبرائے۔

کلام پاک اٹھانے والا زور زور سے کہہ رہا تھا "آپ ہمیں معافی دے دیں ہم سے غلطی ہو گئی آئندہ ایسا کوئی قصور سرزد نہیں ہوگا۔"

وزیرِ اعظم نے بڑے تحمل سے کہا "ٹھہریئے ٹھہریئے۔ اگر آپ لوگوں نے کلام پاک پر ہی فیصلہ کرنا ہے تو آپ سب کلام پاک پر ہاتھ رکھیے میں بھی اس پر ہاتھ رکھتا ہوں۔"

معلوم ہوتا تھا کہ سب اس بات کے منتظر ہیں۔ سب نے جلدی جلدی کلام پاک کو چومتے ہوئے اس پر ہاتھ رکھا اور یک زبان ہو کر بولے۔ "ہمیں معاف کر دیا جائے آئندہ سے ہم حکومتِ پاکستان کے وفادار رہیں گے۔" کچھ جذباتی بھی ہو گئے۔ آخر میں یک زبان ہو کر چیخے "پاکستان ہماری جان اور زندگی ہے۔ پاکستان زندہ باد"۔ جب یہ نعرے ختم ہو چکے تو وزیرِ اعظم صاحب نے بڑے تحمل اور سنجیدہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ بات کہنے کے انداز سے ظاہر تھا کہ خدا کا خوف طاری ہے کیونکہ ہاتھ کلام پاک پر ہی تھا "میں بھی آپ سب سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ اور آپ سب کو رہا کیا جاتا ہے۔"

*

JALALI BOOKS

اشاریہ

○ اشخاص

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

مقامات

KUTUBKHANA
JALALI BOOKS
JALALI

⊙ قبائل

KUTUB KHANA. JALALI BOOKS JALALI

تصحیح

نوٹ:-

صفحہ ۸۶ تیرہویں لائن پر جنوری ۱۹۶۷ء پڑھا جائے۔

KUTUBKHANA JALALI BOOKS JALALI

بلوچستان
ماضی۔ حال۔ مستقبل